بزرگانِ دارالعلوم دیوبند

جہاد شاملی ۱۸۵۷ء

اور

علماء دیوبند کی سیاسی خدمات کے دیگر پہلو

مُرتب:

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

بزرگانِ دارالعلوم دیوبند

جہاد شاملی ۱۸۵۷ء

اور

علماءِ دیوبند کی سیاسی خدمات کے دیگر پہلو

مُرتب:

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون : ۲-۵۴۲۷۹۰۱-۰۴۲

E-Mail: juipak@wol.net.pk · www.juipak.org.pk

Buzurgan-e-Dar-ul-uloom Deoband
aur Jihad-e-Shamli 1857
By
Dr. Abu Salman Shahjahanpuri

ISBN NO: 969-8793-34-3

ضابطہ

نام کتاب	:	بزرگان دارالعلوم دیوبند اور جہاد شاملی
سال اشاعت	:	دسمبر ۲۰۰۴ء
ناشر	:	محمد ریاض درانی
سرورق	:	جمیل حسین
کمپوزنگ	:	جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر' وحدت روڈ' لاہور
مطبع	:	اشتیاق اے مشتاق پرنٹنگ پریس' لاہور
قیمت	:	150 روپے

ISBN No: 969-8793-34-4

قانونی مشیر : سید طارق ہمدانی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

فہرست

عرضِ ناشر

جمعیۃ پبلی کیشنز کے آغاز پر ابھی کوئی طویل زمانہ نہیں گزرا لیکن اس کی کارگزاری پر نظر پڑتی ہے تو خوشی ہوتی ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے ہماری ہمت اور وسایل سے زیادہ کامیابی عطا فرمائی اور اس کے کاموں کو اہل ذوق میں پذیرائی بخشی۔ اب تک دو درجن سے زیادہ کتابیں دارالعلوم دیوبند کی تاریخ قیام، اس کے پس منظر، اس کی خدمات اور اس کے فیضان کے تذکار، اس کے بزرگوں اور فرزندوں کے سوانح و سیرت اور ان کے افکار و تعارف میں شائع ہو چکی ہیں۔

براعظم پاک و ہند کی تاریخ کا آخری دور ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں بڑے بڑے کام انجام پائے۔ بڑی بڑی تحریکیں چلیں اور عظیم شخصیتوں کے وجود سے اس دور نے عزت پائی۔ ۱۸۵۷ء کا حادثہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ اس نے قوم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ملک میں بھونچال آ گیا تھا اور اس کے زمین و آسمان بدل گئے تھے۔ قوم غلامی کی ذلت و نکبت میں مبتلا ہوئی اور اسی زمانے میں ملک کی آزادی کی تحریک چلی اور مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اور پوری ایک صدی نہیں گزری تھی کہ اس نے اپنی آزادی کو دوبارہ حاصل کر لیا اور اس کے آزاد ہوتے ہی افریقہ و ایشیا کے پچاسوں ممالک اپنی اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد قوموں کی صف میں شامل ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے اثرات اور اس کے ردعمل سے قومی و ملی زندگی کا کوئی گوشہ محفوظ نہ تھا۔ سیاسی انقلاب نے قومی و ملی بیداری کی جو لہر پیدا کر دی تھی، اس سے تعلیم کا گوشہ بھی بچا ہوا نہ تھا۔ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کا قیام ملی بیداری کی اسی تحریک کا نتیجہ تھا۔ دیوبند کا یہ مدرسہ جو آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہوا مسلمانوں میں احیاے اسلام کی

دینی اور سیاسی تحریک کا انقلابی مرکز بنا اور قومی و ملی رہنمائی کے میدانوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت کے تلامذہ میں مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جیسے عظیم المرتبت رہنما پیدا ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند کی تحریک حکیم الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک کا نیا دور تھا لیکن یہ خود بھی ایک جامع جہات اور مختلف الاطراف تحریک تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے قول کے مطابق شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب دہلوی کے ہجرتِ حجاز کے بعد ولی اللہی تحریک کی ذمہ داری مولانا مملوک العلی پر آ گئی تھی۔ مولانا مملوک العلی استاذ الکل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ایک خاص شان اور امتیاز کے مالک تھے اور یہی بزرگ مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) دیوبند کے بانی مبانی تھے۔ یہ مدرسہ کہنے کو تو علوم اسلامی کی ایک درس گاہ تھی لیکن اس کی بنا ایسی نیک نہاد شخصیات اور ان کے بابرکت ہاتھوں سے اور ایسی نیک ساعت میں رکھی گئی تھی کہ اس کے فیضان سے ہندوستان کی علمی و عملی اور دینی و دنیاوی زندگی کا کوئی گوشہ محروم نہ رہا۔ درس و تدریس، تعلیم و تعلم، وعظ و تبلیغ، دعوت و ارشاد، سلوک و تصوف تو گویا اس شجر کے برگ و بار تھے۔ سیاست، صحافت، تاریخ، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، خدمت خلق، تحریک آزادی وطن سے لے کر اسلامی ممالک کے حفظ و دفاع اور ان کی آزادی کی جنگ اور افریقہ و ایشیا کی دوسری محکوم اقوام اور ممالک کی آزادی کی راہ میں اور استعمار کے پنجہ استبداد سے ان کی رہائی کی جدوجہد میں اس کے فرزندوں نے ایثار و قربانی کی مثالیں قایم کر دی ہیں۔ ملک کی زندگی کو جتنا دارالعلوم دیوبند کی تحریک نے متاثر کیا ہے وقت کی کسی دوسری تحریک نے متاثر نہیں کیا۔

اس کا اندازہ زیر کتاب کے مشمولات سے بہ خوبی ہو جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کی تاریخ اور قومی و ملی زندگی پر اس کے اثرات مختلف علمی و عملی میدانوں میں دارالعلوم کے فیضان اور اس کے علما کی خدمات کے تذکرہ و تعارف میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے مضامین بلند پایہ ہیں۔ اسی سلسلے میں بزرگانِ دارالعلوم دیوبند، شیخ الہند مولانا محمود حسن وغیرہم کی سیاسی خدمات و تحریکات پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مولانا غلام رسول مہر، پروفیسر خلیق احمد

نظامی کے مقالات بہت اہم ہیں اور یہ دارالعلوم سے غیر متعلق شخصیات اور دیگر مکاتبِ فکر کا اعتراف اور اس کو خراج تحسین بھی ہے۔

اب چوں کہ یہ تحقیقی مقالات اور تاریخی نوادر قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لیے پیش کیے ہی جارہے ہیں اس لیے ان پر کسی بحث اور تعارف میں خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ قارئین محترم ان کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ کرلیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ اہل ذوق کے حلقے میں اس مجموعہء مقالات کو خاص طور پر پسند کیا جائے گا۔

محمد ریاض درانی
متصل مسجد پائلٹ ہائی سکول وحدت روڈ' لاہور
042-5427901-2

پیش لفظ

دارالعلوم دیوبند کا قیام مسلم تاریخ ہند کے آخری دور کا ایک اہم واقعہ ہے۔ وہ ایک سرچشمہ ہے جس سے علوم و فنونِ اسلامی کی تدریس و اشاعت، دعوت و ارشاد، اصلاح معاشرت، تطہیر عواید و رسوم، تصنیف و تالیف، تاریخ و تعلیم، ثقافت و صحافت اور آزادی وطن کی بے شمار تحریکیں پیدا ہوئیں جنھوں نے قومی و ملی زندگی اور فکر و عمل کے بہت گوشوں کو متاثر کیا۔

دارالعلوم کا قیام ایک دور کا خاتمہ تھا اور ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان بھی تھا۔ وہ جنگ آزادی کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم عنوان ہے اور ہندوستان کی تاریخ عمومی یا تاریخ سیاسیات کا ایک قابل فخر موضوع ہے لیکن اس کے قیام کی تاریخی اہمیت واضح نہیں ہوسکتی جب تک اس کے قیام کے پس منظر اور اس کے خاص بانیان کی سیرت اور ان کے فکری رشتے پر نظر نہ ڈالی جائے۔

دارالعلوم کے بانی اعظم کی حیثیت سے مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام سرفہرست ہے لیکن اس کے بانیوں اور ان کے معاونین میں کئی اور محترم اسمائے گرامی بھی آتے ہیں۔ یہ تمام بزرگ وہ تھے جو حکیم الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خانوادہ علمی سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اسی خانوادے کے اساتذہ سے تحصیل علمی کی تھی اور اسی سلسلے کے بزرگوں کی صحبت میں سلوک و معرفت کے رموز سے آشنائی پیدا کی تھی۔ جب سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی نے حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کی ہدایت و نگرانی میں اصلاح و جہاد کا ہنگامہ برپا کیا تو یہ بزرگ اس میں شریک تھے اور جب اس دعوت کو عملی بنیادوں پر منظم کیا اور اس کے باوجود کہ ابھی مغلیہ حکومت کا چراغ ٹمٹمار ہا تھا ایک مثالی اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جس کے مقاصد میں نظام حکومت کی تجدید و احیاء کے علاوہ یہ بھی تھا کہ ملک میں رسوخ پانے والی ایک

بیرونی استحصالی قوت کا استیصال بھی کر دیا جائے، جس نے مغلیہ نظام حکومت کو مفلوج کر کے شاہ عالم ثانی کی حکومت کو قلعہء معلّٰی تک محدود کر دیا ہے(۱)۔ بلکہ ان کے طریقہء کار میں نظام حکومت کی اصلاح وتجدید سے پہلے اسی بیرونی استحصالی قوت کا استیصال کر دینا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں اور اُن کے پرکھوں کا تعلق اسی مکتبۂ فکر سے تھا۔ چناں چہ یوپی کے شمالی اضلاع سے تعلق رکھنے والے حضرات سید احمد شہید کی تحریک اصلاح و جہاد سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت سید صاحب کی یہ تحریک اگر چہ ۱۹۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر ناکام ہوگئی لیکن اس کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں بجھ نہیں گئی تھیں۔ یہی وہ چنگاریاں تھیں جو ۱۸۵۷ء میں بھڑک اٹھی تھیں اور دہلی، یوپی، اودھ، سندھ وغیرہ میں کئی بار ایسے حالات پیدا ہوئے اور امید بندھی کہ یہ چنگاریاں شعلہ ہائے جوالہ بن کر استحصالی عزائم کو جلا کر بھسم کر دیں گی۔

۱۸۵۷ء میں سہارن پور، مظفر نگر کے اضلاع میں کمپنی کے نظام، امن وامان کی ذمہ داری اور حفاظت کے اُٹھتے ہی سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ ایک صوفی، شیخ طریقت اور مصلح وقت کی قیادت میں جو نظام امارت قائم کیا گیا، جس میں عدلیہ وانتظامیہ کے شعبے قائم تھے اور جن کے تحت امن و امان کے قیام، عوام کے جان و مال کی حفاظت اور ان کے اختلاف و

---

(۱) شاہ عالم ثانی کا عہد حکومت ۱۷۵۹ء۔۱۸۰۶ء ہے۔ اس زمانے میں یہ جملہ مشہور ہو گیا تھا کہ حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم۔ دلی سے مراد قلعہ معلّٰی اور اس کا جوار ہے اور جوار کی حد پالم کی منزل ہے۔
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ۱۸۰۶ء سے پہلے ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے اور ملک کے اقتدار اور حاکمیت اعلیٰ ومطلقہ کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کا فتویٰ دے دیا تھا اور مجرد اس فیصلہ واعلان (فتوے) کے بیرونی استحصالی وقابض انتظامیہ یا کمپنی کی حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد یا جنگ آزادی کے جواز وآغاز کا دروازہ کھل گیا تھا۔ رائے بریلی کے حضرت سید احمد اور دہلی کے شاہ اسماعیل (رحمہما اللہ) کے زیر اہتمام جو تحریک اصلاح وجہاد منظم ہوئی تھی اسی فتوے یا اعلان کی صورت گری کا آغاز تھا۔
علما و بزرگان دارالعلوم دیوبند اپنے اپنے دور میں اسی مکتب فکر کے مردان کار تھے۔ افسوس ان بزرگوں پر جو ۱۹۴۷ء تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ برّ اعظم ہند پاکستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام، نہ کمپنی کے اعلانات کے ساتھ کبھی ان کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے تھے نہ کبھی نظروں سے گزرے تھے کہ ''ملک خدا کا، حکومت بادشاہ کی، حکم کمپنی بہادر کا، ہر خاص وعام کو آگاہ کیا جاتا ہے'' نہ ان جملوں کے مطالب پر کبھی انھوں نے غور کیا تھا، ورنہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی کہ ملک میں کیا انقلاب واقع ہو چکا ہے۔

خصومات کے تصفیے کے جو امور انجام پائے تھے، وہ موقع سے فایدہ اُٹھانے اور آزاد نظام سیاسی کے قیام میں ان کے اسی ذوق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ شاملی کا معرکہ جہاد نظام امامت کے فیصلے اور شریعت کے شرایط جہاد کے مطابق قایم ہوا تھا۔ نظام امارت کے بانیان و ارکین میں حضرت سید الطایفہ اور قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے علاوہ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت حافظ محمد ضامن، مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی کے نام بار بار آتے ہیں۔ افسوس کہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ عظیم میں ملک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی اور اس کے نتایج ملک کے لیے ایک عظیم حادثہ تھا۔ اس حادثے نے زندگی کو تلپٹ اور نظام کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ ایسا انقلاب آیا تھا جس کی کوئی مثال براعظم ہند پاکستان کی تاریخ میں موجود نہ تھی۔ اس کی کوئی نظیر اگر مل سکتی ہے تو انقلابات عالم کی تواریخ ہی میں مل سکے گی۔

۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں تحریک کی ناکامی کوئی معمولی ناکامی نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک بلند اور صالح مقصد کی ناکامی تھی۔ اس سے ایک تاریخی، قانونی، وطنی حکومت کی اپنے پورے اختیارات و اقتدار کے ساتھ بحالی اور ملک کے متفقہ نظام حکومت کے احیاء کی اُمیدیں وابستہ تھیں لیکن ملک کی عام زندگی اس کے گہرے اثرات سے محفوظ رہی تھی اور اس میں کوئی ہل چل بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے معرکے میں شکست کی الم ناکیوں کی کوئی حد اور حساب نہ تھا۔ اس کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس کی تباہی کسی ایک جماعت یا ایک قوم یا ایک خطے تک محدود نہ تھی۔ اس نے پورے ملک، اس کے مرکزی نظام، اس کی تمام قوموں، مختلف علاقائی ریاستوں، رجواڑوں، سلطنتوں اور نوابیوں تک کا احاطہ کر لیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شکست میں جسم ہی مغلوب نہ ہوئے تھے۔ بلکہ اس نے ذہنوں کو متاثر اور دلوں کی اُمنگوں اور ولولوں کو تہ و بالا کر دیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں کی معرکہ شاملی میں سیاسی شکست اتنی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ شکست و فتح کے ایام کبھی کسی قوم کی دایمی تقدیر نہیں ہوتے۔ یہ قوموں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ انھیں خوف اس بات کا تھا کہ دل کی وہ انگیٹھی سرد نہ پڑ جائے جو زندگی کے لیے حرارت

پیدا کرتی ہے۔ دارالعلوم دیو بند کا قیام اس خطرے کے انسداد کے لیے عمل میں آیا تھا۔

قوموں کی زندگی کے لیے مادی ساز و سامان سے زیادہ اہمیت اس جذبے اور حرارت کی ہوتی ہے جو دل میں زندگی کی اُمنگ اور جوش و ولولہ پیدا کرتی ہے، جو کارگہہ حیات میں اُسے آگے بڑھاتی ہے اور معرکۂ تگ و تاز میں دل کو فتح کا یقین دلاتی ہے۔ اصل ماتم دل میں اُمید کی شمع کے بجھ جانے اور ولولۂ شوق کے ٹھنڈا پڑ جانے کا ہونا چاہیے۔ اگر دل میں اُمنگ اور زندگی کا ولولہ باقی نہ رہے اور اُمید کی شمع بجھ جائے تو موت اور زندگی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ جو زندگی سے پہلے ہی مایوس ہو اُسے موت کیا مارے گی۔ موت تو زندگی کی ہوتی ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے صاف لکھا ہے کہ دارالعلوم کا قیام اسی روح کو بچانے اور حریت فکر کو زندہ رکھنے کے لیے تھا۔ اُس کا قیام زندگی کی تگ و تاز کے لیے ایک نئے میدان کی تلاش تھی۔ شاملی کے میدان سے اُن کا پلٹنا شکست کا فرار نہ تھا بلکہ گھات کی تلاش اور آیندہ معرکے کی تیاری کے لیے تھا۔ دارالعلوم دیو بند کے قیام سے دراصل یہی کارنامہ انجام دیا گیا تھا۔ ابھی اس کے قیام پر پوری ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اُس کے قیام کا مقصد پورا ہو گیا اور کامیابی کا پھل قوم کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ یہ پھل ۱۴/۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برِ اعظم ہند پاکستان کی انگریز کی غلامی سے چھٹکارا تھا۔

اس کتاب کا مقصد دارالعلوم دیو بند کی سیاسی خدمات اور اُس کے کارنامے کا تعارف ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کے قیام کے پس منظر، اس کے بانیانِ کرام اور ان کے عزائم کار کا تعارف کرایا جاتا۔ کیوں کہ اس کے قیام کے فوری اسباب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے معرکہ شاملی سے ان بزرگوں کا قریبی تعلق تھا اور بدقسمتی سے اس کے وقوع کے بارے میں بعض غلط فہمیاں پیدا کر دی گئی تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ پہلے ان غلط فہمیوں کو دور کر کے اس کے تاریخی مطلع کو دھند سے صاف کر دیا جائے۔ اس کے بغیر دارالعلوم دیو بند کے مقاصد اور ان کی اہمیت واضح نہیں ہو سکتی تھی اور نہ اس کے بغیر ملک کی سیاسیات میں اور آزادیِ وطن کی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں اس نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کا نقش اجاگر ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میرا خیال تھا کہ تذکرۃ الرشید کے مطالعے ہی سے کافی مفید مطالب حاصل ہو جائیں گے۔ نیز ۱۸۵۷ء کی معاصر دستاویزات اور اسی تسلسل اور تعلق میں دیگر تحریرات سے استفادہ کر کے متوسط ضخامت کا ایک مقالہ تیار کر لیا جا سکے گا۔ میں اس مقصد میں ناکام نہیں رہا اور نہ میں نے اس منصوبے کے حدود سے تجاوز کیا لیکن یہ اعتراف کرتا ہوں کہ اپنے مطالعے کے نتائج و مفادات کو ایک خاص ضخامت کے مقالے میں، مقالے کے رسمی انداز میں تالیف سے ضرور عاجز آ گیا۔ اب جہاں تک تحریر کے اجزا کا تعلق ہے یہ ایک ہی مقالے کے اجزا ہیں۔ اب تالیف کا حسن اور تفہیم کی سہولت اسی میں نظر آتی ہے کہ انھیں اسی طرح مرتب کیا جاتا۔ اس میں ایک خاص فایدہ یہ بھی نظر آیا کہ مقالے کی طوالت کا ذہن پر بوجھ نہیں پڑتا اور مطالب کی تفصیل بہ آسانی ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

اس مجموعے کے دوسرے حصے میں بھی مولف کے قلم سے دارالعلوم دیو بند اور جمعیت علماے ہند کی تاریخ قیام اور ان کے امتیازات و خصایص اور علم و عمل کے مختلف میدانوں میں ان کی خدمات کا تذکرہ ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی پر ایک مقالہ ہے جو مستقبل ہند یا کستان میں نظام حکومت کے ایک دستوری خاکے پر مشتمل ہے۔ یہ مقالہ مولانا سندھی کے تدبر اور سیاسی بصیرت کی بہت بڑی شہادت ہے۔ اس سلسلے میں خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ دارالعلوم دیو بند کے فرزند عظیم اور حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید، سیاسی تربیت یافتہ اور معتمد علیہ تھے۔ اب یہ تمام مقالے چوں کہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیے گئے ہیں اس لیے ان کے تعارف اور ان پر تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ان کی اہمیت اور خصوصیات کے بارے میں قارئین محترم کا ذوق علمی فیصلہ کرے گا کہ وہ کیا ہیں اور کیسے ہیں؟

مجموعے کے تیسرے حصے میں چند اکابر اہل قلم اور مورخین کی تحریرات ہیں۔ جب کسی مسئلے میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے کے مخالف و فریق بن جاتے ہیں اور اختلاف رائے انا کا مسئلہ بنا لیا جاتا ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی بات کی پچ ہو جاتی ہے اور پچ کے سامنے دلایل و براہین کے بہترین ہتھیار بھی کند ہو جاتے ہیں۔ نکتہ چینوں کے قلب مطمئن نہیں ہوتے۔ نکتہ چینی اور حیلہ جو طبیعتیں کسی معقول بات کے انکار کے لیے بھی کوئی نہ کوئی حیلہ تراش

نکتی ہیں اور نکتہ چینیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

اس صورت حال سے بچنے اور اتمام حجت کے لیے ضروری سمجھا کہ وقت کے مستند اہل قلم اور معتبر مورخین کے چند مقالات بھی شامل کر دیے جائیں۔ اس جماعت میں تین خاص اہل قلم ہیں اور تینوں الگ الگ ذوق وفکر کے مالک ہیں:

۱- پروفیسر خلیق احمد نظامی کا تعلق دیوبندی مکتبہ فکر سے تھا۔

۲- ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سیاست میں دیوبندی مکتبۂ فکر سے اختلاف اور الگ کا تعلق رکھتے تھے۔

۳- مولانا غلام رسول مہر کا تعلق دیوبندیت سے نہ لاگ کا تھا نہ لگاؤ کا۔

یہ بزرگ اہل قلم کسی مکتبۂ فکر سے خواہ تعلق رکھتے ہوں خواہ نہ رکھتے ہوں بزرگانِ دیوبند اور معرکۂ شاملی کے نبرد آزماؤں کے اخلاص، عملیت اور آتش نمرود میں بے دھڑک کود پڑنے کے ان کے عشق کے سب معترف اور قایل ہیں۔ ان میں سے ہر کسی نے اپنا لگاؤ یا لاگ سے بلند ہو کر تاریخ پر نظر ڈالی ہے اور حقایق کا اعتراف کیا ہے۔ نہ تو کسی نے طرف داری اور رو رعایت سے کام لیا ہے اور نہ کوئی دشمنی اور اختلاف کو بیچ میں لایا ہے۔ اس حصے کو سرمایۂ علم و تحقیق پر اس سے زیادہ کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

ان کے علاوہ ایک مضمون کابل میں ہندوستان کی جلاوطن حکومت کے تعارف میں اقبال شیدائی کی خودنوشت ''انقلابی کی سرگزشت'' سے ماخوذ ہے۔ اس حکومت کے بارے میں اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کا قیام تو بلاشبہ ہندوستانی جرمن ترک مشن کے فیصلے کے مطابق عمل میں آیا تھا اور مولانا عبیداللہ سندھی کو اس میں شریک کیا گیا تھا اور بنایا تو انھیں وزیر داخلہ گیا تھا لیکن ان کی شرکت کے بعد حکومت کی تمام خصوصیات، سرگرمیوں اور خدمات کا عنوان ''مولانا عبیداللہ سندھی'' تھا اور تمام اعلیٰ واہم عہدے ان کے تصرف میں تھے۔ نائب وزیراعظم اور قایم مقام پریسیڈنٹ وہ ہوئے اور تمام خارجہ امور میں ان کا عمل دخل تھا۔ یہ مولانا سندھی دیوبند کے تعلیم یافتہ اور حضرت شیخ الہند کے تربیت یافتہ سیاسی اسکالر تھے۔

اسی آخری حصے میں حضرت شیخ الاسلام اور حضرت امام الہند کی ایک ایک تقریر تبرکاً شامل

ہے لیکن یہ صرف تبرک نہیں بلکہ نہایت اہم، مفید مطالب اور فکر انگیز افکار و معلومات کا ایک گلدستہ اور ہر طرح مستغنی عن التبصرہ افاداتِ عالیہ ہیں۔

آخر میں معرکہ شاملی پر کچھ بنیادی حوالہ جات بھی مرتب کر دیے ہیں تاکہ اگر کوئی صاحب اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنا یا کچھ لکھنا چاہیں تو کم از کم آغاز کار کے لیے اُن کے سامنے کچھ حوالے ضرور ہوں۔ وہ آغاز سے جوں ہی آگے بڑھیں گے۔ ذوق ان کی رہنمائی کرے گا اور بہت سے مزید حوالہ جات ان کے مطالعہ و استفادے کے لیے ان کے سامنے آ جائیں گے۔

مجھے اُمید ہے کہ اِس سعی تالیف سے معرکہ شاملی کے وقوع، اس کی نقش آرائی کے عمل، اس میں بزرگانِ دارالعلوم دیوبند کی شرکت اور ان کے قابل فخر کردار کا کوئی پہلو تاریکی میں نہیں رہا اور میرے سامنے اس کاوش کا جو مقصد تھا اس میں میں ناکام نہیں رہوں گا۔

حصہ اول

بزرگانِ دارالعلوم دیوبند
اور
معرکۂ شاملی ۱۸۵۷ء

تذکرۃ الرشید — ایک مطالعہ

تذکرۃ الرشید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے حالات وسیرت کے بیان اور مقاماتِ طریقت کے تذکرے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی تالیف ہے۔ مولانا میرٹھی اسی خانوادہ سلوک وتصوف سے تعلق رکھتے تھے وہ کئی کتابوں کے مولف ہیں۔ تذکرۃ الرشید ان کی سب سے اہم کتاب ہے اور اسی پر ان کی شہرت کی بنیاد قائم ہے۔ اگرچہ اس کی تالیف وتدوین کی خوبیاں آج کل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں لیکن گذشتہ عہد تالیف کی روایت کے عین مطابق ہے۔

یہ تذکرہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ ان کے حالات میں ہے اور دو سو باون صفحات پر محیط ہے۔ دوسرا حصہ حضرت کے سلوک وطریقت کے بیان اور مقامات کے تذکرے میں ہے۔ اس حصے کے مضامین تین سو چوالیس صفحات تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ ۹ر اگست ۱۹۰۵ء بہ روز منگل حضرت گنگوہی نے انتقال فرمایا تھا۔ اس سے اگلے ہی سال ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء میں مولانا میرٹھی نے اس کی تالیف کا آغاز کردیا تھا اور تقریباً دو برس کی محنت کے بعد ۳۰ر ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۵ر فروری ۱۹۰۸ء بہ روز چہار شنبہ اس تذکرے کی تالیف سے فارغ ہوگئے تھے۔

حضرت گنگوہی کے حالات وواقعات میں تذکرۃ الرشید کو درجۂ استناد حاصل ہے۔ البتہ شاملی (ضلع سہارن پور) میں ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو پیش آنے والے واقعے میں ان کے پیچیدہ اور مرموز اسلوب بیان نے انھیں کے حلقے میں دو گروہ پیدا کردیے۔

۱- ایک گروہ نے حالات کے جبر کو واقعے کے بیان میں ان کے پیچیدہ اسلوب کی وجہ قرار دیا لیکن وہ اسی سے اس کے وقوع پر استدلال کرتا ہے۔

اس گروہ میں اس حلقے کے اہل نظر اور اصحاب قلم میں مولانا حسین احمد مدنی' مولانا محمد زکریا' مولانا مناظر احسن' مولانا نسیم احمد فریدی' مفتی عزیز الرحمٰن' مولانا سید محمد میاں' پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی' سید محبوب رضوی' قاری محمد طیب دیوبندی وغیرہم شامل ہیں اور اس حلقے کے باہر کے اہل قلم اور مورخین میں مولانا غلام رسول مہر' ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی' پروفیسر خلیق احمد نظامی' ڈاکٹر تارا چند' پی سی جوشی' ڈاکٹر معین الحق' ڈاکٹر محمد ایوب قادری' مولانا امداد صابری وغیرہم سرفہرست ہیں۔

۲- دوسرا گروہ معرکۂ شاملی میں حضرت گنگوہی' مولانا محمد قاسم نانوتوی' حافظ محمد ضامن شہید' حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی وغیرہم کی شرکت ہی کا منکر ہے۔

یہ دونوں گروہ بزرگانِ دیوبند سے عقیدت وارادت کا تعلق رکھتے ہیں۔

۳- ان دونوں گروہوں کے جھگڑے سے ایک تیسرا گروہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ وہ دیوبندی مکتبۂ فکر کا نہ صرف مخالف ہے بلکہ ان کے دین و ایمان کی سلامتی ہی کا منکر ہے۔ اس کا اپنا اندازِ فکر اور مقصد ہے۔ اس گروہ سے ہمیں کوئی شکوہ نہیں۔ وہ جب ہمارے ایمان کی سلامتی ہی تسلیم نہیں کرتا تو ہمیں اس کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ شاملی کے جہاد میں شرکت کے بارے میں اس کی کیا رائے؟ وہ تو ایک واقعے کا انکار ہے۔ اگر ہمیں ان کے خیالات کا رد مقصود ہو تو دوسرے گروہ کے خیالات کے رد میں ان کا رد بھی ہو جاتا ہے۔

معاصر شخصیات اور دستاویزات میں متعدد حوالے ہیں جن کا اپنے مقام پر ذکر آئے گا۔

(۱)

۱۸۵۷ء میں معرکہ شاملی میں شرکت کے حوالے سے بعض حضرات نے غلط فہمی پیدا کرنے اور بزرگان دیوبند پر خاک اڑانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں دیوبند کے نکتہ چیں اور ذوق نا آشنایان تاریخ ہی نہیں بعض ایسے حضرات بھی شامل ہیں جن کا شمار اگر کیا جائے تو انھیں دیوبندی مکتبہ فکر ہی میں کیا جائے گا۔ وہ خود بھی بزرگان و بانیان دیوبند سے عقیدت و ارادت کے مدعی ہیں۔ تذکرۃ الرشید ان کا ماخذ ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ بزرگ شاملی کے معرکے میں شریک ہوتے تو اس کے مؤلف مرحوم مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ان بزرگوں کا شریک ہونا بیان فرماتے۔ انھوں نے ان کی شرکت کو دشمنوں اور مفسدوں کی اڑائی ہوئی افواہیں اور الزامات و اتہامات قرار دیا ہے، نہ کہ ان کی خدمات!

اس سے پہلے کہ ہم خارجی دلائل اور حوالہ جات سے کام لیں مناسب ہوگا اسی ماخذ...... ''تذکرۃ الرشید'' اور اس کے فاضل مؤلف کا تجزیاتی مطالعہ کریں۔

۱- ہر مصنف اور مولف کا ایک نقطہ نظر ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق وہ اپنی تصنیف و تالیف کے در و دیوار سجاتا ہے۔ اس کا یہی نقطہ نظر اور ذوق مضامین و مباحث کی ترتیب و تدوین ہی میں نہیں مضامین کے انتخاب میں بھی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر کوئی مضمون مصنف کے ذوق و رجحان کے مطابق نہیں ہوتا تو وہ اس کی اہمیت کا اندازہ بے بغیر نظر انداز کر دیتا ہے اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

۲- اس سے آگے ایک مقام اور بھی آتا ہے دیکھ لینا چاہیے کہ صاحب قلم کا تعلق اصحاب رخصت و اہل اغراض یا اصحاب عزیمت اور رجالِ کار کے کس قبیلے سے ہے؟ اگر کوئی مولف کسی وجہ سے موضوع علیہ شخصیت کے کسی پہلو کو یا اس کی زندگی کے کسی سانحے کو نظر انداز کر دیتا ہے تو یہ تحریر و بیان کا نقص تو ضرور ہے لیکن ہم اس سے صاحب تذکرہ کی شخصیت کے نقص یا عدم جامعیت پر استدلال نہیں کر سکتے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن پر ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا۔ یہ رسالہ حضرت شیخ کی وفات کے بعد پہلا رسالہ تھا جو زیور طبع سے آراستہ

ہوا تھا۔ اگر اول سے آخر تک اس رسالہ کو دیکھا جائے تو شبہ بھی نہیں گزرتا کہ صاحب تذکرہ کی زندگی کا کوئی سیاسی پہلو بھی تھا، وہ ایک انقلابی شخصیت تھے ہندوستان سے حجاز کا ان کا سفر ایک بڑی انقلابی سیاسی تحریک کے سلسلے میں تھا، وہ تحریک خلافت کے عظیم الشان رہنما تھے ترک موالات کی وہ ملک میں اہم اور متفق علیہ شخصیت تھے۔ ان کی انسان دوستی اور استعمار دشمنی دونوں شک وشبہ سے بالاتھیں اور قوم وملک کی سیاست میں وہ ایک بلند پایہ مدبر اور ایک بزرگ رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ حضرت تھانوی کی تحریر کا نقص ضرور تھا جو ایک جامع جہات شخصیات کے اطراف وخصایص کا احاطہ نہ کرسکی تھی لیکن کیا ہم حضرت حکیم الامت کے علم ونظر، جامعیت علوم وفنون، مقام سلوک وتصوف اور حضرت کے اخلاص وتقوی کا اس تحریر کی بناء پر فیصلہ کردے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اور کیا اس کے رسالے کے مطالب کی روشنی میں حضرت شیخ الہند کی سیاسی حیثیت اور حضرت کی ملکی وقومی خدمات کی نفی کرسکتے ہیں؟ نہیں اور ہرگز نہیں، ہم یہ بھی نہیں کرسکتے! تو پھر کیا ہم تذکرۃ الرشید کے کسی بیان وتحریر کے نقص یا مولف مرحوم کے ذوق ورحجان یا ان کے کسی مخصوص قبیلے سے تعلق کی بناء پر ہم شاملی کے تاریخی معرکے میں تھانہ بھون، گنگوہ، نانوتہ اور دیوبند کے بزرگوں کی شرکت کی نفی کرنے کی جرأت کرسکتے ہیں؟ یقیناً ہم ایسا نہیں کرسکتے!

۳- تذکرۃ الرشید کی اس خوبی کو بھی نظر انداز نہیں کردینا چاہیے کہ وہ سیاسی سوانح ہے نہ سیاسی تاریخ! ہمیں اس میں وہ چیز تلاش ہی نہیں کرنی چاہیے جو اس کا موضوع نہیں، جس فن کی وہ کتاب ہے اس کے دایرے میں وہ چیز آتی ہی نہیں۔ ہمیں یہ بات ہرگز نہ بھولنی چاہیے کہ یہ ایک عالم دین، محدث عصر فقیہ وقت، شیخ طریقت، مرشد راہ سلوک، طبیب روحانی کا تذکرہ ہے اور اگر فن کی کسوٹی پر اسے پرکھا جائے تو اس سے بھی کچھ زیادہ! میرا مطلب یہ ہے کہ اس کے گوناگوں خصایص تذکرہ نویسی کے فن تک محدود نہیں۔ مثلاً:

پہلی جلد میں تذکر کے خاص مضامین کے علاوہ صاحب تذکرہ کے معالجات، حذاقت فن کے تذکار وحکایات، نسخہ جات، مراسلات وجوابات جن کے مضامین شریعت وطریقت کے مسائل، تعلیمات وارشادات، اذکار ومشاغل، واردات ومراقبات اور ہمہ قسم کے فتاویٰ میں

دور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ دوسری جلد کا آغاز ہی طریقت اور تصوف کے بیان، اس کی تعریف، اہمیت اس پر اعتراضات اور اُن کے رَد سے ہوتا ہے اور پوری جلد معنوی کمالات، حسی کرامات، صالحین کی حکایات، ملفوظات، عملیات، ادعیہ اور اوراد وظائف، تعویذات مبشرات وشہادات اور خوارقِ عادات وغیرہ مضامین اور ہر مضمون کرشمہ وکرامات کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے اس کے بہت سے مضامین فن تذکرہ نویسی سے بہ راہِ راست تعلق نہیں رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ ان کا شمار اس فن کے متعلقات میں ہوتا ہے۔

اس کے مضامین کی وسعت اور مباحث کی کثرت بے شمار علوم و معارف کے متنوع خصایص کی جامع ہے۔ اس کے محاسن لاتعداد اور اس کی دل ربائی کا عالم بے مثال اور حد بیان سے باہر ہے، لیکن ان تمام خوبیوں اور بہت کچھ ہونے کے باوجود یہ کتاب سیاسی سوانح، سیاسی تاریخ یا سیاسی تذکرہ نہیں ہے اس میں تاریخ نویس اور سوانح نگار کو بہت مفید معلومات ملیں گی وہ ان سے استفادہ کرے گا اور اپنی تالیف وتدوین کی آرایش میں اس سے فایدہ اٹھائے گا لیکن یہ سیاسی سوانح وتاریخ کی ضرورت پوری نہیں کرسکتی۔ سیاسی مورخ کی ضروریات کے لیے یہ سرمایہ ناقص اور بضاعتِ مزجات ہے پس ایک ایسی کتاب جو متعلقہ فن میں نہ ہو اس کے بیان کے نقص اور اسلوب کی پیچیدگی کے تذکرے سے دل میں بے چینیوں کو پرورش کرنے سے کیا حاصل؟ تذکرۃ الرشید ایک ایسی ہی کتاب ہے۔

(۲)

اب ہم تذکرۃ الرشید کے ایک بیان کو زیر بحث لاتے ہیں اس میں ہنگامے کے بعد پیش آنے والے واقعات میں جن کا تعلق جھوٹی تہمتوں، الزاموں، مخبری کرنے اور مخالفوں کو پکڑوانے اور سولی چڑھوانے سے ہے مؤلف مرحوم مولانا عاشق الٰہی میرٹھی فرماتے ہیں:

> ''جب بغاوت وفساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دِل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشے سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں، انھوں نے اپنا رنگ

جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور مخبری کی کہ.....

۱- تھانہ (بھون) کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے اور
۲- شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔
۳- بستی کی دکانوں کے چھپر انھوں نے تحصیل کے دروازے پر جمع کیے۔
اور اس میں آگ لگا دی یہاں تک کہ جس وقت آدھے کوارٹر جل گئے
ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ
۴- ان نڈر جوانوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا۔'' (تذکرۃ الرشید، ص ۷۶)

مؤلف تذکرہ نے ان بیانات کے لیے اگر چہ جھوٹی سچی تہمت، الزام اور مخبری کے الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن اس میں خزانہ لوٹنے والی بات کے سوا کوئی بات غلط نہیں۔ اس موقع پر شاملی کا خزانہ لوٹے جانے کا تذکرہ میں نے کسی سرکاری یا غیر سرکاری رپورٹ میں نہیں دیکھا یا کم از کم مجھے یاد نہیں۔

حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس لیے کہ ''لوٹے جانے والے'' نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ لوٹا نہیں گیا کیمپ تھانہ بھون کے انچارج آر ایم ایڈورڈس قائم مقام مجسٹریٹ مظفر نے ایف ولیمز کمشنر میرٹھ ڈویژن کو جو رپورٹ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو بھیجی تھی۔ اس میں بالصراحت یہ بات لکھی ہے کہ ''شاملی میں کوئی لوٹ مار نہیں ہوئی۔'' (اتر پردیش میں آزادی کی جدوجہد (انگریزی): ۱۹۶۰ء، لکھنؤ، انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ)۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ مولانا میرٹھی نے جن بزدل مفسدوں کا جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشے سے سرکاری خیر خواہی کا مظاہر کرنا ثابت کیا ہے۔ وہ صرف صاف اور سچی مخبری ہی نہیں جھوٹ اور تہمت بھی تھی۔ فریق معاملہ (انگریزوں) کے اس اعتراف نے ثابت کر دیا کہ بزرگانِ دیوبند کی سیرت کا پیمانہ وقت کے دوسرے سربرآوردہ مجاہدینِ وطن سے بہت بلند تھا۔ یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے ذہن صاف تھے۔ ان کے سامنے ایک نیا اور بلند مقصد

تھا۔ ان کے دل ذاتی اغراض سے پاک تھے۔ یہ بات پہلے ہی ان بزرگوں کے بارے میں معلوم ہے کہ انھوں نے کسی انگریز یا مقامی بچے بوڑھے عورت یا کسی عام شخص کو نہ ستایا تھا، نہ قتل کیا تھا، نہ لوٹا تھا نہ فساد مچایا تھا۔ انھوں نے ان لوگوں سے خلاف تلوار اٹھائی تھی جو مسلح اور مقابل تھے اور جن سے مڈ بھیڑ ہو گئی تھی۔ مولانا میرتقی کے بیان کے سوا پہلے بھی ان کے خلاف لوٹ مار کا الزام نہ تھا اور اگر چہ اسے بھی انھوں نے بزدل مفسدوں کی تہمت ہی قرار دیا ہے اور اب تو علاقے کے ایک ذمہ دار انگریز افسر کے بیانِ اعتراف نے ثابت کر دیا کہ انھوں نے نہ لوٹ مار میں حصہ لیا تھا اور نہ املاک کو نقصان پہنچایا تھا جیسا کہ خود انگریزوں نے شاملی کے واقعے کے ہفتے عشرے کے بعد ہی تھانہ بھون پر حملے میں اس پر فتح پانے کے بعد کیا تھا۔

اگر یہ مفسد بزدل اور نیت کے خراب نہ ہوتے تو مفسد بھی نہ کہلاتے۔ جو سرسید احمد خان کی ''حمایتِ سرکار'' کے فعل کو ہم کہتے ہیں ہمارا جی چاہتا ہے کہ انھیں وطن کے مجاہدوں اور جاں نثاروں کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، ان کی رائے درست نہ تھی، لیکن ان کی نیت نیک تھی اور وہ مفسد ہرگز نہ تھے۔

نمبر ۱ تا ۳ میں کوئی بات نہ تہمت ہے نہ الزام نہ جھوٹ۔ سیدھی صاف مخبری ہے اور اس کی غرض اپنی جان بچانی اور اپنی رہائی کا چارہ پیدا کرنا تھا اور یہ کہ اس کے سوا ان مفسدوں کو کچھ نظر نہ آیا کہ دوسرے کی طرف اشارہ کر کے اپنی خیر خواہی جتائی جائے۔

تھانہ بھون تحریک جہاد کا مرکز یا ''دارالامارۃ'' تھا امیر الجہاد یا امیر المومنین حضرت حاجی امداداللہ کا دولت کدہ یہیں تھا۔ امام ربانی حضرت گنگوہی، قاسم العلوم حضرت نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی مولانا محمد منیر نانوتوی وغیرہم یہیں موجود تھے۔ علاقے میں نظم و امن کے قیام کی تمام کارروائیاں اسی مرکز سے انجام پاتی تھیں، شاملی پر قبضے کا منصوبہ یہیں بنایا گیا تھا، تحصیل کی عمارت کے قریب دکانوں وغیرہ پر جو چھپر پڑے تھے انھیں اکھیڑ کر تحصیل کے دروازے پر اسی جماعت نے ڈالے تھے اور آگ لگائی تھی اور تحصیل میں محصور انگریزی حکومت کے ملازمین کو اسی جماعت نے تہہ تیغ کیا تھا۔

اگر چہ مخبری کرنے والوں کی نیت کتنی ہی خراب ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صحیح واقعات کی

سچی رپورٹ تھی۔ مولف مرحوم نے اس رپورٹ کی نسبت مفسدوں اور مخبروں سے کردی ہے۔ درحقیقت یہ ان کا اپنا بیان اور اظہارِ حقیقت کا ایک اسلوب ہے کہ ایک ایسے مولف سے جس کا اپنا کتب خانہ (مکتبہ عاشقیہ) ہو، تالیف کتب واشاعت کا مقصد تجارت ہو، سیاست سے جسے کوئی غرض نہ ہو، اصحاب عزائم سے اس کا تعلق نہ ہو، گردوپیش کے خوف ناک حالات اور ہول ناک فضا سے ذہن متاثر ہو، حکومت کی دہشت سے جس کا دل لرز رہا ہو، اس سے ہم صحیح تاریخ نویسی اور اظہار واقعات کے راست اسلوب کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟ آخر ہر ادیب وشاعر اور مصنف ومولف اور ہر سالک راہ تو صاحبِ عزم واستقلال نہیں ہوسکتا۔ ہمیں تو میرٹھی مرحوم کا شکرگذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے مفسدوں اور مخبروں پر ہی الزام دھر کر صحیح واقعات تو بیان کر دیے ہمیں خوشی ہے کہ حضرت میرٹھی نے کسی بات کو چھپایا نہیں اور ایک خاص اسلوب میں سبھی کچھ بیان کردیا ہے۔

معرکہء شاملی کے بعد حالات ناسازگار ہوگئے تھے۔ مخالفین شرارت پر آمادہ اور حکام متلاشی تھے، گرفتار کروانے پر انعام مقرر ہو چکا تھا۔ جمعیت منتشر ہو چکی تھی۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب نے دل برداشتہ ہو کر وطن سے ہجرت کا ارادہ فرمالیا، حضرت گنگوہی کو اپنا مستقر چھوڑنا پڑا، حضرت نانوتوی کو روپوش ہونا پڑا۔ صاحب تذکرۃ الرشید نے سب کے بارے میں تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ حضرت گنگوہی تو ان کی تحریر کا موضوع ہی تھے۔ ان کے حالات میں تو جزئیات تک تفصیلات ہونی ہی چاہییں تھیں۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب اور حضرت نانوتوی کے حالات میں بھی ضروری حد تک تفصیلات موجود ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''تینوں حضرات کے نام چوں کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے اور گرفتار کنندہ کے لیے صلہ تجویز ہو چکا تھا۔ اس لیے لوگ تلاش میں سائی اور حراست کی تگ ودو میں پھرتے تھے۔'' (ایضاص ۷۷)

یہ بیان تو ہر سہ حضرات کے لیے مجموعی ہے۔ ان کے بعد سب کے ابتلا اور حوادث کی تفصیل الگ الگ بیان فرمائی ہے۔

۱۔ حضرت حاجی امداداللہ رحمہ اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اِسی قصبے میں اپنے شیدائی بچوں یعنی مولانا قاسم العلوم اور خلف الرشید امام ربانی کو الوداع کہا کہ اب ارض ہند میں یک جائی فلک کو ناگوار ہے اور یہ دونوں لاڈلے بچے اپنے غم خوار روحانی باپ سے بادلِ ناخواستہ تن بہ تقدیر رخصت ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے چند ماہ انبالہ، تگری، پنج لاسہ وغیرہا مواضع وقصبات میں اپنے آپ کو چھپایا اور آخر بہ راہ سندھ و کراچی عرب کا راستہ لیا۔ ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہی اور ''ہوائی جہاز'' پر سوار ہو کر مکہ معظّمہ پہنچے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے دیوبند اور امام ربانی قدس سرہ نے گنگوہ مراجعت فرمائی۔'' (ایضاص ۷۷-۷۶)

سب سے پہلے اس بیان میں کتابت کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے۔ یہ جو مولانا میرٹھی یا کاتب کے قلم سے نکلا کہ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظّمہ پہنچے۔ مولف مرحوم نے یقیناً پانی کا جہاز یا بادبانی جہاز وغیرہ یا لفظ ''بادبانی'' کے معنوں میں ''ہوائی'' لفظ استعمال کیا ہوگا۔ ہوائی جہاز یعنی ایروپلین تو اس وقت ایجاد ہی نہ ہوا تھا۔

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کو چوں کہ امام ربانی سے زیادہ تعلق تھا اس لیے ہجرت کا ارادہ کر لینے کے بعد آخری ملاقات کے لیے گنگوہ تشریف لائے۔ اس کے بعد پنجاب تشریف لے گئے بہ قول صاحبِ تذکرۃ الرشید:

''اعلیٰ حضرت نے چند ماہ انبالہ، تگری، پنج لاسہ وغیرہا مواضع وقصبات میں اپنے آپ کو چھپایا اور آخر بہ راہ سندھ و کراچی عرب کا راستہ لیا۔''

پنج لاسہ ضلع انبالہ میں اعلیٰ حضرت راؤ عبداللہ خاں رئیس کے مہمان بنے۔ اصطبل کی کوٹھری میں قیام کیا اور کسی شخص کی مخبری کے نتیجے میں حضرت کی گرفتاری کے لیے دوش کے آنے اور کوٹھری میں حضرت کی موجودگی کے باوجود انگریز آفیسر کو حضرت کا سراپا نظر نہ آنے کا خرقِ عادت واقعہ پیش آنے کی تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔

اوپر کے اقتباس کے پہلے جملے ہی پر غور فرما لیجیے! صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسا

واقعہ (قصہ) پیش آچکا تھا، جس میں یہ تینوں حضرات (تھانوی، گنگوہی، نانوتوی) شامل تھے۔ اب چوں کہ اس کا پانسہ اُن کی خواہش کے خلاف۔ پلٹ چکا تھا اور جو حالات پیش آچکے تھے، ان میں تینوں حضرات کا ایک جگہ رہنا مصلحت کے خلاف تھا، اس لیے حضرت تھانوی نے ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ فرمالیا۔

یہ واقعہ شاملی کے سوا اور کون سا قصہ تھا؟ اس میں صاف لفظوں میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے اور سیاق وسباق اس کے مؤید ہیں، تینوں حضرات اس میں شامل تھے اور بعد کے حالات کا تقاضا تھا کہ تینوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ شاملی کے وقوعے میں تینوں کی شرکت اور پھر تینوں کے جدا ہو جانے کی طرف اس سے زیادہ واضح اشارہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ پروفیسر لطیف اللہ وغیرہ اسے پڑھتے ہیں اور غور وفکر کی نظر ڈالے بغیر گزر جاتے ہیں۔ نہیں سوچتے کہ آخر ان کے بزرگ کی یہ عبارت ''واہی'' تو نہیں؟ وہ کیوں نہیں بتاتے کہ اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ اور یہ واقعہ شاملی میں نہیں تو کہاں پیش آیا تھا؟

۲- حضرت نانوتوی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں......

> ''حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ دیوبند میں روپوش تھے۔ ایک روز زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں میں سے کوئی تھا نہیں، زینے میں آکر فرمایا، پردہ کرلو میں باہر جاتا ہوں۔ عورتوں سے رک نہ سکے، باہر چلے گئے۔ جارہے تھے کہ دوش راستے میں ملی۔ آپ ہی کی گرفتاری میں تھی۔ خدا کی شان ہے کہ ایک شخص نے آپ ہی سے پوچھا کہ مولوی محمد قاسم کہاں ہیں؟ آپ نے ایک قدم آگے بڑھا کر پچھلے پاؤں کی طرف نظر ڈالی اور فرمایا ابھی تو یہاں تھا۔ یہ فرما کر آپ آگے چلے گئے اور دوش نے مکان پر جاکر تلاشی لی آخر ناکام واپس ہوئی۔''

ہر چند کہ یہ حضرات حقیقتہً بے گناہ تھے مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی ومفسد اور مجرم وسرکاری غدار ٹھہرا رکھا تھا۔ اس لیے گرفتاری کی تلاش تھی مگر حق تعالیٰ کی حفاظت بر سر تھی۔ اس لیے کوئی آنچ نہ آئی اور

جب کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے ہاں چند روز کی تفریق بین الاحباب مقدر تھی وہ اٹھانی تھی سو اٹھائی اور اس ضمن میں کرامات و خوارق عادات غیبی حفاظت کے سامان اور سچائی ثابت ہونے کے اسباب ظاہر ہوئے۔ اس قصے کے بعد مولانا مسجد میں رہتے اور کوئی کسی قسم کا تعرض نہ کرتا تھا۔'' (ایضاص ۷۹)

۳۔حضرت نانوتوی ہی کے بارے میں لکھا ہے......

''انھیں ایام روپوشی میں مولانا قاسم العلوم کو املیا، گمتھلا، لاڈوہ، پنج لاسہ اور جمنا پار کئی دفعہ آنے جانے کا اتفاق ہوا۔''

مذکورۃ الصدر پہلے اقتباس میں زیر خط چند جملے آئے ہیں جن سے بعض حضرات غلط فہمی میں مبتلا اور نکتہ چینی پر آمادہ ہوئے۔ان پر آگے چل کر نظر ڈالیں گے جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا کہ حضرت گنگوہی تو تذکرہ کا موضوع ہی ہیں اس لیے محترم مولف نے حضرت کے ذکر میں سب سے زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے۔اور ''گرفتاری وحوالات اور رہائی و برأت'' کے عنوان سے ایک مستقل مبحث ہے، اسے باب کہیے یا فصل کا نام دیجیے اس میں مسئلے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے چند مباحث یہ ہیں!

'' حالات کی نزاکت اور خطرات کا ہجوم ''اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے شوق و دیدار میں پنج لاسہ کا سفر، اعلیٰ حضرت سے وطن میں آخری ملاقات، پنج لاسہ سے واپسی اور رام پور میں حکیم ضیاء الدین کے مکان پر روپوشی، گنگوہ میں گارڈن کرنیل فرانسیسی کا چھاپہ اور حضرت کے شبھے میں مولوی ابوالنصر (ماموں زاد بھائی) کی گرفتاری اور تذلیل وتشدد، رام پور میں حضرت کی گرفتاری اور سہارن پور روانگی، سفر کی کیفیت راستے کی تکالیف، سہارن پور جیل میں بندش، حضرت کی اہلیہ کی پریشانی، پھر مظفر نگر جیل میں منتقلی، راستے میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی سے ملاقات اور اشاروں میں خیریت طلبی اور اطمینان بخشی مظفر نگر جیل میں چھ ماہ کی بندش جیل کے اشغال اور قیدیوں میں وعظ وتذکیر، دورانِ تفتیش حضرت کا رویہ، جیل میں اعلیٰ

حضرت حاجی صاحب کی ملاقات کا خرقِ عادت واقعہ، حضرت کی رہائی کے بارے میں اعلیٰ حضرت کا کشف، رہائی کا حکم اور اہل خاندان کی بے پایاں خوشی، گنگوہ میں حضرت کی رہائی سے شادمانی کی لہر اور اجڑے دیار کی آبادی۔''

معرکہء شاملی کے متعلقات کی بحث تو اس مقام پر ختم ہو جاتی ہے لیکن اس باب کا خاتمہ اس انداز سے کیا ہے کہ یہ بحث حیاتِ مستعار کا بے جوڑ ٹکڑا نہ معلوم ہو چناں چہ درس و تدریس حدیث کا ہنگامہ، فیضان دینی و علمی کا شیوع، ریاضات و مجاہدات کی طرف اشارات عزیمت و استقامت کا تذکرہ حضرت کی جامعیت گویا پوری زندگی کا اجمالی بیان ہے اور یہ قول حضرت مولف:

''اس پاک خلاصے پر آپ کی چند روزہ حیات ختم ہوگئی اور آپ کو اپنے پیدا کرنے والے مہربان خدا سے لقا حاصل ہوئی۔ رحمتہ اللہ رحمتہ واسعتہ (ایضاً ص ۸۸)

حضرت کی وفات کا سانحہ اگست ۱۹۰۵ میں پیش آیا تھا......

(۳)

شاملی کے واقعے سے پہلے اگرچہ قاضی عنایت علی کے بھائی عبدالرحیم خان کی پھانسی کا واقعہ پیش آ چکا تھا اور کسی نہ کسی درجے میں قاضی صاحب کے لیے شاملی پر حملے میں بھائی کے انتقام کا جوش بھی محرک بنا ہوگا لیکن جن بزرگوں کی معرکہء شاملی میں شرکت زیر بحث ہے، ان کے لیے محض یہ ایک واقعہ میدان عمل میں نکلنے کی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے کافی غور و خوض اور بحث و نظر کے بعد میدان جہاد میں قدم رکھا تھا یہی وجہ ہے کہ شیر علی کے باغ کے پاس پیش آنے والے واقعے میں ان حضرات کی شرکت کا اشارہ نہیں ملتا۔ قاضی عنایت کے ساتھ ان کے چند رفقاء اور کچھ لوگ رعایا میں سے تھے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم لکھتے ہیں:

> ''زمانہ تھا احتیاط کا فوراً ناکردہ گناہ جماعت (عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں) کو پھانسی کا حکم ہوگیا اور اگلے دن عنایت علی خان کو اپنے بھائی کی دنیا سے رحلت کی اطلاع ملی۔ اسی صدمے سے عنایت علی خان پر رنج و غم کے پل ٹوٹ پڑے اور جوش خون میں بھائی کے انتقام کا

خیال پختہ ہو گیا۔

اتفاق سے چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی پیٹیاں لادے سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی اور یہ اپنے جنون میں مست چند رفقا اور رعایا کو ساتھ لے کر شیر علی کے باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گزرے ان کا اسباب لوٹ لیا۔

''ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہوا بہ سمتِ مشرق جنگل کو بھاگا مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا'' (تذکرۃ الرشید (حاشیہ) ص ۷۴)

شاملی پر حملے سے پہلے بحکم ''وَاَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ'' آپس میں مشورہ کیا گیا تھا۔ مشورے کی اس مجلس میں حضرت شیخ محمد تھانوی بھی شریک ہوئے تھے۔ وقت کے حالات و مسائل زیرِ بحث آئے تھے اس مجلس میں حضرت تھانوی کے ان اعتراضات اور ان کے جوابات کا پتا چلتا ہے۔

۱- حالات حکومت سے بغاوت کے متقاضی نہیں یا اس کا پہلا جواب تو یہی تھا کہ حکومت ہے کہاں؟ بہ قول صاحب تذکرۃ الرشید حکومت تو نظم و امن کی ذمے داری سے دست کش ہو گئی تھی اور عوام کو اپنی اپنی حفاظت کی اجازت دے دی تھی۔ نیز حکومت کے مظالم معاہدات شکنی، فساد کے پھیل جانے کی کیفیت کے بیان نے حضرت تھانوی کو ساکت کر دیا۔

۲- حضرت تھانوی کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ہم کمزور ہیں۔ طاقت و قوت اور وسائل و سرو سامان جہاد سے محروم ہیں۔ جہاد میں کامیابی کی امید نہیں اس لیے ہمیں اس میدان میں قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ اس سوال کے جواب کا فیصلہ حضرت قاسم العلوم نانوتوی کے اس استفسار نے کر دیا کہ ''کیا ہم اصحاب بدر سے بھی کمزور ہیں؟''

۳- قرین قیاس یہ ہے کہ قاضی عنایت علی اس موقع پر موجود تھے اور چوں کہ ان کی سربراہی میں شیر علی کے باغ کے نزدیک ایک معرکہ پیش آ چکا تھا اس لیے شاید حضرت تھانوی کے کسی گوشۂ خیال میں یہ بات تھی کہ آئندہ امارت اور اعمال جہاد و قتال میں بھی وہی سربراہی

اور قیادت کے منصب پر فائز ہوں گے چناں چہ صاف یا مبہم لفظوں میں یہ بات بھی کہی گئی کہ ہم میں امیر کی صفات کی حامل شخصیت موجود نہیں اس موقع پر حضرت محمد ضامن نے اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ کا دامن پکڑ لیا کہ حضرت والا کی ذات ستودہ صفات ہر لحاظ سے منصب امارت اور میدان جہاد میں قیادت کی اہل ہے۔

حضرت کے سوا ہمیں کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

اس پر مجلس ایک فیصلے پر پہنچ گئی تمام حضرات نے حضرت حاجی صاحب کے دست حق پرست پر بیعت کر لی اور انھیں امیر الجہاد امیر المومنین مقرر کر لیا گیا۔ امارت اسلامیہ کے قیام کا فیصلہ طے پا گیا اور جہاد میں حصہ لینے کے فیصلے کا اعلان کر دیا گیا اور بہ قول صاحب تذکرہ......

''جتھے کا جتھا تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا اور کیا جو کچھ کر سکتا تھا۔'' (تذکرۃ الرشید: ص ۷۳ حاشیہ)

''اور کیا جو کچھ کر سکتا تھا'' جملہ تحسین ہے طنز یا نفرین نہیں کہ یہ ان کے بزرگوں کی ان کی بساط اور حاصل شدہ وسایل کے حدود میں کارگزاری تھی۔ جو حضرات اس حقیقت کا انکار کرتے ہیں' اس کا اعتراف اور اس پر فخر نہیں کرتے' ان پر تعجب ہوتا ہے! اس کارگزاری کے باوجود ایک صاحب قلم فرماتے ہیں کہ مولانا قاسم نانوتوی وغیرہ کے معرکہ شاملی میں شرکت کا کوئی ثبوت نہیں۔ صاحب تذکرہ نے اسے مفسدوں اور دشمنوں کی اڑائی ہوئی افواہ بیان کیا ہے اور مفسدوں کی بات کا اعتبار کیا؟ یا للعجب! پھر آخر یہ ''جتھا'' کن لوگوں پر مشتمل تھا؟ اس کے دو چار شرکاء کی نشان دہی تو کی جانی چاہیے نا!

یہ ایک بات تو بیان معترضہ کے طور پر بیچ میں آ گئی تھی کہنا یہ چاہتا تھا کہ ......

حضرت شیخ محمد تھانوی اس فیصلے سے مطمئن نہ تھے حال آں کہ یہ ان کی اپنی جماعت کا فیصلہ تھا۔ وہ اس شوریٰ اور اس کے فیصلے میں خود شریک تھے۔ ان کے اعتراضات یا وساوس کا مسکت جواب دے دیا گیا، شوریٰ میں کوئی دوسرا شخص ان کا ہم خیال و رائے نہ تھا، ان کے لیے اور کوئی گنجایش باقی نہ رہی تھی لازم تھا کہ حضرت جماعت کے فیصلے اور منصوبے کے آگے سر جھکا دیتے لیکن افسوس کہ جماعتِ حقہ کے ایک فتوے سے انحراف کیا گیا اور اس کا الزام اسی خانوادۂ دینی کے ایک بزرگ پر آیا۔ یہ حضرت تھانوی کی شرافت نفسی اور اسلامی سیرت کی شان تھی کہ

حضرت نے اس فتوے اور اس کے نتائج پر کبھی کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نہ کسی کی زجر و توبیخ کی۔ عام الفاظ اور سادہ اسلوب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور پھر کبھی اس وادی پر خار کی طرف رخ نہ کیا۔ اگرچہ ان کے اخلاف واصاغر سیاسی نہ ہونے کے باوجود سیاست میں ٹانگ ضرور اڑاتے رہے۔ معلوم نہیں حضرت انگریزی استعمار کے دعاگو تھے یا نہیں لیکن وہ اس کے بدخواہ یا مخالف ہرگز نہ تھے۔

(۴)

قیام پاکستان کے بعد اس سلسلے کے بعض اہل قلم نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ قیام پاکستان میں حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی کے بعض خیالات کو بنیاد بنا کر حضرت شیخ محمد تھانوی سے تحریک پاکستان کا رشتہ جوڑ دیا جائے یہ جذبہ ایسا نہ تھا کہ اس پر حرف زنی کی جائے۔ اس خیال وسعی میں وہ تنہا نہیں اور بھی جماعتیں ہیں جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کو اسلامی ملک (دارالاسلام) سمجھتی رہی تھیں لیکن ان کے مصالح وحالات نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے افکار واعمال کا ایک نیا قصر تعمیر کریں اگر حضرت تھانوی کے عقیدت کیش بھی ایسا چاہتے ہیں تو اس سے انھیں کون روک سکتا ہے لیکن اخلاف کے رویے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گویا حضرت قاسم العلوم مولانا نانوتوی اور اس سلسلے کے بزرگوں اور ان کے عقیدت کیشوں سے حضرت شیخ محمد تھانوی کی شکست کا انتقام لینے پر تل گئے ہیں۔

اگر شوریٰ کے ارکان کو یہ حق دیا جائے کہ اگر شوریٰ میں ان کی رائے کے مطابق فیصلہ ہو تو وہ اس میں شامل رہیں اور اگر وہ اپنی بات نہ منوا سکیں تو وہ اس سے الگ ہو جائیں تو اجماع کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔ اور اگر ہر شخص اپنی رائے منوانے ہی کے لیے کسی مجلس میں شریک ہو اور اس کی نہ چلے تو وہ الگ ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا لے، اگر ایسا ہو تو وہ اسلامی شوریٰ ہوئی کہاں؟ فرض کیجیے! شوریٰ کا فیصلہ حضرت شیخ کی رائے کے مطابق ہوتا اور حضرات قاسم ورشید رحمہما اللہ شوریٰ میں تو اپنی رائے کے دفاع اور اس کی صحت وصواب کو منوانے سے عاجز آ جاتے اور باہر نکل کر فیصلے کے برعکس انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھاتے تو کیا یہ جماعت سے خروج نہ ہوتا؟ اور ان کی موت جہالت کی موت نہ ہوتی؟ حضرت شیخ

تھانوی چوں کہ نہ سیاسی ذوق سے آشنا تھے نہ عملی آدمی تھے شوریٰ کا فیصلہ ان کے دل نے قبول نہیں کیا تھا نہایت شرافت کے ساتھ خاموش ہو کر بیٹھ گئے اگر انھوں نے فیصلہ ءشوری کے مطابق عمل نہیں کیا تھا تو شوریٰ سے اٹھ کر انھوں نے فیصلے کے خلاف بھی کوئی لفظ نہ کہا تھا۔

آج اگر کوئی مصنف شوری کے اجلاس میں حضرت کی رائے سے شوریٰ کے فیصلے کے خلاف استدلال کرتا ہے تو یہ درست اور معقول رویہ نہیں ہے۔ صورت حالات کی جو تصویر ہمارے سامنے ہے اس کے مطابق تو حضرت کے عجز و سکوت سے فیصلۂ شوری کی توثیق و تصویب ہوتی ہے۔ اور اگر حضرت شیخ محمد تھانوی کو اپنی رائے کی اصابت پر اتنا ہی اعتماد تھا اور ذوق عمل سے ان کا قلب آشنا تھا تو ان پر فرض تھا کہ وہ شوریٰ سے نکل کر اپنی رائے کا اختلاف ہی ظاہر فرما دیتے اور خدا اس سے زیادہ توفیق عمل بھی دیتا تو جن لوگوں نے انگریزوں کے خلاف طغیان و سرکشی میں تلوار اٹھائی تھی تو حضرت پر فرض تھا کہ وہ انگریزی حکومت کے بقا و استحکام میں حق کی شمشیر برہنہ بن جاتے۔ ہم تو یہ نہیں سمجھتے کہ وہ سرسید اور انگریزوں کے وفادار (لائل محمڈنس آف انڈیا) سے بھی کمزور سیرت کے مالک اور فروتر شخصیت تھے۔

اللہ تعالیٰ حضرت شیخ تھانوی مرحوم و مغفور کے مرقد کو اپنے انوار و برکات سے بھر دے اور ان کے نام نہاد مخلصین اور لطیف اللہ جیسے اہل قلم سے ان کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھے۔ ان صاحب کی عقیدت و ارادت کے بعد حضرت کی رسوائی کے سروسامان کے لیے کسی نکتہ چیں کی ضرورت نہیں۔

(۵)

شاملی کے معرکے میں قاضی عنایت علی کا نام تو ضرور آیا ہے اس لیے کہ وہ اس علاقے کی ایک معروف شخصیت تھے اور حکومت سے ان کی دشمنی ظاہر ہو چکی تھی لیکن لشکر مجاہدین کے سالار یا امیر الجہاد کی حیثیت سے ان کا نام نہیں آیا۔ مولانا میرٹھی نے حضرت گنگوہی حضرت نانوتوی وغیرہما کے بجائے ان کا نام لیا ہے تو اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ منظر سے ہٹ چکے تھے۔ ان کا پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں؟ ان کا نام لینے میں اُن کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکتا تھا اور دوسرے حضرات حکومت کے ستم کا نشانہ بننے سے بچ رہے تھے۔

بہ ہر حال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ شاملی کے معرکہ، جہاد میں حضرت امام ربانی اور ان کے رفقائے عظیم و محترم کے پیش نظر ایک فرض کی ادائیگی اور ہندوستان میں اسلامی نظم جماعت اور ملت اسلامیہ کے قیام کی آرزو تھی۔ بعض ناقدوں اور نکتہ چینوں کا یہ خیال ہے کہ اس معرکے کے اصل بانی و مبانی قاضی عنایت علی تھے اور ان کا جوشِ انتقام اس کا محرک تھا قطعاً غلط اور محض وسوسہ تھا۔ البتہ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ کسی درجے میں قاضی صاحب کے دل میں جذبہء انتقام موجود ہو لیکن حضرت گنگوہیؒ حضرت قاسم نانوتوی حضرت ضامن شہید، مولانا مظہر اور مولانا منیر کے اخلاصِ عمل جہاد اور سعی قیامِ ملت کا دامن اس سے قطعی پاک تھا۔ اس وقت حالات پہلے ہی سے بہت خراب تھے۔ ایک غدر برپا تھا، ضلع سے امن اٹھ چکا تھا۔ حکام نظم و امن کی ذمہ داری سے بالاعلان الگ ہو چکے تھے۔ مولانا میرٹھی مرحوم نے نہ صرف حالات کی انتہائی خرابی اور فساد کے ظہورِ عام کا اعتراف کیا ہے بلکہ نہایت تفصیل فرمادی ہے۔ حضرت گنگوہی کو امیر المومنین چن لیا گیا تھا۔ تھانہ بھون مرکز امارت تھا۔ انتظامیہ و عدلیہ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلے کے موافق طے ہونے لگے تھے۔ خود حضرت میرٹھی کے بیان کے مطابق:

۱۔ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے۔

۲۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھالیا اور بہ ذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔

۳۔ آپ چوں کہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لیے دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ

۴۔ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور

۵-آپ نے دیوانی و فوج داری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلے کے موافق چندروز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔

۶-اس قصے نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔

۷-حضرت امام ربانی قدس سرہ دس برس ہوئے اعلیٰ حضرت کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔ ہمیشہ آمد و رفت رہتی تھی۔ اب جب کہ

۸-ہر چہار طرف بدامنی تھی، آپ کے لیے یہاں حاضر رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی، ادھر

۹-اعلیٰ حضرت کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے۔

۱۰-اس لیے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب معہ دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔ (تذکرۃ الرشید، ص ۷۴)

یہ تذکرہ الرشید کی مسلسل عبارت ہے۔ اس میں سے کوئی جملہ بلکہ ایک لفظ تک حذف نہیں کیا ہے۔ اس میں کوئی بات استعارہ و کنایہ میں نہیں کہی گئی ہے' نہ کوئی جملہ ایسا ہے جس کی تاویل و توجیہ کی ضرورت پیش آئے۔

اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ حالات ابتر تھے۔ نظام تہ و بالا ہو گیا تھا۔ حکومت نظم و امن کی ذمہ داری سے بالاعلان الگ ہو چکی تھی۔ لوگ (بلا تخصیص مسلم و غیر مسلم) آئے' حضرت حاجی صاحب سے دنیاوی حکومت کے نظم کے قیام کی ذمہ داری اُٹھانے کی درخواست کی۔ حضرت کو یہ ذمہ داری قبول کرنی پڑی۔ حضرت نے ایک مدت تک دیوانی و فوج داری کے جملہ مقدمات کو طے فرمایا۔ حضرت گنگوہی پر نظامِ عدلیہ کی خاص ذمہ داری تھی اور حضرت نانوتوی اور دیگر حضرات اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے رفیق و معاون تھے اور فرایض کی ادائیگی کے سلسلے میں یہ تمام حضرات تھانہ بھون میں رہ پڑے تھے۔ ان کا مرکز یہی تھانہ بھون

تھا۔ مختصر الفاظ میں اس عہد فتنہ وفساد میں یہ ایک با قاعدہ اور منظم حکومت تھی جس کا قیام اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی سربراہی میں ہوا تھا اور حضرت گنگوہی، مولانا نانوتوی اور دیگر حضرات اس حکومت کے اعضاو جوارح تھے۔

اس عبادت میں امیر المومنین، شرعی فیصلہ، قاضی شرع وغیرہ چند اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں لیکن ان سے کسی غیر مسلم کو بھی متوحش ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ عام سیاسی اصطلاحات ہیں ایک مسلمان عالم اور عربی زبان کے ماہر کے قلم سے یہی نکل سکتی تھیں۔

۱-امیر المومنین ایک با اختیار حاکم جسے کسی ملک یا خطہء ارض کے لوگوں نے تسلیم کر لیا ہو جو اپنے مقبوضہ ومفتوحہ میں نظم وامن قائم کر سکے اور رعایا کے مختلف طبقات وافراد کے مابین حق وانصاف کے مطابق ان کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ اگر اس علاقے میں آبادی مسلمانوں کی ہو اور مسلمانوں ہی نے اسے چنا ہو تو وہ امیر المومنین ہوگا۔

اگر دوسری مذہبی اور غیر قوموں کی ملی جلی آبادی ہو تو وہ ان کا امیر، حاکم بادشاہ، سلطان راجا وغیرہ القاب سے پکارا جائے گا۔

۲-شرعی فیصلہ۔ کسی امر مختلف فیہ میں رفع اختلاف وفساد اور حفظ حق کے لیے ہر منصفانہ فیصلہ شرعی فیصلہ ہے۔ قانون اور ضابطے کا ہر فیصلہ اُس شرع کا فیصلہ ہوتا ہے۔

۳-قاضی، حاکم عدالت، منصف جسٹس، جھگڑے چکانے والے کے لیے قانون کی ایک عام اصطلاح ہے۔

ان میں کسی اصطلاح کا اسلام کے نظام عقاید سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر یہ الفاظ اپنی صفات سے متصف نہ ہوں تو ان کا عربی میں ہونا بھی کسی مسلمان کے لیے اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتا اور اگر دنیا کی معروف وغیر معروف اور مشرق ومغرب کی کسی زبان میں بھی یہ امور و مناصب مع الصفات ہوں تو وہ شریعت اسلامیہ کے مطلوب ومقصود متصور ہوں گے، اسلامی کہلائیں گے اور کوئی مسلمان ان سے اعراض اور ان پر اعتراض نہیں کر سکتا۔

(۶)

جو حکومت قائم ہوئی تھی اس کے ارکان کو قیامِ نظم و حفظِ امن کی ضرورتوں سے مختلف مقامات پر جانا پڑتا تھا اور انگریزوں کے نظم حکومت اور عوام کی جان و مال کی حفاظت کی ذمے داری اُٹھا لینے کی وجہ سے ملک میں جو ابتری پیدا ہوگئی تھی اور اہلِ ملک (ہندوؤں اور مسلمانوں) کے جو گروہ و غول اپنے ہی بھائیوں کی لوٹ مار میں مبتلا ہوگئے تھے اور اپنی بستیوں میں فساد پھیلا رہے تھے ان سے مقابلے کی صورت بھی پیش آجاتی تھی یہ مضمون کسی تحریر سے بہ طور اشارۃ و دلالۃ اخذ نہیں کیا ہے مولانا میرٹھی مرحوم کی صاف اور واضح تحریر ہے، مولانا فرماتے ہیں:

۱- اس گھبراہٹ کے زمانے میں جب کہ عوام لوگ بند کواڑوں گھر میں بیٹھے ہوئے کانپتے تھے حضرت امام ربانی اور نیز دیگر حضرات اپنے کاروبار نہایت ہی اطمینان کے ساتھ سرانجام دیتے اور جس شغل میں اس سے قبل مصروف تھے بہ دستور ان کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ کبھی ذرہ بھر اضطراب نہیں پیدا ہوا اور کسی وقت حبہ برابر تشویش لاحق نہیں ہوئی۔

۲- آپ کو اور آپ کے مختصر مجمع کو جب کسی ضرورت کے لیے شاملی، کیرانہ، مظفر نگر جانے کی ضرورت ہوئی غایت درجے سکون و وقار کے ساتھ گئے اور طمانیت قلبی کے ساتھ واپس ہوئے۔

۳- ان ایام میں آپ کو ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے۔

۴- حفاظت جان کے لیے تلوار البتہ [illegible] رکھتے تھے اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر شیر کی طرح نکلے چلے آتے تھے۔

۵- ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت حاجی صاحب و نیز

حافظ ضامن صاحب کے ہم راہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا یہ
نبرد آزما دلیر جتھا اپنی سرکار کے باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ
جانے والا نہ تھا۔ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار
پر جاں نثاری کے لیے تیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و جواں مردی کہ
جس ہول ناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب
ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھ میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے
سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چناں چہ
آپ پر فیرین ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمتہ اللہ علیہ زیر
ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔

حضرت قاسم العلوم ایک مرتبہ یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا
جانا کہ کنپٹی میں گولی لگی اور دماغ پار کر کے نکل گئی اعلیٰ حضرت نے لپک
کر زخم پر ہاتھ رکھا فرمایا کیا ہوا؟ میاں! عمامہ اتار کر سر جو دیکھا کہیں
گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر''۔

۶ - حضرت امام ربانی قدس سرہ کو...... حضرت حافظ ضامن کے ساتھ
بھی نہایت ہی درجہ مخلصانہ انس تھا اور حافظ صاحبؒ بھی مولانا کے گویا
جاندادہ عاشق تھے۔ اس گھمسان میدان میں مولانا کو پاس بلایا اور فرمایا
''میرا دم نکلے تو تم میرے پاس ضرور ہونا'' تھوڑی دیر گزری تھی کہ
حافظ صاحب دھم سے زمین پر گرنے۔ معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور
خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا۔ حافظ صاحب کا زخم سے چور ہو کر گرنا تھا
اور حضرت امام ربانی کا لپک کر تڑپتی نعش کا کاندھے پر اٹھانا۔ قریب کی
مسجد میں لائے اور حضرت کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن میں
مشغول ہوگئے۔'' (تذکرۃ الرشید: ص ۷۵-۷۴)

یہ تذکرۃ الرشید کی مسلسل عبارت ہے اس میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی ہے اور نہ کوئی جملہ یا

لفظ حذف کیا گیا ہے۔ بحث میں سہولت کے لیے اسے چھ دفعات میں مرتب کر دیا ہے۔ یہ ایک صاف وسادہ اور تشریح وتوضیح سے بے نیاز بیان ہے۔

☆ اس کی دفعہ اول میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے معمول اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔

☆ دفعہ دوم میں حضرت امام ربانی اور آپ کے رفقائے کرام کے شاملی، کیرانہ، مظفر نگر وغیرہ کے انتظامی اسفار پر روشنی پڑتی ہے۔

☆ دفعہ سوم سے پتا چلتا ہے کہ کچھ غیر ذمہ دار (خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان) اہل وطن نے حالات کی خرابی اور نظام حکومت کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہی ہم وطنوں کی لوٹ مار کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ یہ فساد تھا اور اس کے پھیلانے والے مفسد تھے۔

☆ یہی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ حضرت امام ربانی اور آپ کے رفقائے محترم نے ان فسادیوں سے سختی سے نمٹا تھا اور نہایت بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ صاحب تذکرہ کے الفاظ ہیں......

''ان ایام میں آپ کو ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے''

اس کا سیاق وسباق اور اسلوب بیان اس کا غماز ہے کہ ایک بار سے زیادہ اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا نیز یہ کہ یہ غول کے غول انگریزی حکومت کے وفادار نہیں تھے بلکہ صاف اشارہ اہل ملک فسادیوں کی طرف ہے، جنھوں نے حضرت حاجی صاحب کے نظام امامت یا حکومت کو بھی قبول نہیں کیا تھا اس وقت انگریزی نظام حکومت اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ موجود بھی نہ تھا اگر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ان فسادیوں سے تعرض نہ کرتے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے تو فرائض امامت/امارت میں کوتاہی ہوتی۔

☆ پانچویں دفعہ میں شاملی کے خاص معرکے کا ذکر ہے یہ معرکہ ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو پیش آیا تھا۔ اس کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حافظ محمد ضامن شریک تھے اس معرکے میں ان حضرات نے نہایت دلیری، شجاعت اور جواں مردی کا ثبوت دیا تھا اور

دشمنوں کے سامنے اٹل پہاڑ کی طرح پر اجما کر ڈٹ گئے تھے۔ اس معرکے میں مولانا قاسم نانوتوی کی کنپٹی میں گولی لگی تھی لیکن حضرت امام کی کرامت کا ایسا ظہور ہوا کہ دست مبارک لگتے ہی زخم غائب ہو گیا البتہ خون کی تری دامن پر اپنا نشان چھوڑ گئی۔

مولف تذکرۃ الرشید کے الفاظ میں یہ گویا شاملی کے میدان کارزار کی تصویر ہے۔ اگر اس اجمالی واقعے میں تاریخ کا رنگ بھرنا ہو تو سرسید مرحوم کی تحریر سے تحصیل شاملی میں محصورین کی تعداد ان کے سرگروہ کے ناموں، ان میں سے مقتولین کی تعداد، تاریخ وقوعہ وغیرہ کا اضافہ کر دیا جائے تو ایک مکمل تاریخی، رنگین اور دلچسپ تصویر بن جائے گی۔ یہی وہ تاریخی معرکہ تھا جس میں حضرت حافظ محمد ضامن شہید ہوئے تھے۔ حضرت مولف نے حافظ ضامن کی آخری گفتگو اور پیٹ میں گولی لگنے کے واقعے سے آخری لمحات حیات اور پھر نعش کو تھانہ بھون لے جا کر تدفین تک کی مختصر روداد بیان کر دی ہے لیکن آج اس سلسلے کا کوئی اہل قلم یہ نہیں بتاتا کہ یہ واقعات کب اور کہاں پیش آئے تھے؟

چھٹی اور آخری دفعہ میں دو جملے (۱) ''اس گھمسان میدان میں'' (۲) ''قریب کی مسجد میں'' آئے ہیں۔ اسی میدان کے بارے میں (دفعہ ۵ میں) کہا گیا ہے ''جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے، وہاں چند فقیر ہاتھ میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جملے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔'' یہیں اور اسی میدان میں حضرت مولانا محمد قاسم کی کنپٹی میں گولی لگتی ہے۔ یہیں حافظ ضامن زیر ناف گولی کھا کر گرتے ہیں۔

یہ میدان کون سا تھا جہاں گھمسان کا رن پڑا تھا؟ یہ میدان کہاں تھا؟ اور وہ مسجد جس میں حافظ ضامن کی تڑپتی نعش کو کاندھے پر ڈال کر لے جایا گیا تھا اور انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی تھی، کون سی تھی اور کہاں تھی؟ اس پر کوئی بھی روشنی نہیں ڈالتا۔ آخر جب واقعات پیش آ چکے تھے تو ان کا کوئی محل وقوع بھی ہوگا؟

ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ جہاں صاحب تذکرہ کے بیان کردہ واقعات پیش آئے تھے، وہ تحصیل شاملی کے سامنے کا میدان تھا اور تحصیل کے قرب و جوار ہی کی ایک مسجد تھی اور

بس!

عجیب بات ہے کہ واقعات تسلیم کرتے ہیں اور ان کے محل وقوع سے انکار ہے۔

(۷)

اب ہم حضرت مولف کی چندان عبارتوں پر نظر ڈالیں گے جن سے بعض حضرات غلط فہمی میں مبتلا ہوئے یا وہ واقعی مشتبہ تھیں۔

(الف) تمام حضرات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہر چند کے یہ افراد حقیقتہً بے گناہ تھے۔ مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی و مفسد اور مجرم و سرکاری خطاوار ٹھہرا رکھا تھا اس لیے گرفتاری کی تلاش تھی مگر حق تعالیٰ کی حفاظت بر سر تھی اس لیے کوئی آنچ نہ آئی اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔ ہاں! چند روز کی تفریق بین الاحباب مقدر تھی وہ اٹھانی تھی سو اٹھائی۔'' (تذکرۃ الرشید ص ۷۹)

(ب) حضرت گنگوہی کے متعلق لکھتے ہیں:

''آخر جب تحقیقات اور پوری تفتیش و چھان بین سے ثابت ہو گیا کہ آپ پر جماعت مفسدین کی شرکت کا محض الزام ہی الزام ہے اور بہتان ہی بہتان ہے اس وقت رہا کیے گئے اور آپ بہ خیر و عافیت واپس آئے۔''

(ج) حضرت گنگوہی کے بارے ہی میں مولف مرحوم لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ آپ کا نام بھی مشتبہ اور قابل اخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے اور آپ کی گرفتاری اور تلاش میں دوش آیا چاہتی ہے، مگر آپ کوہِ استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا

اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے اسے اختیار ہے جو چاہے کرے اپنا
تو بال برابر بھی فکر نہ تھا۔'' (ایضاً ص ۸۰)

لیکن اس سے پہلے کہ مذکورۃ الصدر عبارات پر نظر ڈالی جائے یہ ضروری ہے کہ یہ غور و
تصفیہ فرما لیجیے کہ اس وقت حالات کیا تھے؟

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان ہے:

۱- اطراف کے شہر شہر اور قصبے قصبے میں بدامنی پھیل گئی حاکم کے انتظام کا
اٹھنا تھا کہ باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے اور خدا
جانے کس کس زمانے کے انتقام لینے کا وقت آ گیا کہ جدھر دیکھو مار
پیٹ اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی و جنگ۔ (ایضاً ص ۷۳)

۲- لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور
عرض کیا کہ......

☆ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے۔

☆ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا اور
بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو
خود کرنی چاہیے۔

☆ اس لیے آپ چوں کہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لیے دنیاوی نظم
حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی
قضیے چکا دیا کریں۔

☆ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے
سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوج داری کے جملہ مقدمات
شرعی فیصلے کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔''
(ایضاً ص ۷۴)

پس ایسے حالات میں کہ حکومت نے نظم و امن کے قیام کی ذمہ داری سے کنارہ کشی کر لی

ہو، ملک میں کوئی حکومت نہ ہو آئین و دستور کی حکمرانی باقی نہ رہی ہو، لاقانونیت پھیل گئی ہو، ہر طرف فساد برپا ہو، لوگ اپنے اپنے انتقام لے رہے ہوں، ہر طرف خون خرابا ہو رہا ہو، اگر ایک جماعت اٹھتی ہے اور ایک نظام قائم کرتی ہے، امن کے قیام میں ساعی ہوتی ہے، فساد رفع کرتی ہے، لوگوں کے جھگڑے چکاتی ہے، خصومات مٹاتی ہے۔ مقدمات کے فیصلے کرتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس نے غلط قدم اٹھایا؟ کیا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟ اگر اس نے بغاوت کی تو کس حکومت یا نظام سے؟ اگر اس نے غداری کی تو کس شخص یا جماعت سے؟ اور اگر اس نے خلاف ورزی کی تو کس حاکم کے حکم سے اور کس آئین یا دستور کی کس دفعہ سے؟ جب کہ کوئی حکومت، کوئی دستور و آئین اور کوئی حاکم تھا ہی نہیں؟ اگر وفاداری و فرماں برداری اور اطاعت کوئی کرنا بھی چاہتا تو کس شخص، حکومت اور قانون کی کرتا؟ کیا وہ حکومت قابل اطاعت تھی جو اٹھ چکی تھی یا کسی ایسی موہوم حکومت کی اطاعت کی جاسکتی تھی جو ابھی قائم ہی نہیں ہوئی تھی؟

پھر اگر وہی حکومت جو اٹھ چکی تھی یا کوئی اور قوت سامنے آئے اور طاقت، دھوکے اور فریب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرلے تو کیا اہلِ ملک اپنی جان چھڑانے اور بچانے کے لیے اپنے تئیں استبداد یا کسی ظالم حاکم اور سلطانِ جائر کے حوالے کردیں کہ وہ تذلیل وتعذیب کا شوق پورا کرے اور تختۂ ستم بنائے اور جسے چاہے دار پر کھینچ دے، تہہِ تیغ کردے یا توپ سے اڑادے۔

اگر تھانہ بھون، گنگوہ، نانوتہ کے بزرگوں نے عوام کے اصرار پر خدمت خلق کے جذبے سے خود کوئی نظام قائم کرلیا تھا، فساد مٹانے کی کوشش کی تھی اور انھوں نے اپنے قائم کردہ نظام کے خلاف جو علاقے کے عوام کی درخواست پر قائم کیا گیا تھا دوبارہ انگریزوں کے غلبے کی خبر سنتے ہی اور حالات دگرگوں پاتے ہی اپنا نظام بالائے طاق رکھ دیتے اسلامی یا قومی جھنڈا پھینک دیتے اور پھر اسی ستم گر اور فریب کار کے سامنے اطاعت وفرماں برداری کا سر جھکا دیتے اور اسلامی حکومت کے عظیم الشان امکان کو رد کردیتے؟

اب ان دونوں نظاموں اور اقتداروں کی نوعیت پر غور فرمایئے!

۱- انگریزوں نے ہندوستان پر دھوکے، فریب، آپس میں اختلاف پیدا کر کے، ایک کو دوسرے سے لڑا کے، غدار پیدا کر کے، سابق سے قائم تاریخی آئینی مغلیہ حکومت کی وفاداری اور فرماں برداری کا دم بھرنے کے باوجود ملک پر قبضہ کر لیا تھا، ان کے اس قبضے کے خلاف انیسویں صدی کے آغاز ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کے فتوی دارالحرب سے آزادی اور نجات کی تحریک موجود تھی اور ملک کے مفاد پرست جاگیردار، تعیش پسند امرا، خود غرض ملازم پیشہ، بیوروکریٹس اور مجبور عوام کے سوا ملک کے باشعور طبقے نے ایک دن کے لیے بھی انگریز کی حکومت کے جواز کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

۲- بزرگان دیوبند نے ۱۸۵۷ء کے عہد فساد اور بے آئین اور بے حکومت دور میں عوام کی درخواست و اصرار پر حکومت کی ذمہ داری قبول کی تھی جس میں کوئی جبر دھوکا یا فریب نہ تھا نہ کوئی ذاتی یا جماعتی غرض تھی اور نہ طاقت کا بے جا استعمال ہوا تھا۔

ان دو جماعتوں اور نظاموں میں اگر اول الذکر جماعت (انگریز) ملک کے عوام سے یہ توقع رکھتی تھی کہ چوں کہ اس نے حکومت پر قبضہ کر لیا ہے اس لیے اہل ملک ان کے فرمان بردار اور اطاعت گزار بن جائیں تو کیا دوسری جماعت بزرگان دیوبند ملک کے عوام سے یہ امید قائم کرنے میں حق بجانب نہ تھے کہ اس کے قائم کردہ نظام کی اطاعت اور وفاداری کی جائے؟

اب اگر پھر انگریزوں (ایسٹ انڈیا کمپنی) نے ملک پر قبضہ کر رکھا تھا اور عوام کو دوبارہ اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا تو کیا اس کا مقابلہ نہ کیا جاتا، اس کے نقش باطل کو مٹانے کی کوشش نہ کی جاتی اور پھر جب خود بھی اس کے شکنجے میں آ رہے تھے یا آ گئے تھے تو کیا اپنے بچاؤ کے لیے کوئی جتن نہ کرتے اور اپنے ہاتھوں پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیتے اور سولی پر لٹک جاتے؟ ''ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ'' پر عمل کرنے کا موقع وہ نہ تھا جب انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ کا آغاز کیا جا رہا تھا اس پر عمل کرنے کا موقع یہ تھا جب تحریک کی ناکامی کے بعد فدائیان دین وملت اور محبان قوم و وطن کو ظلم کی صلیب پر کھینچ دینے کے لیے عدالتوں کے قیام کا ناٹک رچایا جا رہا تھا۔ خطرات کو دعوت دیے بغیر کوئی جنگ نہ شروع کی جا سکتی ہے نہ جاری رکھی جا سکتی ہے اور نہ جیتی جا سکتی ہے اور ناکامی پر جنگ کے خاتمے کے بعد

جانوں کو بچائے بغیر نئی جنگ اور جدوجہد کے نئے دور کا آغاز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۸۵۷ء میں جب وہ جنگ کی آزمائش میں پڑنے سے پہلے تھانہ بھون میں سعی وعمل کا قدم اٹھانے کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے اور ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جب وہ اپنے رفقاء کے ساتھ دیوبند میں ایک مدرسۂ اسلامیہ کے قیام کا منصوبہ بنا رہے تھے تو ان دونوں اعمال میں کوئی فرق نہ تھا دونوں عمل اپنے اپنے وقت پر حالات کے تقاضوں کے مطابق نئی جنگ اور جدوجہد کے نئے دور کا آغاز تھے۔ اس نئے دور کا عازم اور فاتح مدرسۂ دیوبند کا محمود حسن نامی وہ پہلا طالب علم تھا جو شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوا۔

(۸)

ان عظیم بزرگوں نے جس طرح جنگ کے آغاز پر خطرات کو قبول کیا تھا' اسی طرح جنگ کے خاتمے کے بعد اپنے بچاؤ کی بھی پوری کوشش کی۔ یہ ان کی عزیمت اور شجاعت و مردانگی تھی کہ انھوں نے نہ صریح جھوٹ بولا اور نہ کسی وقوع کی ذمہ داری سے صاف انکار کیا۔ صاحب تذکرۃ الرشید ہی رقم طراز ہیں کہ جب پولیس سے حضرت قاسم نانوتوی کا سامنا ہوا اور ایک اہل کار نے پوچھا......

''مولوی محمد قاسم کہاں ہیں؟

تو آپ نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا ابھی تو یہاں تھے'' (ص ۷۹)

اور جب حضرت گنگوہی سے عدالت میں سوال کیا گیا کہ ''تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور فساد کیا؟

تو آپ نے جواب دیا، ہمارا کام فساد کا نہیں، نہ ہم مفسدوں کے ساتھی ہیں۔

پوچھا گیا تم نے سرکار کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے؟

آپ نے تسبیح نکال کر دکھائی اور فرمایا ہمارا ہتھیار تو یہ ہے!

حاکم نے دھمکی کے انداز میں کہا ہم تم کو سزا دیں گے۔

جواب میں فرمایا، کیا مضائقہ مگر تحقیق کر کے!'' (ص ۸۵)

یہ حکمت و تدبر اور بہادری اور مردانگی کی اعلیٰ مثالیں ہیں اور اصحابِ دعوتِ عزیمت کی

شان ہے۔ صاحبِ تذکرہ نے تو تمام حضرات کے کشف و کرامات بھی بیان فرمائے ہیں۔ میں ان کا منکر نہیں لیکن میرے اطمینان کے لیے ان اصحابِ عزائم کی سیرتِ حقہ ہی کافی ہے۔ میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی کرامت ان کا عقیدہ خواہ دینی خواہ سیاسی، استقامت و مردانگی اور حکمت و تدبر ہے اہل ہمم کی عظمت کا ثبوت خود ان کے عزایم ہیں ان کی عظمت منوانے کے لیے کسی خرق عادت کی ضرورت نہیں لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جن کے اطمینان قلب کے لیے خرق عادت ہی نہایت موثر عمل ہے۔

(۹)

گذشتہ سطروں میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بزرگان دیوبند نے جن حالات میں سعی و عمل کا قدم اٹھایا تھا، ان میں نہ تو وہ کسی کی وفاداری کے پابند تھے اور نہ کسی سے انھوں نے غداری کی تھی۔ اگر انگریزوں کے لیے دھوکے، فریب مغلیہ حکومت کی آئینی اور قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے اور عہدِ وفا باندھنے کے بعد اس سے غداری کر کے حکومت کا تختہ الٹنا اور اقتدار پر قبضہ جمانا جائز تھا اور انھیں ملک سے وفاداری کے مطالبے اور فرماں برداری کروانے کا حق تھا، تو اس سے ہزار درجے زیادہ حق اہلِ ہند کو اور بزرگان دیوبند کو اپنا نظام قایم کرنے اور اسے انگریزوں سے منوانے کا تھا اُن حضرات نے فساد نہیں پھیلایا تھا بلکہ انھوں نے تو فساد مٹانے بلکہ اس کی جڑ کاٹ دینے کی تدبیر کی تھی اور ایک قومی حکومت قائم کر کے اہل ملک کو اور مسلمانوں کو امیر کے بغیر ایک جاہلی اور غیر اسلامی زندگی سے نجات دلانے کی کوشش کی تھی کاش یہ کوشش کامیاب ہو جاتی!

پچھلے صفحات میں تذکرہ کے صفحہ ۷۹ سے ہم ایک عبارت نقل کر آئے ہیں جو بعض حضرات کے لیے غلط فہمی کے ابتلاء کا موجب ہوئی ہے ان نا آشنایان حقیقت نے اس عبارت میں سرکار کے لفظ سے انگریزی یا کمپنی کی حکومت مراد لی ہے جو اہل نظر تحریک اصلاح و جہاد یا تحریک مجاہدین کے مقاصد و اہداف سے واقف ہیں وہ ولی اللہی جماعت کی اس حنفی شاخ کے بارے میں کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ یہاں سرکار سے مراد کمپنی کی حکومت ہو سکتی ہے بلکہ یہاں پر سرکار سے مراد قطعی طور پر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب یا ان کی جماعت ہے نیز وہ

نظام حکومت ہے جس کی ذمہ داری لوگوں کے اصرار پر حضرت حاجی صاحب علیہ الرحمۃ نے قبول فرمائی تھی اس کا ثبوت بھی اس تحریر کے اگلے دو جملوں میں موجود ہے۔

پہلا جملہ: ''تا زیست خیر خواہی ہے۔''

دوسرا جملہ: ''ہاں! چند روز کی تفریق بین الاحباب مقدر تھی۔''

اگر ''سرکار'' سے مراد کمپنی کی حکومت لی جائے تو وہ حال میں اس کے دلی خیر خواہ تھے اور نہ انھوں نے بعد میں اس کی وفاداری کا کوئی عہد باندھا تھا یا ایسا کوئی کارنامہ انجام دیا تھا جس سے تا زیست ان کی خیر خواہی پر استدلال کیا جاسکے۔

دوسرے جملے میں حال کی دلی خیر خواہی اور بعد کی تا زیست خیر خواہی میں چند روز کی تفریق بیان کی ہے لیکن یہ تفریق بین الاحباب تھی نہ کہ انگریزوں اور مجاہدین اسلام و وطن کے مابین تھی اگر ایسا تھا تو اس کا کوئی قرینہ بھی ہونا چاہیے تھا جو یہاں ہرگز موجود نہیں۔

حقیقت واضح ہے کہ چند روز کی یہ تفریق بین الاحباب اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے وطن سے ہجرت کر جانے، حضرت گنگوہی کے گرفتار ہو جانے اور حضرت نانوتوی کے روپوش ہونے کی وجہ سے مقدر ہوئی تھی۔ تقریباً چھ ماہ (حضرت گنگوہی کی رہائی) کے بعد اس کا ایک بڑا سبب بھی دور ہو گیا تھا۔ حضرت نانوتوی نے بھی اپنی روپوشی ختم کر دی تھی، حجاز کے سفر میں کوئی امر مانع نہ تھا جہاں سب نے آگے پیچھے یہ سفر کیا، حج کا فرض بھی ادا کیا اور حضرت حاجی صاحب کی ملاقات وزیارت سے بھی فیض یاب ہوئے۔ یہ چند روزہ تفریق بین الاحباب تھی لیکن انگریزوں سے بزرگان دیوبند کی تفریق اول تو تفریق بین الاحباب نہ تھی نیز وہ چند روز کے بعد دور بھی نہ ہو گئی تھی بلکہ حالات وواقعات تو اس امر کے غماز ہیں کہ یہ تفریق روز بہ روز بڑھتی ہی گئی تھی تا آں کہ دیوبند برٹش استعمار کے مخالفین کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ افسوس کہ یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں۔

دوسرے اقتباس (ب) میں کہا گیا ہے کہ (حضرت امام گنگوہی) کا مفسد ہونا محض الزام اور بہتان ثابت ہوا۔ اس بیان میں کوئی پیچیدگی نہیں کہ مفسد کون تھے؟ ان کی نشان دہی اس مقابلے میں کی جاچکی ہے آپ ہرگز مفسد نہ تھے لیکن اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ''مفسد'' مجاہدین

اسلام اور جاں نثاران وطن کو کہا گیا ہے اور برٹش استعمار کے مخالفین اس سے مراد ہیں تو یہ سراسر ظلم ہے۔ ان بزرگانِ دین کا برٹش استعمار سے مقابلہ وجدال کوئی اتفاقی اور حادثاتی واقعہ نہ تھا۔ یہ ہر پہلو سے ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا اگر یہ فساد تھا تو پھر ہم کہیں گے کہ ہمیں اس پر فخر ہے اور ہم آزادی کی جس نعمت سے ۱۹۴۷ء میں بہرہ اندوز ہوئے ہیں یہ اسی ''فساد'' کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد تیسرا اقتباس (ج) سامنے آتا ہے اس میں خاص توجہ طلب یہ بیان ہے:

> ''شاملی کے واقعے کے بعد جب آپ (حضرت امام ربانی) کا وارنٹ نکل چکا تھا، گرفتار کروانے پر انعام بھی مقرر تھا اور آپ گنگوہ میں اپنے مکان پر ہونے کی بجائے رام پور میں حکیم ضیاء الدین کے ہاں روپوش تھے مگر آپ کوہ استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ میں حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے اسے اختیار ہے جو چاہے کرے اپنا تو بال برابر بھی فکر نہ تھا۔''
>
> (ایضاً ص ۸۰)

کیا واقعی اس عبارت میں ''سرکار'' سے مراد انگریزی یا کمپنی کی حکومت ہے؟ اسی کو اپنا مالک کہا جا رہا ہے؟ اسی کو اپنی جان کا اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ جو چاہے سو کرے؟ ''امام ربانی'' اور عالم حق کا مقام تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے کیا یہ سیرت کسی عام مسلمان کے بھی شایان شان ہے؟ یہ بیان ان بزرگ کے بارے میں ہے جن کے بارے میں لکھا ہے کہ کوہِ استقلال بنے ہوئے اللہ کے حکم پر راضی تھے، جنھیں امیر المومنین بنایا گیا تھا جو امیر الجہاد تھے، جن کا تعلق علمائے حق کے گروہ سے تھا، جو اصحابِ عزیمت اور اہل ہمم کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے جنھیں تذکرۃ الرشید کے مولف نے بالالتزام امام ربانی لکھا ہے اور بعض مقام پر اُنھیں اُن کے مرشد سے بھی فضائل میں بڑھا دیا گیا ہے۔ اگر واقعی ان کی وفاداری اور اطاعت گذاری انگریزی حکومت کے لیے تھی اور وہی سرکار ان کی جان کی مالک ومختار تھی اور اسی پر انصاف کے لیے اعتماد تھا تو پھر ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر خاموش ہو جائیں۔

ہمیں سخت افسوس ہے کہ بعض لوگ اپنے طور پر ''سرکار'' سے انگریزی حکومت مراد لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حضرت میرٹھی کی تحریر کا مفاد اور ان کی مراد یہی تھی! میں نہیں سمجھتا کہ حضرت سے نسبت ارادت واخلاص رکھنے والا کوئی سلیم الطبع اور علمائے حق وائمہ ربانیین کے مقام سے آشنا اس تحریر کا یہ مفہوم مراد لے گا۔

اس عبارت پر مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ اس میں جو بیان ہوا ہے کہ ''وہ خدا کے حکم پر راضی تھے'' تو یہاں سرکار سے مراد بھی اسی خدا کی سرکار ہے' اسی کی فرماں برداری' اسی کی وفاداری' اسی پر اعتماد اور دل و جان پر اس کے قبضہ وملکیت کا اعتراف اور بال بیکا نہ ہونے کا یقین اور انجام سے بے خوفی اور مستقبل کی طرف سے اطمینان ہے تو یہ صرف لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین کی بشارت کا نتیجہ تھا۔ اس کے باوجود اگر کسی کا قلب مطمئن نہیں' تاریخ کے ذوق سلیم سے اور صوفیہ ومشائخ کے مقام سے محض ناآشنا ہے تو اسے اپنی عقل ہی کا نہیں ایمان کی لذت سے محرومی کا بھی ماتم کرنا چاہیے۔

صاحبِ تذکرہ کا ایک بیان اور ہے جس کے بعض جملوں سے اشتباہ پیدا ہوا۔ فرماتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ونیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما دلیر جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہوگیا۔'' (تذکرۃ الرشید،ص ۷۵،۷۴)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں بھی کوئی وجہ اشتباہ نظر نہیں آتی! ذرا سا غور کیجیے تو پردہ ذہن سے ہٹ جائے گا اور صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ سرکار کون سی تھی جس کے مخالفوں سے حضرت گنگوہی اور ان کے رفقاء کی جنگ ہوئی تھی؟ اور وہ ''سرکار'' کون سی تھی جس پر جاں نثاری کے لیے یہ جتھا تیار ہو گیا تھا؟ اور وہ ''بندوقچی'' کون تھے جن سے حضرت امام ربانی

رفیق جانی، طبیب روحانی اور حافظ ضامن کا مقابلہ ہوا تھا اور جس کی گولی سے حضرت ضامن نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ جیسا کہ اس تحریر کے اگلے حصے میں یہ بیان مسلسل بلا فصل آیا ہے)؟

حقیقت یہ ہے کہ سرکار کے جن مخالفوں سے جنگ ہوئی تھی اور جن بندوقچیوں سے مقابلہ ہوا تھا وہ اگر چہ مسلمان تھے لیکن انگریزوں کے ملازم اور انھیں کے جان نثار تھے اور حضرت گنگوہی اور ان کے بزرگ اور رفیقوں کے دشمن تھے اور سرسید کے بقول انھوں نے انگریزوں کا حق تک خوب خوب ادا کیا تھا اگر چہ انھوں نے انگریزوں پر اپنی جان نثار کردی تھی لیکن ان کی اولاد ان کی جاں نثاری کے صلے سے محروم نہ رہی تھی اور وہ ''سرکار'' جس پر جاں نثاری کے لیے حضرت گنگوہی اور ان کے رفقاء کا جتھا تیار ہوا تھا وہ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی۔

(۱۰)

مجھے یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ مشہور مورخ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے ''اپنی سرکار'' کا یہی مطلب لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مبادا'' سرکار کے مخالف باغیوں کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو، یہاں ''سرکار'' سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرف دار ہو کر آئے تھے لیکن سرکار کا لفظ ایسے طریق پر استعمال کیا کہ بہ ظاہر اس سے حکومت مراد لی جائے۔ کتاب تذکرۃ الرشید جس زمانے میں اور جن حالات میں مرتب ہوئی تھی انگریزوں کا اقتدار اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا اور نازک واقعات کی ترتیب میں مرموز طریق و اسلوب سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی؟'' (۱۸۵۷ء کے مجاہد: لاہور، کتاب منزل، ۱۹۵۷ء)

مولانا سید محمد میاں نے بھی بر بنائے سنگینی حالات مولانا میرٹھی کو صاف صاف حالات بیان کرنے سے معذور قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تذکرۃ الرشید کی تصنیف و ترتیب کا وہ وقت تھا جب برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خط استوا پر بیٹھا تھا اور نہ صرف زبان اور قلم بلکہ لوگوں کے ضمیر بھی اس کی عظمت و ہیبت سے متاثر تھے تو آپ کو بھی اپنی تحریر میں وقت کے تقاضے کی تعمیل کرنی پڑی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بعض چیزوں کے اعتراف و اقرار کے لیے بھی انکار کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا۔

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھتے وقت یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ۱۸۵۷ء اور اس کے نتائج و اثرات مابعد کا ذکر ہی نہ کریں۔ البتہ تقاضائے وقت یا اپنے طبعی میلان کے باعث آپ نے اپنے بزرگوں کو الزام سے بچانے کی کوشش زیادہ سے زیادہ کی ہے۔'' (علمائے ہند کا شان دار ماضی: کراچی، مکتبہ رشیدیہ، ص ۵۳-۲۵۲)

(۳) مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے بھی صاحبِ تذکرہ کے بیان کو توریہ قرار دیا ہے۔ (سوانح قاسمی (حصہ دوم): دیو بند، دفتر دار العلوم)

(۴) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہوا تھا کہ تذکرۃ الرشید کے بعض بیانات سے تو شاملی کے معرکے میں بزرگان دیو بند کی شرکت کی نفی کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث کے بیان کا بھی یہی مفہوم ہے کہ مولف موصوف نے جب یہ کتاب تالیف فرمائی تھی تو متعدد خطرات ان کے سامنے تھے۔ حضرت شیخ الحدیث کے مطابق مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے سامنے تین راہیں تھیں۔

۱- شاملی کے معرکے میں ان بزرگوں کی شرکت، جہاد و قتال میں حصہ اور نہایت عزیمت و استقامت کے واقعات کو یک سر نظر انداز کر دیا جائے لیکن یہ راہ اختیار کرنی نہ صرف ان حضرات کے ساتھ بلکہ تاریخ کے ساتھ بھی ناانصافی ہوتی مؤلف مرحوم نے اسے پسند نہیں کیا۔

۲- دوسری راہ یہ تھی کہ تاریخ وسوانح کے واضح اور راست اسلوب میں حالات بیان کر دیے جاتے، ان بزرگوں کے شوق جہاد وقتال پر روشنی ڈالی جاتی، ان کی عزیمت واستقامت کی تحسین کی جاتی حکام وقت کی پریشانی وسراسیمگی بیان کی جاتی اور اس پر خوشی کا اظہار کیا جاتا، اس صورت میں مؤلف مرحوم کے لیے مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں اور کاروبار کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا، کتاب ضبط ہوسکتی تھی، قید و بند کا مرحلہ پیش آ سکتا تھا۔ بعض دوسرے بزرگوں اور ان اصحاب عزیمت کے متعلقین اور پس ماندگان کے لیے بھی کوئی آزمائش پیدا ہوسکتی تھی۔ مولف مرحوم کو یہ بھی گوارانہ تھا۔

۳- تیسری راہ یہ تھی کہ سب کچھ بیان کر دیا جائے لیکن اس انداز میں کہ یہ باتیں ان حضرات کے مخالفین اور مفسدین نے اڑائی ہیں اور یہ کہ تحریر میں ذو معنے الفاظ اور جملے استعمال کیے جائیں۔ مثلاً:

''آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے اور تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے'' یا ''یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔''

ان جملوں میں اپنی سرکار یا اپنی مہربان سرکار کے الفاظ کو دوسرے فریق کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور پھر اس تعبیر کے مطابق پوری عبارت کا مفہوم ومفاد برعکس ہو جائے گا۔

لیکن اگر ذرا بھی غور سے کام لیا جائے تو اشتباہ دور ہو جاتا ہے اور حقیقت سامنے آجاتی ہے اور ایک مفہوم کے سوا دوسرا مفہوم ذہن میں جگہ نہیں پا سکتا۔

یہ تو حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے ایک استفسار کے جواب میں ''تذکرۃ الرشید'' کے بیان کے توضیح اور اسلوب تحریر کی خوبی میں فرمایا ہے۔ یہ حضرت کا ایک مکتوب گرامی مورخہ کیم

ذوالحجہ ۱۳۹۸ھ مطابق ۲ نومبر ۱۹۷۸ء میں مولانا عاشق الٰہی بلند شہری کے نام ہے۔ حضرت نے تو اس سے پچاس برس پہلے ۱۳۴۹ھ مطابق ۳۱-۱۹۳۰ء میں ''رسالہ مشائخ چشتیہ'' میں تذکرۃ الرشید پر تبصرہ کی نظر ڈالے بغیر اس کے بیان و اسلوب کی پیچیدگی کو دور فرمادیا تھا اور وہی بیان جو تذکرہ میں پیچیدہ اور ذو معنی ہوکر اشتباہ کا باعث بنا تھا ایسا سادہ اور صاف و سلیس ہوا کہ اشتباہ نام کو باقی نہ رہا حضرت شیخ الحدیث نے حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے تذکرے میں نہایت تفصیل کے ساتھ شاملی کے واقعے اور اس کے متعلقات پر روشنی ڈالی ہیں۔

(مقدمہ امداد السلوک از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا' لاہور، ادارہ اسلامیات، ص ۴۸۹)

امداد السلوک پر حضرت شیخ الحدیث کے قلم سے جو مقدمہ یادگار ہے اس کا ایک حصہ (صفحہ ۹ تا ۴۱) ''رسالہ مشائخ چشت'' سے ماخوذ ہے۔ اس میں حضرت ضامن شہید کا ذکر ہے۔ (صفحہ ۲۴ تا ۳۶) اور معرکہء شاملی میں ان کی شرکت کی بعض تفصیلات بھی ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے حالات میں صرف اشارہ ہے۔ حضرت شیخ الحدیث کا یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ حضرت کی ایک تالیف ''تاریخ مشائخ چشت'' (مرتبہ مولوی محمد شاہد سہارن پوری، کراچی' مجلس نشریاتِ اسلام، ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) نظر سے گزری ہے۔ اس میں مہاجر مکی اور حافظ ضامن شہید کا مختصراً معرکہء شاملی سے شرکت اور شہادت کا ذکر آیا ہے۔

واقعہ شاملی اور معاصر تحریرات، ایک مطالعہ

(۱)

مونسِ مہجوران

از

حکیم ضیاء الدین

۱۸۵۷ء کے حوادث کے بعد جو کتاب سب سے پہلے معرض تحریر میں آئی وہ حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے تذکرے میں حکیم ضیاء الدین رام پوری کی تصنیف ''مونسِ مہجوراں'' ہے۔ یہ حکیم ضیاء الدین رام پور منیہاراں کے وہی بزرگ ہیں جو حضرت ضامن شہید کے مرید بااخلاص و عاشق زار تھے۔ شاملی میں ناکامی کے بعد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کچھ عرصہ انھیں کے گھر روپوش رہے تھے اور وہیں سے گرفتار ہوئے تھے۔

''مونس مہجوراں'' ۴؍ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ مطابق ۵؍ اگست ۱۸۶۷ء کو پایہء تکمیل کو پہنچا تھا۔ یہ تذکرہ بزرگان دین کے تذکروں کے عام اسلوب کے مطابق حضرت محمد ضامن کے مقامات، حضرت کی شہادت اور ان سے بچھڑنے اور ان کے ہجر و فراق کے بیان میں ہے۔ اگرچہ اس میں معرکہء شاملی کے تاریخی واقعے کی تفصیل تو نہیں ہے لیکن حضرت ضامن کی صحیح تاریخ شہادت اور شہادت کا تذکرہ ہے نیز اس وقت کے وحشت انگیز حالات پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ اس کی تالیف کا محرک بھی حضرت حافظ کی شہادت کا دردانگیز سانحہ اور حضرت کے ہجر و فراق کے الم سے نجات کی تلاش ہے۔ اس وقت کے حالات اور حضرت حافظ صاحب کی شہادت کے واقعے کے بارے میں مولف لکھتے ہیں:

> ''ناگاہ گردش ایام اور شامت افعال اس شکستہ حال سے یہ صورت پیش آئی کہ دفعتاً جہان میں ایک شور پیدا ہوا۔ ہنگامہ قتل و غارت کا چار طرف سے ایسا گرم ہوا کہ شاید کبھی نہ ہوا ہوگا۔ جو لوگ دین دار اور جری

تھے غیرت وحمیت اسلامی سے اکثر شہید ہو کر سوئے دارالبقاء رحلت فرما ہوئے یا خانہ ویران ہو کر در بدر راہی، اس ملک کا حال دیکھ کر بیت اللہ شریف یا کسی اور دارالسلام کو تشریف لے گئے۔ اب ہندوستان میں گویا دنیا پلٹ گئی، دین دنیا کی اچھی بات گم ہوگئی۔ کیا عرض کروں یہاں فسانۂ غیر مقصود ہے۔ اپنا درد وغم اور قصۂ حسرت والم اور ہے۔ ہر کوئی اپنی بلا میں مبتلا ہے۔ آتش مفارقت میں جی جلائے دیتا ہے، دلِ مہجور گھبراتا ہے، سوزشِ دروں کو بیان کیا چاہتا ہے اور کوئی ذکر خوش نہیں آتا۔ حاصل کلام اس ہنگامے میں جلال کبریائی کو جوش وخروش تھا اور مدہوشان شیونِ الٰہی کو بھی ایک ولولہ اور شوق تھا' چناں چہ حضرت مرشدی رحمتہ اللہ علیہ ونوراللہ مرقدہ وقدس سرہ نے بھی کمر ہمت چست باندھ کر امر حق پر جان و مال کو قربان کیا اور ذوق وشوقِ الٰہی میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا تردد نہ ہوا اور تمنائے شربت شہادت اور جام کوثر میں ہماری بے کسی کا بھی کچھ خیال نہ فرمایا۔ سبحان اللہ! کیا ہمت مردانہ اور مددِ خدا کا تماشہ دکھا کر مردانہ اور مشتاقانہ بہ تاریخ چوبیسویں محرم الحرام بارہ سو چوہتر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بر سر معرکہ جام شہادت نوش فرمایا۔ واہ! کیا خوب داد لے گئے اور داغِ حسرت دے گئے۔'' (مونسِ مہجوراں مخطوطے کا صفحہ ۱۵-۱۴) بہ حوالہ تذکرہ سردار شہیداں: ص ۸۴-۸۳' مکہ معظمہ' مدرسہ صولتیہ، ۱۹۸۲ء)

مونسِ مہجوراں میں حافظ ضامن کی شہادت کے ذکر کے علاوہ اٹھارھویں اور انیسویں نکتے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ضامن شہید کو پیش آنے والے واقعات کا اشارہ مل گیا تھا اور وہ اس کے مشتاق تھے۔ انھیں حوریں نظر آنے لگی تھیں۔ اس تقریب کے لیے انھوں نے نئی پوشاک بنوائی تھی، نئی نعلین خریدی تھیں، نئی دستار تیار کرائی تھی اور یوم شہادت کے انتظار کے وہ پورے شوق کے ساتھ منتظر تھے لیکن نہایت اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مونسِ مہجوراں

کے مولف اس معرکے میں اور حافظ ضامن کے جنازے میں خود شریک تھے اس لیے یہ واقعہ ان کا مشاہدہ ہی نہیں ان کی آپ بیتی کا بھی حصہ ہے۔ مولف مرحوم اٹھارھویں اور انیسویں نکتے میں فرماتے ہیں:

> ''نکتہ اٹھارھواں: ایام غدر میں جس سال میں حضرت پیرومرشد رحمتہ اللہ علیہ شہید ہوئے، یوں فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو حوریں پیالے لیے ہوئے مکان کی منڈیروں پر کھڑی ہیں، جس کا جی چاہے لے لے۔ اور برخلاف اور دنوں کے ان ایام میں حضرت پیرومرشد رحمتہ اللہ علیہ ولولہء محبتِ الٰہی میں ایسے مست اور مخمور ہوئے تھے کہ اکثر ذکرِ شہادت برزبان تھا اور بہت سی باتیں اسرار کی کہہ اٹھتے تھے۔ ستر حال کا چنداں لحاظ نہ رہا تھا اور جو کوئی بیعت ہوتا تھا برخلافِ عادت بلا تامل بیعت کر لیتے تھے۔
>
> اور جس وقت ارادہ معرکے کا کیا، غسل فرما کر سب لباس نیا زیب بدن شریف فرمایا اور یہ لباس بہت روز پیشتر سے رکھ چھوڑا تھا حال آں کہ اس کے بعد کے کپڑے بنائے ہوئے استعمال فرمائے اور وہ لباس اس کام آیا اور نعلین شریف کچھ بوسیدہ نہ تھی مگر وہ بھی نئی منگا کر زیب پا فرمائی اور یہاں تک سامان لباس وغیرہ کا اہتمام کیا تھا کہ خوشبو ملی اور سرمہ لگایا دستار پیچ دار، سپاہیانہ وضع، شمشیر لے کر شربت دیدار کی تمنا میں علمِ جواں مردی اٹھا کر مردانہ وار مشتاقانہ برسر معرکہ جاں بحق تسلیم فرمائی۔ جیسا کسی نے کہا ہے:
>
> در کوے تو عاشقاں جناں جاں بدہند
> کہ آں جا ملک الموت نہ گنجد ہرگز
>
> اور جس وقت نعش مبارک کو لینے آئے تھے جسم شریف سے عطر خس اور گل کی خوشبو آتی تھی اس نالایق کا دماغ بھی اس وقت اس خوشبو سے

مشرف اور معطر ہوا اور جناب حاجی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس وقت تصدیق فرمائی، افسوس وہ نور مجسم اور جسم معطر یوں سبک سیر ہوا اور میں یہاں پا بہ گل رہا بہ قول آں کہ......

دستگیری نے دیا ہاے ارادت در گل

آشنائی نے و دریائے غمت بے پایاں

قصہ درد والم اور فسانہء مفارقت ہم دم سینے میں ہر دم موجزن ہے۔ دل مفارقت زدہ بدوں بیان رہ نہیں سکتا۔ مگر یہاں موقع تحریر اس تقریر کا نہیں اب بجز خاموشی کے کچھ بن نہیں آتا ورنہ یہ جی چاہتا رہتا ہے کہ ہر وقت ذکر مفارقت اور عنایت حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ زبان سے جاری رہے یا یہ قسمت تو کہاں مگر حق تعالیٰ حشر میں زمرہ کفش برداران حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی' میں شمار فرماتے تو غنیمت ہے اور بس باقی ہوس!

نکتہ انیسواں: حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ نے ہفتہ عشرہ پہلے شہید ہونے سے اس نالائق کو ایک عنایت نامہ ارقام فرمایا تھا بعینہٖ ترجمہ اس کا درج کرتا ہوں ترجمہ رقعہ والا:

برادر دینی حکیم محمد ضیاء الدین سلمہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم

واضح رائے ہو کہ تیری تحریر کے موافق دل میرا متمنی ملاقات ہے۔ لازم کہ بہ غور مطالعہ اس خط کے، اپنے تئیں یہاں پہنچاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے عاقل کو اشارہ کافی ہے۔ باقی حال بر وقت بیان کیا جائے گا۔ والسلام

اس تحریر سے ہی صاف ثابت ہے کہ آپ کو اپنی شہادت کا حال معلوم ہو گیا تھا اور بعض باتیں بہ مقتضائے وقت لکھنے میں مناسب نہیں لاچار قلم انداز کی گئیں۔" (مونس مہجوراں: ص ۴۹-۴۸' مشمولہ سردارِ شہیداں، صفحہ ۹-۱۰۷)

یہ بات جو میں نے عرض کی ہے کہ حکیم ضیاء الدین رام پوری مؤلف مونس مہجوراں اس معرکے میں اور حضرت ضامن کے جنازے میں شریک تھے اس کا یقین مجھے اس لیے ہے......

۱- حضرت ضامن شہید نے اپنے مرید با اخلاص کو ہفتہ عشرہ پہلے ہی خط لکھا تھا کہ ملاقات کے لیے جلد آؤ۔

''ایسا نہ ہو کہ توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے۔''

۲- انھوں نے معرکہ شاملی کی صبح کو اپنے پیر و مرشد کی تیاری کا جو حال بیان کیا ہے اس کے اسلوب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنا مشاہدہ بیان کر رہے ہیں نہ کہ زبان غیر سے سنا ہوا واقعہ نقل کر رہے ہیں۔

۳- اور ان کا یہ ارشاد کہ ''جس وقت نعش مبارک کو لینے آئے تھے جسم شریف سے عطرِ خس اور گل کی خوشبو آتی تھی اس نالائق کا دماغ بھی اس وقت اس خوشبو سے مشرف اور معطر ہوا۔''

اس بیان کے بعد جہاد اور جنازے میں مؤلف ''مونس مہجوراں'' کی شرکت میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ اور حکیم صاحب کا یہ ارشاد پڑھ کر تو دل تڑپ اٹھا۔

''اور بعض باتیں بہ متقضائے وقت لکھنے میں مناسب نہیں لاچار قلم انداز کی گئیں۔''

کاش! حکیم صاحب یہ باتیں بھی لکھ کر اپنی یادگار چھوڑ جاتے تو تاریخ کا کتنا عظیم الشان سرمایہ ہمارے ہاتھ آتا۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں بھی ان کے ذاتی مشاہدے اور آپ بیتی کا ایک حصہ ہوتیں۔

جہاں تک حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے حالات کا علم ہوا ہے وہ ایک بڑے اللہ والے، مقبول بارگاہ الٰہی، مستجاب الدعوات، صاحب کشف و کرامات، مجلسی اور خوش باش، صاحب حال اور ذوق آشنا بزرگ تھے وہ بلا شبہ صوفیہ و مشائخ کی اعلیٰ صفات سے متصف تھے روایتی انداز کے وعظ و ارشاد کی طرف انھیں توجہ نہ تھی۔ البتہ اپنے مریدین پر توجہ اور تربیت و تلقین کے ذریعے تعلیم و تذکیر فرماتے تھے۔

مونس مہجوراں نہایت قیمتی تاریخی دستاویز ہے۔ یہ دستاویز اپنے مضامین تاریخی و سیاسی

کے علاوہ چند ادبی مشمولات کی وجہ سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے چند مشمولات یہ ہیں:

۱-رسالہ مونس مہجوراں کے آغاز ہی میں حضرت مولانا یعقوب نانوتوی بن مولانا مملوک العلی وخلیفہ اعلیٰ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے قلم سے حضرت محمد ضامن شہید کے بیان سراپا میں ''حلیہ شریف'' کے عنوان سے ایک سونو اشعار کی نظم ہے جس میں حضرت کے شمائل کو نہایت خوبی اور فن کاری سے بیان کیا ہے یہ ایک نادر نظم ہے۔ اس میں شاعر نے انسانی اعضاء و جوارح کے ظاہری حسن اور خوبیوں کے بیان کے ساتھ تصوف کی اصطلاحات اور استعارات کے ذریعے ان کے معنوی محاسن کو بیان فرمایا ہے اس کے مطالعے سے شاعر کے حسن بیان اور قدرت کلام کے علاوہ سلوک وتصوف سے ان کے خاص ذوق اور مقام کا پتا چلتا ہے۔

یہ نظم مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے بیاض یعقوبی میں موجود نہیں۔ مولانا محمد نسیم فریدی امروہوی نے مونسِ مہجوراں پر اپنے مضمون مطبوعہ ماہنامہ تذکرہ دیوبند بابت ماہ نومبر ۱۹۶۱ء میں اس کے منتخب ستائیس شعر نقل کیے ہیں۔ اور یہی اشعار مولانا محمد انوار الحسن شیر کوٹی نے اپنی تالیف ''سیرت یعقوب ومملوک'' میں پیش کر دیے ہیں۔

۲-ایک یادگار نظم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا مرثیہ ہے جو حضرت قاسم العلوم نے حافظ محمد ضامن کی شہادت کے واقعے سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ یہ یادگار مرثیہ پینسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ بعد میں یہ مرثیہ قصائد قاسمی میں شامل کر لیا گیا ہے لیکن قصائد میں ذیل کا ایک شعر چھوٹ گیا ہے:

قدم عشق بیاباں ان دنوں مجھ کو ضروری ہے
عداوت ہاتھ تجھ کو چاہیے جیب وگریباں سے

شاعر نے یہ مرثیہ مولف مونس مہجوراں کے لیے انھی کے نام سے لکھ کر انھیں دے دیا تھا لیکن مولف مرحوم نے کمال اخلاص سے حضرت شاعر کے شکریے کے ساتھ انھی کے نام سے رسالے میں شامل کیا ہے۔

۳-''تاریخ شہادت حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ..... از نتائج طبع عزیزی محمد علاء

الدین برادر طریقی و حقیقی ایں نابکار (حکیم ضیاء الدین) عفی عنہ اس قطعے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صرف تاریخ شہادت ہے بلکہ دن، وقت اور مقامِ مزار کی صراحت بھی ہے:

تاریخ شہادت	:	بست و چہارم از محرم
وقت	:	شروع ظہر
یوم	:	دوشنبہ
مزار	:	قصبہ تھانہ بھون

۴- قطعہ ء تاریخ شہادت از افکار طبع مولوی عبدالسمیع بیدل مرید مخلص حضرت حاجی امداد اللہ صاحب۔

اس قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معرکہ نصاریٰ کے ساتھ پیش آیا تھا چند شعر یہ ہیں:

"ہوئے شہید مگر اک تماشا دکھلا کر — لہو لہان کیا دشمنوں کو اک دم میں
نہ چھوڑی نام کو گردن کہیں نصاریٰ کی — گلو بریدہ ہے سکہ بھی ان کا درہم میں
جو مارے تیر تو لگتے ہی جالیا گوشہ — ہزاروں کافر بدکیش نے جہنم میں
اسی قلق میں ہوئی ہے زمیں کی رنگت زرد — سیاہ پوش فلک ہے انھی کے ماتم میں

جو پوچھی سن شہادت کہا فلک نے ہائے
ہوئے شہید وہ شاہ جری محرم میں"

۱۲۷۴ھ

بیدل کے دو شعر قطعہ ء فارسی میں یادگار ہیں......

۵- قطعہ ء تاریخ شہادت از میاں عبدالغفور

میاں صاحب کے قطعے کا صرف ایک شعر نقل ہوا ہے۔

۶- گیارہ اشعار کا ایک قطعہ ملا زین العابدین عابد پشاوری کے قلم سے یادگار ہے۔ اس کے مطالعے سے بھی شہادت کا دن مہینہ تاریخ اور وقت معلوم ہو جاتا ہے۔

"یوم الاثنین (دوشبہ) محرم ۲۴، ظہر

۷- سات اشعار کا ایک قطعہ تاریخ شہادت "افکار طبع برادر طریقی عبدالرحمٰن رام پوری"

شامل ہے۔ ''برادر طریقی'' کی نسبت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی حضرت ضامن شہید سے سلسلہء ارادت میں منسلک تھے انھی مرحوم کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حکیم ضیاء الدین نے ۴ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ مطابق ۵/اگست ۱۸۶۷ء کو مکمل کیا تھا۔

''حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب سلمہ اللہ تعالی بہ تاریخ چہارم ماہ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تمام شد۔''

(۸) رسالے کا سال اتمام ہی اس کی نقل وتحریر کا سال بھی ہے یہ سعادت مولوی مظہر الدین رام پوری کے حصے میں آئی انھوں نے تیرہ اشعار کا ایک قطعہ لکھا اور اس کے آخری شعر سے نقل تحریر کی تاریخ نکالی ہے:

حضور سے جو ہوئی مرحمت تھی مجھ کو کتاب
میں نقل اس کی سے آج بافراغ ہوا

۱۲۸۴ھ

مونس مہجوراں کے مخطوطے کی ایک نقل اعلی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں مکہ مکرمہ بھیجی گئی تھی اور ایک نقل ان کے خاندان میں رام پور منیہاراں میں رہی تھی۔ اب اس کا تو کوئی پتا نہیں لیکن اس کا ایک نسخہ مدرسہء صولتیہ (مکہء معظمہ) کے کتب خانے میں ہے شاید یہ وہ نسخہ ہو جو حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ رسالے کی رسید وتقریظ میں حضرت کا ایک خط بھی یادگار ہے:

خطاب بہ حکیم صاحب!

رسالہ کہ در حالات حضرت حافظ صاحب رحمتہ اللہ علیہ آید رسید از مطالب اش بسیار خوش شدم از بر حرفش بوے محبت پیراں می آید (امداد المشتاق، صفحہ ۲۸۱)

یہ بہتر (۷۲) صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کے ایک مضمون مطبوعہ ماہنامہ تذکرہ دیو بند بابت ماہ نومبر ۱۹۶۱ء سے اس کی شہرت عام ہوئی۔ ۱۹۸۲ء میں مولانا امداد صابری نے اسے مرتب کر کے محمد حشیم صاحب نائب مہتمم مدرسہء صولتیہ مکہ مکرمہ (سعودی عربیہ) کی جانب سے چھپوا دیا تھا۔ حضرت حافظ محمد ضامن شہید اور واقعہ شاملی کے

مختصر حالات مختلف مآخذ سے اخذ کر کے نیز حکیم محمد ضیاء الدین مولف رسالہ کے بارے میں معلومات کا اضافہ کر دیا تھا۔

مولف رسالہ حکیم ضیاء الدین رام پور منیہاراں ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے حضرت حافظ ضامن شہید کے مرید وخلیفہ تھے اور بعد وفات حضرت حافظ صاحب امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے نسبت ارادت قائم کرلی تھی۔ حضرت نے انھیں اپنے حلقہء خلفاء میں بھی شامل کرلیا تھا وہ حلقہ دارالعلوم دیوبند کی ایک معروف شخصیت تھے۔ ۱۳۰۵ھ سے ۱۳۱۶ھ تک تقریباً سات برس دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوری کے رکن رہے تھے۔ ۲۸ر رمضان المبارک ۱۳۱۲ھ کو مطابق ۲۵ ر مارچ ۱۸۹۵ء کو حکیم صاحب نے انتقال فرمایا۔

(۲)

سوانح عمری......مولانا محمد قاسمؒ

از مولانا محمد یعقوب نانوتوی

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا رسالہ لطیفہ و نافعہ ''سوانح عمری......مولانا محمد قاسمؒ'' ۱۸۵۷ء کے بعض واقعات اور حضرت مولانا محمد قاسم کے سوانح میں پہلا رسالہ ہے، جو حضرت کے انتقال ۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء کے فوراً بعد تحریر کیا گیا اور اسی سال زیور طبع سے آراستہ اور شائع بھی ہو گیا تھا۔ مناسب ہوگا کہ پہلے اس کے بیان پر ایک نظر ڈال لی جائے، اس کے بعد اس کی اہمیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کی روشنی میں تذکرۃ الرشید کے بعض مباحث پر غور کیا جاوے۔

مولف سوانح لکھتے ہیں:

(۱). ''جب احقر بنارس سے وطن کی طرف پہنچا اتفاق نانوتہ جانے کا نہ ہوا دیو بند میں اہل عیال چھوڑ کر رڑکی چلا گیا وہاں کام نوکری کا کرنے لگا۔ اتفاق گھر جانے کا نہ ہوا۔ مولوی صاحب گھر تھے میں نے عرض کر بھیجا کہ ملنے کو جی چاہتا ہے اور مجھے فرصت نہیں۔ خود پیادہ پا دو منزلہ طے کر کے احقر کے ملنے کو تشریف لائے اور ہمیشہ جب تک قوت تھی کبھی سواری کی طرف رخ نہ کیا۔''

(۲) اسی عرصے میں غدر ہو گیا بعد رمضان احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے اس وقت راہ چلنا بدوں ہتھیار اور سامان دشوار تھا۔

جب احقر وطن پہنچا چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔

اس زمانے میں ہمارے بھائی ہم عمر اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے۔

ایک دن آپ مسجد میں سے آئے کہ ہم گولیاں لگا رہے تھے اور نشانے کی جاے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا اور اس کے گرد ایک دایرہ کھینچا تھا قریب سے بندوق لگاتے تھے گولیاں مٹی کی

تھیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بندوق کیوں کر لگاتے ہیں مجھے بھی دکھلاؤ؟ کسی نے ایک فائر کیا اور قاعدۂ نشانہ کا ذکر کیا۔ تب بندوق ہاتھ میں لے کر فائر کیا۔ گولی صاف نشانے پر لگی اور وہ سب مشاق کتنی دیر سے لگا رہے تھے دائرے میں لگ جانے کو نشانے پر پہنچانا جانتے تھے اور یہ بات اتفاقی نہ تھی اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادھ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ تھی، نہ ہوئی، تیراندازوں کو دیکھا کہ یہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں۔''

(۳)''حاصل یہ ہے کہ اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے نہ دیکھا۔

خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا، جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں۔ مگر مولوی صاحب اپنے معمول کے کام بدستور انجام دیتے تھے۔''

(۴)''چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلے کی آ گئی۔ اللہ رے! مولوی صاحب ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ!''

(۵)''ایک بار گولی چل رہی تھی یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا کہ سر میں گولی لگی ہے عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر!''

(۶) انھی دنوں میں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے سنبھے سے ایک موچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا اور خدا جانے گولی کہاں گئی اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سنبھ بھی بس تھا مگر حفاظت الٰہی بر سر تھی کچھ اثر نہ ہوا۔''

(۷)''اس زخم کی خبر اجمالی بعض دشمنوں نے جو سنی تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون میں فساد میں شریک تھے حالاں کہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے ملک و مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی کہیں کے ڈپٹی یا صدر الصدور ہوتے۔''

(۸)''اس لیے حاجت روپوشی کی ہوئی حضرت حاجی صاحب بھی ایسے ہی باعث سے روپوش ہو گئے تھے۔ ایام روپوشی میں ایک روز دیوبند تھے۔ زنانہ مکان کے کوٹھے پر مردوں

میں سے کوئی تھا نہیں۔ زینے میں آ کر فرمایا پردہ کرلو میں باہر جاتا ہوں۔ عورتوں سے رُک نہ سکے، باہر چلے گئے، بعضے مرد بازار میں تھے ان کو اطلاع کی، وہ اتنے میں مکان پر پہنچے، دوڑ سرکاری آدمیوں کی پہنچ گئی۔ انھوں نے آ کر تلاشی لی ہر چند بہ ظاہر مولوی صاحب کی تلاش نہ تھی مگر پھر خوف کی جگہ تھی۔ اس کے بعد مسجد میں رہتے اور پھر کسی نے تعرض نہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چند بار بچایا۔''

(۹) ''اس زمانے کی کیفیات عجیب وغریب گزری ہیں، لکھنا ان کا طول ہے، اسی وقت میں دیوبند اور املیا وغیرہ مختلف جاے پر متفرق اوقات میں رہے۔ بوڑیہ، گمتھلہ، لاڈوہ، پنج لاسہ، جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے۔''

(۱۰) ''آخر حاجی صاحب عرب کو روانہ ہو گئے۔''

(۱۱) ''احقر کو بعد ان کے یہی سوجھی کہ تو بھی چل۔ مولانا کی روپوشی محض عزیز واقارب کے کہنے سے تھی، ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔ مولانا نے بھی ارادہ کیا۔ اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بہ خوشی اجازت دے دی۔'' (سوانح عمری......ص ۱۳-۱۲)

یہ رسالہ (سوانح عمری...... مولانا محمد قاسمؒ) مولف ''تذکرۃ الرشید'' کی پیدائش سے ایک سال پہلے اور ان کی تالیف (تذکرۃ الرشید کی اشاعت سے تقریباً انتیس برس پہلے شائع ہوا تھا اس کی اہمیت کے کئی پہلو ہیں:

(الف) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے جو حالات اس رسالے میں درج ہیں یا ۱۸۵۷ء کے جو واقعات کم وبیش یا اشارہ وکنایہ میں یا جس حد تک بھی وضاحت کے ساتھ آئے ہیں، وہ سب مولف کے ذاتی مشاہدات ہیں ان میں سے کوئی بات بھی سنی سنائی یا ثانوی ذریعہء معلومات کی رہین منت نہیں ہے۔

(ب) ۱۸۵۷ء کے ذکر میں ایک مختصر بیان کو چھوڑ کر تمام بیان تذکرۃ الرشید میں حوالے کے بغیر اخذ کر لیا گیا ہے اگر چہ یہ اخذ واقتباس بہ تصرف ادنی معنی خیز یا بہ الفاظ دیگر بہت دل چسپ ہے۔

(ج) اگر ۱۹۰۹ء میں تذکرۃ الرشید کی اشاعت کے وقت صاف اور واضح بیان میں اور

اظہارِ حقایق میں مؤلف کے لیے خطرات تھے تو اس سے انتیس برس پہلے سوانح عمری کی اشاعت ۱۸۸۱ء کے وقت خطرات کی تو کوئی انتہا نہ ہونی چاہیے تھی۔ اس کے باوجود اگر مولف سوانح عمری وہ سب کچھ مفسدوں کی آڑ لیے بغیر اور صاف لفظوں میں بیان کر سکتے تھے تو صاحب تذکرہ تو ان سے بہت زیادہ صاف اور واضح لفظوں اور دوٹوک انداز میں سنی سنائی بیان کر سکتے تھے۔ ان کے لیے کسی پیچیدہ اسلوب کے اختیار کرنے اور ذو معنی الفاظ استعمال کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں تھا۔

اب ہم سوانح عمری کے مذکورۃ الصدر اقتباس کو زیرِ نظر لاتے ہیں اور اس کی روشنی میں ''تذکرہ'' کے بعض بیانات زیر بحث لائیں گے۔ یہ بحث تفہیم کی سہولت کی خاطر انھی دفعات کی ترتیب سے ہوگی، جو اقتباس پر نقش کی گئی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تمام دفعات (نمبر ا تا ۱۱) ایک مسلسل عبارت ہے۔ تبصرہ و تفہیم کی سہولت کے لیے اسے ان دفعات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

۱- حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے ۱۸۵۲ء میں گورنمنٹ کالج اجمیر سے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ پانچ سال بعد ان کا تبادلہ بنارس کر دیا گیا لیکن جلد ہی انھیں رڑکی اور رڑکی سے بہ عہدہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس سہارن پور بھیج دیا گیا تھا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے کمپنی کی حکومت کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا تو وہ سہارن پور میں تھے۔ میرٹھ، دہلی، مظفر نگر، سہارن پور اور ان کے علاقے حالات سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔

۲- اس سال عید الفطر چوں کہ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی تھی اس لیے یقینی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو مئی کے آخری ایام میں سہارن پور سے نانوتہ لائے ہوں گے۔

یہ چند سطریں نہایت اہم ہیں، ان سے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے جذبات اور جہاد کی تیاریوں پر روشنی پڑتی ہے اور حضرت قاسم العلوم کی ان سرگرمیوں میں دل چسپی کا پتا چلتا ہے اور یہ کہ مولانا بندوق سے نشانہ بازی کے مشقی دور سے گزر چکے تھے اس میں مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب کو بھی ان مشاغل سے دل چسپی تھی اور ان میں حصہ لیتے تھے۔

صاحب تذکرۃ الرشید نے اس کے بعد کا تمام مضمون اپنے تذکرے میں نقل کرلیا ہے لیکن یہ سطریں چھوڑ دیں۔ شاید اس لیے کہ اس رشتے کو پکڑ کر بزرگان دیوبند کی انگریز دشمنی اور جہاد کی تیاری کی تاریخ نہ مرتب کرلی جائے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے لیے ان کی وفات کے بعد بھی کوئی آزمائش پیدا ہوجائے۔

۳- مولف ''سوانح عمری'' نے مولانا قاسم نانوتوی کے بارے میں لکھا ہے اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے نہ دیکھا''۔

صاحب تذکرہ نے یہ مضمون امام ربانی مولانا گنگوہی اور دیگر حضرات کے لیے مخصوص کرلیا۔ اگرچہ اس میں حضرت قاسم العلوم بھی شامل ہیں صاحب سوانح عمری نے مولانا نانوتوی کے بارے میں لکھا ہے کہ خبروں اور افواہوں کے اڑنے کے باوجود اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے۔ صاحب تذکرہ نے اسے بھی اولاً حضرت گنگوہی کے لیے مخصوص کردیا ہے اور دیگر حضرات کو ان کا نام لیے بغیر حضرت کے ساتھ شامل کردیا ہے۔

۴- اس دفعہ کا مضمون بھی ''سوانح عمری'' میں حضرت نانوتوی کے لیے مخصوص تھا۔ تذکرۃ الرشید میں اسے حضرت گنگوہی سے متعلق کردیا ہے۔

۵- ایک مضمون سوانح عمری اور تذکرہ دونوں میں آیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

''ایک بار گولی چل رہی تھی۔ (مولانا) یکا یک سر پکڑ کر بیٹھے گئے جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا کہ سر میں گولی لگی ہے۔ عمامہ اتار کر سر جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر!''

(سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ (اشاعت ۱۸۸۱ء)

''حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی میں گولی لگی اور دماغ پھاڑ کر نکل گئی۔ اعلیٰ حضرت نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کیا ہوا میاں؟ ''عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر!'' تذکرۃ الرشید، (صفحہ ۱۵) (اشاعت ۱۹۰۹ء)

اس عبارت میں ''سر میں گولی لگی'' اور ''کنپٹی میں گولی لگی'' کی تبدیلی کو نظر انداز کردیا جا

سکتا ہے۔ ''ایک بھائی'' کو 'اعلیٰ حضرت' سے بدل دیا گیا ہے۔ یہ اگر چہ نقل مطابق اصل نہیں لیکن معنی غلط نہیں ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت مولانا قاسم العلوم کے پیر بھائی ہی تھے۔ لیکن سر میں گولی کا لگنا زخم نہ پایا جانا اور کپڑوں کا تر ہو جانا دونوں بزرگوں نے بیان کیا ہے اول الذکر بیان محتاط اور صورت واقعہ کے قریب ہے جہاں دست بہ دست جنگ ہو رہی ہو، تلواریں چل رہی ہوں، کشتوں کے پشتے لگ رہے ہوں خون بہہ رہا ہو وہاں گولی لگنے کا شبہ ہو سکتا ہے اور زخم کا نہ ہونا گولی نہ لگنے کے اثبات کے لیے کافی ہے۔ خون سے کپڑوں کا تر ہو جانا تلواروں کے معرکے میں ہر گز تعجب انگیز نہیں۔ ایسے حالات میں کپڑے خون ہی سے تر ہوں گے نہ کہ بزدلوں اور اصحابِ رخصت کے اشکوں سے! یہ معمول کا ایک عام واقعہ تھا! صاحب سوانح...... کے بیان میں وقوعہ کی اصلیت صاف نظر آ جاتی ہے لیکن صاحب تذکرہ کی تحریف اور اسلوب تحریر نے اسے حضرت امام ربانی کی کرامت بنا دیا۔

افسوس کہ آج اُسی خانوادہ علم و تصوف کے بعض اہل قلم میدان شاملی میں اڑائی ہوئی دھول کو ان کے دامن سے جھاڑتے ہیں اور خون کے چھینٹے ان کی پیشانی سے پونچھتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ یہ کرامت کس میدان مین اور کہاں ظہور میں آتی تھی؟

یہ معرکہ ء شاملی کا واقعہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ صاحبِ تذکرہ اور اس سلسلہ ءعالیہ کے بزرگ اور اصحابِ قلم ایک طرف تو واقعہ ء شاملی کو مفسدوں دشمنوں اور مخبروں کی لگائی ہوئی تہمت بتاتے ہیں اور دوسری طرف گولی کے واقعتاً لگنے اور زخم کے غائب ہو جانے کو حضرت امام ربانی کی کرامت بھی قرار دیتے ہیں! یا للعجب۔

۶- ان سطور سے تذکرۃ الرشید میں استفادہ نہیں کیا گیا۔

۷- یہ دونوں ماخذوں میں ہے کہ مفسدوں اور دشمنوں نے مخبری کی تھی کہ یہ تھانہ بھون کے فساد میں بھی شریک ہوئے تھے۔ صاحبِ سوانح نے یہ بات مولانا محمد قاسم کے بارے میں لکھی ہے کہ'' حال آں کہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے ملک و مال کے جھگڑے اگر رکھتے تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی کہیں کے ڈپٹی یا صدر الصدور ہوتے۔'' صاحبِ تذکرہ نے اس مضمون میں ان تمام کمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات کو شامل کر لیا ہے حال آں کہ یہ

خلعت فاخرہ صرف حضرت قاسم العلوم کے قامت زیبا پر راست آتا ہے۔

۸- اس دفعہ میں روپوشی کا جو واقعہ بیان فرمایا "ایام روپوشی میں ایک روز ....الخ یہی واقعہ صاحب تذکرہ نے بھی لکھا ہے۔ (صفحہ ۷۹) لیکن حوالے سے گریز یہاں بھی معمول کے مطابق ہے جو واقعہ پیش آیا تھا اور مولانا محمد یعقوب نے تحریر کر دیا تھا وہ یقیناً اوروں کی زبان پر بھی ہوگا لیکن اصل واقعے، تالیف بیان، لفظوں، جملوں اور ان کی تراکیب کی یکسانیت غماز ہے کہ یہ واقعہ سوانح عمری سے نقل کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس میں مضمون زاید ہے جو دیگر روایات سے استفادے کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

۹- ان ایام روپوشی میں بوڑیہ، گمتھلہ، لاڈوہ، پنج لاسہ وغیرہ کئی بار آنے جانے کا مضمون واحد ہے اور الفاظ کی ترتیب، جملوں کی ترکیب اور مضمون کی تالیف صاف غمازی کرتی ہے کہ یہ پورا بیان بھی سوانح عمری مولانا محمد قاسم سے اخذ کر لیا ہے۔

۱۰- اعلیٰ حضرت حاجی صاحب نے شاملی کے واقعے کے فوراً بعد ہی ہجرت کا ارادہ فرما لیا تھا لیکن حالات کی نزاکت نے روپوشی پر مجبور کر دیا تھا اور ہندوستان سے نکلتے نکلتے بھی انھیں عرب پہنچنے میں کئی سال لگ گئے تھے۔ ۱۲۷۵ھ کے اواخر یا ۱۲۷۶ھ کے اوائل میں جب کے حضرت امام ربانی گرفتار ہوئے تھے اس کے بعد تقریباً چھ مہینے مقدمے میں لگ گئے تھے۔ اس چھ مہینے کی مدت میں یعنی ۱۲۷۶ھ کے نصف اول میں اعلیٰ حضرت کو ہندوستان کو خیر باد کہنے کا موقع ملا تھا۔ ۱۲۷۷ھ کے آغاز میں جب حضرت مولانا محمد یعقوب اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ نے حج کا ارادہ فرمایا تھا تو اعلیٰ حضرت مکہ مکرمہ میں تھے۔

۱۱- اس دفعہ کے پہلے جملے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی عرب روانگی کے فوراً بعد ہی ان دونوں حضرات نے سفر حج کا ارادہ فرما لیا تھا۔ اس وقت مولانا محمد قاسمؒ کا وارنٹ گرفتاری برقرار تھا اور پولیس ان کی تلاش میں تھی۔

اوپر کی سطروں میں سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ اور تذکرۃ الرشید کا جو مطالعہ پیش کیا گیا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "سوانح" کو صرف تحریر و اشاعت ہی میں "تذکرہ" پر اولیت حاصل نہیں حالات اور واقعات کا اولین ماخذ و مصدر ہونے کی وجہ سے بھی فوقیت حاصل ہے

اگر چہ اس زمانے کی تصنیفات میں بھی نقد و تبصرہ کے مباحث اور افکار و معلومات میں ماخذ و مصادر کے حوالے موجود ہوتے تھے، اور آج کل تو تنقید و تحقیق کی اخلاقیات اور اخذ واستفادہ کے اصول میں حوالے کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مصنف کسی کتاب سے استفادہ کرے اور اس کا حوالہ نہ دے اور کسی اول یا سابق یا معاصر اہل قلم کے مضمون میں ادنی تصرف اور مرجع و مسند الیہ کو بدل دینا تو نہایت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں صاحب تذکرہ کے اصول و اخلاق مختلف اور اعلیٰ ہیں۔

(۳)

رسالہ خیرخواہان مسلمانان (حصہ سوم)

از سر سید احمد خاں

سر سید احمد خان اس دور کی اہم شخصیت تھے۔ ۱۸۵۷ء کا معرکہ گرم ہوا تو وہ بجنور میں سرکاری فرائض انجام دے رہے تھے۔ بجنور، مظفر گڑھ، سہارن پور ایک دوسرے سے ملے ہوئے اضلاع ہیں۔ ہنگامے کے دنوں میں ان اضلاع اور ان کے قصبات میں ایک دوسرے ضلع کے حکام میں فوجی کمک، اطلاعات اور احکام وہدایات کے حوالے سے مسلسل رابطہ تھا۔ سر سید احمد خان اس علاقے میں انگریزی حکومت کے سب سے بڑے مشیر اور پر جوش و با اخلاص معاون و مددگار تھے۔ انھوں نے ہر طرح حکومت کی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ حالات سے واقف ہی نہیں حکومت کے امور و اقدامات میں سرگرم اور اہم عامل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگرچہ اُن کی سرگرمیوں کا اصلی مرکز اور دایرہ عمل بجنور کا ضلع تھا، جہاں وہ ۱۸۵۵ھ سے صدر امین تھے لیکن حالات پر ان کی نظر گہری اور پورے علاقے پر تھی سہارن پور کے حالات بھی ان کی نظر و توجہ سے محروم نہ رہے۔ شاملی کا تحصیل دار محمد ابراہیم خان جو حکومت کا وفادار ہی نہیں جاں نثار بھی ثابت ہوا اور نہ صرف خود شاملی میں حکومت کے مفادات کی حفاظت کرتے اور حکومت کو بچاتے ہوئے جان ہار گیا تھا اس نے اپنے بھائی اکبر خان اور خاندان کے دوسرے افراد کو بھی حکومت کی مدد کے لیے بلا لیا تھا وہ سب یا بیشتر ان میں سے مارے گئے۔ ''رسالہ خیر خواہ مسلمانان'' (حصہ سوم) میں سر سید نے اس کی خدمات اور جاں نثاری کا پر جوش الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ سر سید نے اس کے بیٹے کو باپ کی حسن خدمت گذاری و جاں نثاری کے صلہ و اعزاز میں سند بھی دلوائی تھی۔ شاملی کے واقعے کے سلسلے میں سر سید احمد خانِ لکھتے ہیں:

> ''ستمبر ۱۸۵۷ء میں دفعتہً مسلمانان ساکنان تھانہ بھون نے جن کا افسر قاضی عنایت علی تھا۔ فساد برپا کیا اور ایک بڑے گروہ نے تحصیل شاملی پر حملہ کیا اس وقت تحصیل شاملی میں تخمیناً دس سوار پنجابی رسالے کے اور

اٹھائیس سپاہی جیل خانے کے اور پچاس سے زاید سپاہی متعینہ تھانہ و تحصیل کے اور باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے تھے۔ مع اکبر خان اس کے بھائی کے جو رام پور سے گئے تھے اور وہاں موجود تھے۔

یہ افسر بہ کمال دلاوری و بہادری بہ مقابلہ پیش آیا اور تحصیل شاملی کو مستحکم کر کر اور اس میں محصور ہو کر بہ خوبی لڑا اور ہر دفعہ مفسدوں کے حملے کو ہٹا دیا اور بہت سے آدمی ان میں سے مارے گئے۔ اخیر کو گولی بارود تحصیل میں ختم ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کو قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آ گئے۔ یہاں تک کہ تحصیل میں گھس آئے وہاں بھی مقابلہ ہوا اور یہ افسر نہایت بہادری سے مع اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا اور شرط نمک حلالی کو پورا کر دیا۔

یہ قتل و خوں ریزی شاملی میں ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو واقع ہوئی، جو دن کہ فتح دہلی کا تھا مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مژدہ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔ اس ہنگامے میں ایک سو تیرہ آدمی (۱۱۳) جن میں سے زیادہ مسلمان تھے کام آئے اور ہر ایک تمغہ خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے ساتھ لے گیا۔ یہ ہنگامہ جو تحصیل شاملی میں تھانہ بھون کے مفسدوں کے ساتھ ہوا تھا وہ ہنگامہ بھی جس کا مفسدان تھانہ بھون نے جہاد نام رکھا تھا مگر اس تمام حالات کے دیکھنے سے واضح ہو گا کہ جو لوگ ان مفسدوں کے مقابلے میں آئے اور دو بہ دو ہو کر لڑے اور بہتوں کو جان سے مارا اور مرتے دم تک مقابلے و مقاتلے سے باز نہ رہے، وہ بھی مسلمان تھے اور نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا۔"

(مقالات سرسید (حصہ ہفتم): لاہور، مجلس ترقی ادب (۱۹۶۲ء، ص ۸۳-۱۸۵)

اس بیان میں آخری بات تو سرسید نے اپنے عقیدے کے بارے میں لکھی ہے سرسید ۱۸۵۷ء کے معرکے کو جہادِ آزادی نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس کے بہت سے نام مثلاً غدر، فساد، بدمعاشی، نمک حرامی وغیرہ رکھے تھے۔ لیکن اس وقت ہمارا یہ موضوع نہیں۔ اس معاملے میں ان کا نقطہ نظر اور رویہ کچھ ہی کیوں نہ رہا ہو لیکن ایک مورخ کی حیثیت میں ان کے اس بیان کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

میں یہاں قارئین کرام کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ انھوں نے شاملی کے واقعہ کا انکار نہیں کیا بلکہ کئی غیر مشتبہ ثبوت سے اسے مدلل کر دیا ہے اور اگر دوسرے پچاسوں واقعات و افراد اس کے شاہد نہ ہوتے، تب بھی آج کا کون مورخ اور مصنف اس ایک کی شہادت کو رد کر سکتا تھا؟

(۴)

چند معاصر سرکاری اطلاعات

(ہنری مالکم لو، اور ہنری جارج کین کی رپورٹیں)

شاملی وتھانہ بھون کے حالات وواقعات اور جزئیات کی حد تک علاقے میں حکومت کے استحکام، دفاع، انتظامات کے سلسلے میں احکامات واقدامات اور اطلاعات وہدایات کے حوالے سے روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مظفر نگر کے کلکٹر آر۔ایم ایڈورڈس، جوائنٹ مجسٹریٹ ضلع سی گرانٹ اور ہنری مالکم لو اسسٹنٹ مجسٹریٹ اور دوسرے انگریزی سول انتظامیہ اور فوجی حکام کے احکام اور اعلیٰ فوجی وغیر فوجی حکام کو حالات کی تفصیلات میں جو اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں ان سے شاملی وتھانہ بھون اور ان کے قرب وجوار کے علاقوں کے حالات اور مجاہدین کی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان معلومات سے ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ثناء الحق صدیقی مولانا سید محمد میاں اور دوسرے بہت سے حضرات نے جنھیں سہارن پور، مظفر نگر وغیرہ میں پیش آنے والے واقعات سے دلچسپی تھی، اپنی تالیفات میں فایدہ اٹھایا ہے۔

ہنری مالکم لو

ہم یہاں بہت تفصیلات بیان کرنے کے مقابلے میں مالکم لو کی ایک رپورٹ کا اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اس میں بعض اہم جزئیات تک موجود ہیں۔ اس سے تذکرۃ الرشید کے ایک بیان کی تصدیق بھی ہوتی ہے اس سے باغ شیر علی کی سڑک پر پیش آنے والے واقعے پر روشنی پڑتی ہے۔ ثناء الحق صدیقی مرحوم کے مطابق میوٹنی ریکارڈس کے مطابق ہنری مالکم لو اسسٹنٹ مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ ۲۰ رستمبر ۱۸۵۷ء کو لیفٹننٹ ڈبلیو ٹی ہوگئی کمانڈر پہلی پنجاب کیولری کو پیش کی تھی وہ لکھتا ہے:

"مجسٹریٹ سہارن پور مسٹر سپنکی سے جو ہدایات موصول ہوئی تھیں ان کی تعمیل میں میں ماہ رواں ۱۸۵۷ء بروز منگل ایک جمعیت کے ساتھ

جس کی تفصیل حاشیے میں درج ہے، رام کنڈی سے بہ راہ مظفر نگر شاملی کی جانب روانہ ہوا، (جمعیت میں یہ افراد شامل تھے) ایک دیسی افسر تیس حوالدار، پینتالیس سوار، جن میں سے اپنے طور پر ایک حوالدار اور پانچ سواروں کو اس فرض سے علاحدہ کر دیا کہ وہ اس دستے کا سامان اور بہ قدر باربک شتر گولہ بارود لے کر آئیں۔ میں نے اس دستے کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اسی راستے سے سفر کرے، جو میں نے اختیار کیا تھا۔ لیکن مجھے یہ بیان کرتے ہوئے ملال ہوتا ہے کہ تحصیل دار دیوبند کی غلط ہدایات کی بناء پر اور اس علاقے سے ناواقفیت کی وجہ سے مختصر سی جماعت تھانہ بھون کے راستے سے شاملی کی طرف روانہ ہوئی۔ ویسے تو یہ راستہ سیدھا تھا لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ اس جگہ (تھانہ بھون) کے لوگوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ موخر الذکر قصبہ (تھانہ بھون) سے گزرتے وقت اس جماعت پر باغیوں نے جو وہاں پہلے سے جمع تھے حملہ کر دیا۔ چوتھے رسالے کا ایک سردار پرتاب سنگھ مارا گیا اور گولہ بارود کا ذخیرہ دشمن کے قبضے میں پہنچ گیا۔ ہمارے آدمیوں نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن وہ دشمن کی کثرت تعداد کی وجہ سے مغلوب رہے۔'' (جہادِ شاملی و تھانہ بھون: ثناء الحق صدیقی، کراچی ۱۹۸۶ء صفحہ ۳۸-۳۷)

مالکم لو نے گولا بارود لے جانے والی جس جماعت کا ذکر کیا ہے اور جو لوٹ لی گئی تھی وہ ۹ ستمبر کو سہارن پور سے شاملی بھیجی گئی تھی۔ اس میں ایک دفعدار اور پانچ سوار تھے اس وقت قاضی عنایت علی خان کے بھائی قاضی عبدالرحیم خان اور ان کے رفقاء کو پھانسی دینے کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ اسی واقعے سے مشتعل ہو کر قاضی عنایت علی ایک جماعت کے ساتھ شیر علی کے باغ کے سمت سڑک پر جا پڑے تھے اور موقع ملتے ہی گولا بارود لے جانے والی جماعت سے مقابلہ ہوا تھا۔ اس واقعے پر مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی تذکرۃ الرشید سے جو روشنی پڑتی ہے وہ مالکم کی

رپورٹ کے عین مطابق ہے۔ حال آں کہ اس وقت تک میوٹنی ریکارڈ مطالعہ واستفادہ کے لیے عام نہیں ہوا تھا اس لیے مولانا میرٹھی کے بیان کی بنیاد مالکم لو کی یہ رپورٹ نہیں ہوسکتی تھی رپورٹ اور تذکرہ کا بیان ایک دوسرے کا مصدق ہے۔ مالکم لو نے یہ رپورٹ شاملی کے واقعے کے صرف چھ دن بعد بھیجی تھی گویا کہ ۱۴ ستمبر کے ایک دو روز بعد ہی لکھی ہوگی۔ مولانا میرٹھی نے شیر علی کے باغ والی سڑک پر پیش آنے والے واقعے پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> ''قاضی عنایت علی خان کو اپنے بھائی (عبدالرحیم خان) کے دنیا سے رحلت کی اطلاع ملی، اس صدمے سے عنایت علی خان پر رنج وغم کے پل ٹوٹ پڑے اور جوشِ حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہوگیا۔ اتفاق سے چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کاتوسوں کی کئی پیٹیاں لدوائے سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جارہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی اور اپنے جنون میں مست چند رفقاء اور رعایا کو ساتھ لے کر شیر علی کے باغ کی سمت سڑک پر جاپڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گزرے۔ ان کا اسباب لوٹ لیا۔ ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہو کر بہ سمتِ مشرق جنگل کو بھاگا مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔'' (تذکرۃ الرشید، صفحہ ۷۳، حاشیہ)

ہنری جارج کین

''اس علاقے میں پیش آنے والے واقعات کے سلسلے میں ایک وقائع نگار ہنری جارج کین کا نام بھی آیا ہے اس کے بیان سے شاملی کے واقعے پر جو روشنی پڑتی ہے، اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاملی کے واقعے میں محصورین میں سے ایک سو تیرہ آدمی مارے گئے تھے ان میں محمد ابراہیم خان تحصیل دار بھی تھا۔ ہنری کین لکھتا ہے:

> ''لڑائی تمام دن جاری رہی لیکن چوں کہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے ان کا پلہ بھاری رہا، محصورین میں سے ایک سو تیرہ آدمی مارے گئے جن میں ابراہیم خان سب کلکٹر بھی تھا۔''

اس معرکے میں کام آنے والوں کی تعداد سر سید نے بھی ایک سو تیرہ ہی بتلائی ہے۔ شاید ان کے بیان کا ماخذ ہنری کین کی رپورٹ ہو یا کوئی اور ذریعہ معلومات!

یہ مطالعہ (دفعہ ۴) ثناء الحق صدیقی، ڈاکٹر محمد ایوب ترمذی اور مولانا سید محمد میاں رحمہم اللہ کی تالیفات کے حوالوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

(۵)

چند مزید معاصر دستاویزات

بہ حوالہ ''اتر پردیش میں آزادی کی جدوجہد''

اب میں قارئین کرام کی توجہ ''اتر پردیش میں آزادی کی جدوجہد'' کے سلسلہء دستاویزات (ڈاکومنٹس) کی طرف دلانا چاہوں گا۔ حکومت ہند کے فیصلے کے مطابق آزادی کی جدوجہد کا تمام ریکارڈ تھانوں، تحصیلوں، عدالتوں اور گورنمنٹ آف انڈیا کے دفتری وغیر دفتری مآخذ سے حاصل کر کے اتر پردیش کے متعلق یوپی گورنمنٹ نے شائع کر دیا ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل یوپی کے متعلق سیاسی تاریخ کا یہ عظیم الشان ریکارڈ ہے۔ اگرچہ یہ تاریخ کا کل سرمایہ نہیں ہے لیکن جو کچھ مرتب کر کے چھاپ دیا گیا ہے اس کی بھی کوئی مثال موجود نہیں! اس سلسلے کی ''پانچویں جلد'' اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں شمالی اضلاع یوپی مظفر نگر اور سہارن پور میں جدوجہد آزادی کی دستاویزات صفحہ ۱۲۷ تا ۱۵۹ تقریباً ۳۲ صفحات میں درج ہیں۔ اس میں ان دونوں اضلاع کے مختلف قصبات اور تحصیلوں میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق مختلف سول اور فوجی حکام اور مقامی حضرات کے خطوط، اطلاعات، ہدایات، گزیٹیروں وغیرہ سے ماخوذ معلومات درج ہیں۔ اس مقالے میں جو واقعات زیر بحث آئے ہیں۔ ان میں سے تردید کسی واقعے کی نہیں ہوتی۔ البتہ تائید نہ صرف مختلف اندازوں سے بلکہ راست بیانات وتحریرات سے بھی ہوتی ہے۔ ان دستاویزات کے مطالب کے احاطہ وتعارف کے لیے تو کئی جلدوں کی ضرورت ہوگی۔ ایک مقالہ تو درکنار ایک جلد بھی ان کے مطالب کی تعارفی فہرست کے لیے ناکافی ہوگی۔ البتہ مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع سے متعلق مباحث کی ایک فہرست مرتب کر دی جاتی ہے اس سے زیادہ کے لیے اس میں نہ گنجایش ہے، نہ فرصت ہے اور نہ صحت مساعد! فہرست یہ ہے:

مظفر نگر، صفحہ ۱۲۷

(۱) مظفر نگر کے مجسٹریٹ آر ایم ایڈورڈس کے بیان مورخہ ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء کا اقتباس:

مظفرنگر کی ویرانی

شاملی میں کوئی لوٹ مار نہیں ہوئی

(۴) ایف ولیمز کے نام سی گرانٹ کے خطہ مورخہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۵۷ء کی نقل

جاؤلا اور کورالسی پر حملہ

(۵) راسپنکی مجسٹریٹ سہارن پور کا خطہ مورخہ ۱۸ر ستمبر ۱۸۵۷ء بہ نام ایف ولیمز کمشنر میرٹھ ڈویژن

شاملی پر حملہ کے بعد انگریزوں کے اقدامات

(۶) آر ایم ایڈورڈس قایم مقام مجسٹریٹ مظفرنگر کا خط مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۸۵۷ء بہ نام آر اسپنکی مجسٹریٹ سہارن پور

بجنور کے انقلابیوں سے مظفرنگر کو خطرہ

عنایت علی کی بجنور کے انقلابیوں میں شرکت

(۷) ککرولی کیمپ سے آر ایم ایڈورڈس کا خط مورخہ ۴ر دسمبر ۱۸۵۷ء بہ نام ایف ولیمز

ماڑے خان کا بنڈاور پہنچنا

(۸) کمشنر میرٹھ ڈویژن کا خط مورخہ ۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء بہ نام میجر جنرل اے ولسن کمانڈنگ میرٹھ ڈویژن۔

ماڑے خان کا دوآبے میں داخلہ اور انگریزوں کی گھبراہٹ

(۹) میجر جنرل اے ولسن کا خط مورخہ ۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء بہ نام کمشنر میرٹھ ڈویژن ایف ولیمز:

ماڑے خان کے خلاف انگریزوں کی امداد طلبی

(۱۰) آر ایم ایڈورڈس قایم مقام مجسٹریٹ مظفرنگر کے نام کمشنر میرٹھ ڈویژن ایف ولیمز کا خط مورخہ ۷ر دسمبر ۱۸۵۷ء:

مظفرنگر کے انقلابیوں کو سزا دینے کے اقدامات

(۱۱) آر اسپنکی مجسٹریٹ سہارن پور کا خط مورخہ ۲۳ر اپریل ۱۸۵۸ء بہ نام ایف ولیمز:

ماڑے خان اور انگریزی فوج میں مقابلہ

سہارن پور، صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۹:

(۱) کیپٹن ایچ ای ریڈ کمانڈنگ رڑکی کا خط مورخہ ۲ر جولائی ۱۸۵۷ء بہ نام آر اسپنکی مجسٹریٹ سہارن پور۔

فتوا اور آصف گڑھ کے درمیان بنجاروں کا اجتماع

منگلور میں حملے کا خطرہ

(۲) لیفٹننٹ کرنل ایف ڈی میکفرسن ملٹری سیکرٹری چیف کمشنر پنجاب کے خط مورخہ ۲۱ر اگست ۱۸۵۷ء (کا اقتباس) بہ نام میجر جنرل گوران:

کرنال کے قریب مقابلہ

گنگا گھاٹ پر ہل چل

(۳) کیمپ مایا پور کیپٹن بوانسر گون کا خط مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۸۵۸ء بہ نام لیفٹننٹ کرنل بیراڈ اسمتھ:

مایا پور میں مقابلہ

نواب آف نجیب آباد کا کنکھال، جوالا پور، ہردوار پر حملہ

نواب آف نجیب آباد کے بھتیجے کا خط

(۴) فرینڈ آف انڈیا سے ایک اقتباس مورخہ ۲۱ر جنوری ۱۸۵۸ء

(۵) گورنر جنرل آف انڈیا ان کونسل کے نام کرنل ہیوگ فریزر چیف کمشنر نارتھ ویسٹرن پروونسز کا خط مورخہ ۱۸ر جنوری ۱۸۵۸ء:

بجنور کے انقلابیوں کا دوآبے پر حملہ

(۶) ایک بیان مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۸۵۸ء

ناگل گھاٹ پر انقلابیوں کا مورچہ

کنکھال سے انقلابیوں کی پسپائی

سہارن پور کو غیر مسلح کرنا

اس میں شاملی کے بہ راہِ راست صرف تین حوالے آئے ہیں:

الف: پہلا حوالہ شاملی پر حملہ کے صرف چار روز بعد ۱۸ر ستمبر ۱۸۵۷ء کا ایک خط (یا رپورٹ) ہے جو سہارن پور کے مجسٹریٹ آر اسپنکی نے میرٹھ ڈویژن کے کمشنر ایف ولیمز کو لکھا تھا اور بتایا تھا کہ شاملی میں حملے کے بعد دفاع کے سلسلے میں احتیاط اور حفاظت کے مزید کیا انتظامات کیے گئے ہیں۔

ب: دوسرا خط (یا رپورٹ) مظفرنگر کے قایم مقام مجسٹریٹ آر ایم ایڈورڈس کا ہے جو اس نے ایف ولیمز کمشنر میرٹھ ڈویژن کو ۱۱ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو بھیجا تھا۔ یہ علاقے کے حالات کی تفصیلی رپورٹ ہے اور اس میں شاملی کا دو مقامات پر ذکر آیا ہے۔

۱- ایک جگہ پر شاملی پر حملے کا ذکر ہے۔

۲- دوسری جگہ پر یہ ذکر آیا ہے کہ حملہ آوروں نے یہاں کوئی لوٹ مار نہیں کی۔

یہ بات بہت اہم تھی۔ اس زمانے میں عام طور پر حملوں کے جو واقعات پیش آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کا تو مقصد ہی لوٹ مار ہوتا تھا۔ جہاں ان کو موقع ملتا تھا سرکاری خزانہ یا رسد لوٹ لیتے تھے اور جہاں ہاتھ لگتا تھا وہ عوام کو اور ان کی بستیوں کو لوٹ لیتے تھے۔

شاملی میں لوٹ مار کا نہ ہونا ایک خاص بات تھی۔ اس لیے کہ یہ حملہ لوٹ مار کرنے والوں نے نہیں کیا تھا۔ ان کا مقصد لوٹ مار کرنا نہیں تھا۔ وہ عوام کی خدمت کے لیے میدان میں نکلے تھے۔ انھوں نے حکومت کی خالی جگہ ایک مستقل نظام کے قیام سے پر کی تھی۔ وہ امن وامان کا قیام اور عوام کی جان و مال کا تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ وہ حالات کی ابتری کو وجہ جواز بنا کر آپس کی دشمنیوں کا بدلہ لینے والے نہیں تھے بلکہ آپس کے خصومات کو مٹانے والے اور ایک دوسرے کے دلوں میں محبت پیدا کرنے والے تھے۔ ان کا مقصد خزانہ لوٹنا تھا ہی نہیں!

یہ تفصیلات اگر چہ بہت مختصر ہیں لیکن جو لوگ شاملی کے واقعے کے منکر ہیں، ان کے لیے اتنی تفصیل بھی مسکت جواب ہے کہ شاملی میں یہ معرکہ پیش آیا تھا، وہاں خزانہ نہیں لوٹا گیا تھا اور شاملی پر حملے کے بعد اس کے دفاع و استحکام کے مزید اقدامات کیے گئے تھے۔

(۶)

مثنوی تحفۃ العشاق

از خامۂ عنبر شامہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ

مثنوی کا موضوع اگرچہ سلوک و معرفت ہے لیکن اس کے ابتدائی حصے میں حضرت حاجی صاحب نے اپنے برادرِ طریقت حافظ محمد ضامن شہید معرکہ ٔشاملی کے ذکر میں تقریباً پچیس اشعار ہیں۔ اس مثنوی کی تحریر کے لیے سب سے بڑی محرک حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ کی ذات گرامی تھی۔ اس لیے تحریر کے اسباب محرکات میں حضرت کا نام آنا ہی تھا لیکن حضرت ناظم مثنوی سے ان کے کئی اور رشتے بھی تھے۔

۱- دونوں بزرگ ایک ہی شیخ طریقت حضرت نور محمد محمد جھنجھانوی کے حلقہ ٔارادت میں شامل تھے اور دونوں بزرگ منصب خلافت پر فائز تھے۔

۲- حضرت مہاجر مکی معرکہ ٔشاملی میں امیر الجہاد تھے اور حضرت حافظ صاحب اس معرکے میں مجاہد کی حیثیت سے شریک تھے اور شہادت کے منصب پر فائز ہوئے۔

۳- دونوں بزرگوں میں ایک دوسرے کے لیے کمال درجے اخلاص اور محبت تھی۔ اسی تعلق اخلاص و محبت کا نتیجہ ہے کہ حضرت ناظم نے ان کے ذکر میں اپنے دل کے ٹکڑوں کو کاغذ پر پھیلا دیا ہے۔

اس مثنوی کی تحریر کا عزم تو حضرت معرکہ ٔشاملی سے پہلے فرما چکے تھے لیکن اس کی تالیف و تحریر کے لیے وقت ہجرت کے بعد کا اور مقام بلد امین مکہ ٔمکرمہ مقدر تھا۔ اس کا موقع ۱۲۸۱ھ/ ۶۵-۱۸۶۴ء میں میسر آیا۔ اس وقت حضرت داعی محرک حافظ ضامن علیہ الرحمہ کی شہادت کو تقریباً آٹھ برس گزر چکے تھے لیکن شہید کے فراق و جدائی نے حضرت ناظم کے دل پر جو یادگار زخم چھوڑے تھے ان سے اب تک خون رس رہا تھا اور درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں جن کی کسک کو قارئین کرام آج بھی محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ مثنوی معرکہ ٔشاملی میں حضرت حافظ ضامن کی شہادت کے اوّلین مآخذ میں شمار ہوتی ہے۔ اس مثنوی کا مطالعہ اسی خصوصیت کی بنا پر چوں کہ الگ پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں انھی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۷)

واقعۂ شاملی کے ماخذ ''تذکرۃ الرشید'' پر آخری نظر

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ صاحب تذکرۃ الرشید حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی سیاسی مورخ یا سیاسی سوانح نگار نہ تھے ان کا مقصد اپنے بزرگِ خانقاہ اور پیرومرشد کا تذکرہ تھا اس کے باوجود ایک خاص حد تک جس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا انھوں نے واقعات شاملی وتھانہ بھون بیان کردیے ہیں۔ البتہ ان کا اسلوبِ بیان قدرے مختلف ہے۔ بعض بیانات سے بربنائے اسلوب اشتباہ ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن غور کرنے سے پوری حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

اس کے باوجود آپ تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلیجیے کہ مؤلف موصوف وہ سب کچھ بیان نہ فرماتے یا مرحوم کی تحریر میں واقعی کوئی ایسی پیچیدگی ہوتی. جس کی گرہ کشائی ہمارے ناخن فکر کے لیے ممکن نہ ہوتی یا فی الواقع شاملی تھانہ بھون کے واقعات اور بزرگوں کے ساتھ پیش آنے والے حوادث سے وہ انکار ہی کردیتے تو کیا ان حوادث وواقعات کا پیش آنا معدوم ہوجاتا یا تذکرۃ الرشید شاملی وتھانہ بھون کا واحد ماخذ ہوتا اور وہ جو صفحۂ ہستی سے نابود ہوجاتا تو کیا دنیا تاریخ کے ان حوادث سے بےخبر رہ جاتی؟ جان لینا چاہیے کہ تذکرۃ الرشید نہ تو شاملی وتھانہ بھون کی تاریخ حوادث کا پہلا ماخذ ہے اور نہ واحد ماخذ ہے۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (۱۸۸۱ء-۱۹۴۱ء) واقعات تھانہ بھون اور شاملی ۱۸۵۷ء کے پچیس برس بعد پیدا ہوئے تھے تقریباً باون برس کے بعد ان کی تالیف شائع ہوئی تھی۔ ان کی تمام باتیں سنی سنائی تھیں وہ نہ تو ان کے اپنے مشاہدات تھے اور نہ ان کی اپنی زندگی کے سوانح تھے مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۸۳۳ء-۱۹۱۴ء) تو ۱۸۵۷ء میں چوبیس برس کے نوجوان تھے اور حضرت قاسم العلوم کی زندگی سے براہ راست واقف تھے۔ دونوں بزرگوں میں کئی باہمی نسبتیں تھیں چھٹی پشت میں دونوں کا سلسلہ نسب ایک ہوجاتا ہے۔ سوانح عمری مولانا محمد قاسم میں تحریر فرماتے ہیں۔

''حقیر کے اور مولوی صاحب کے علاوہ قربِ نسب بہت سے روابطِ اتحاد تھے ایک مکتب میں پڑھا، ایک وطن، ایک نسب، ہم زلف ہوئے،

> ایک استاد سے ایک وقت میں علم حاصل کیا اور بعض کتابیں میں نے مولانا سے پڑھیں، ایک پیر کے مرید ہوئے، ہم سفر دو سفر حج کے رہے اور ایک زمانہ دراز تک ساتھ رہے۔ (صفحہ ۳)

دونوں میں کوئی راز نہ تھا، دونوں ایک دوسرے کے حالات سے واقف تھے اور دونوں ایک دوسرے کے جاں نثار تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مولانا محمد یعقوب سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر تعینات تھے کہ ملک کے حالات بگڑ گئے (حالات مولانا یعقوب و مملوک ص ۴۶ تا ۵۰)، علاقے میں آزادانہ نقل وحرکت مخدوش ہوگئی، گھر والوں کو فکر پیدا ہوئی، مولانا محمد قاسم نے نانوتہ سے چند آدمیوں کو ساتھ لیا سہارن پور گئے اور مولانا محمد یعقوب کو گھر لے آئے۔ مولانا محمد یعقوب نے خود لکھا ہے:

> ''اسی عرصے میں غدر ہوگیا، بعد رمضان ۱۲۷۳ھ جون ۱۸۵۷ء) احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے۔'' (سوانح عمری مولانا محمد قاسم صفحہ ۱۴)

۱۸۵۷ء میں یکم رمضان ۱۲۷۳ھ ۲۵/اپریل کو ہوا تھا اور ۲۵/مئی کو یکم شوال، عید الفطر تھی اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مئی کے آخری ایام میں ۲۵ سے چند دن پہلے مولانا محمد قاسم سہارن پور گئے ہوں گے اور مولانا محمد یعقوب کو نانوتہ لائے ہوں گے۔

مولانا محمد یعقوب غدر کے حالات سے بہ ذات خود گزرے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے تمام واقعات ان کے ذاتی علم اور مشاہدے کی چیزیں تھیں اور اگرچہ وہ معرکہء جہاد و قتال میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کے شریک نہیں تھے لیکن وہ ان حالات سے متاثر ضرور ہوئے اور حوادث کے چھینٹوں نے ان کا دامن بھی تر کر دیا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کے بقول مولانا قاسمؒ کے دھوکے میں گرفتار ہوئے اور کچھ دن جیل کی ہوا کھائی وہ اسے خدا کی طرف سے تنبیہ خیال کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو لوگ ان تمام کارروائیوں میں شریک تھے انھوں نے جہاد کیا تھا وہ تو آزاد پھر رہے ہیں اور میں نے تو کوئی حصہ نہیں لیا مجھ کو گرفتار کر لیا گیا یہ مجھ کو تنبیہ ہے کہ تو نے کیوں جہاد میں شرکت نہ کی؟'' (نقش حیات: جلد دوم (فرزند توحید ایڈیشن)، کراچی: ص ۶۹-۴۶۸)

ان کی تالیف ''سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ'' تذکرۃ الرشید سے تقریباً انتیس برس پہلے اور مولانا میرٹھی کی پیدایش سے ایک سال پہلے ۱۸۸۰ء/ ۱۲۹۷ھ میں شائع ہو چکی تھی یہ بائیس صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے اور تقریباً دو صفحوں میں اس زمانے کے بعض واقعات بہ طور مشاہدات بیان ہوئے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تذکرۃ الرشید کے کئی بیانات کا ماخذ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا یہی رسالہ ہے۔ اس لیے تذکرہ ان واقعات کا نہ تو اولین ماخذ ہے نہ واحد ماخذ ہے بلکہ اس کی حیثیت ثانوی ہے اہل علم اور اصحاب تحقیق کسی واقعے کے اولین و راست ماخذ اور ثانوی ماخذ نیز مشاہدات و واردات ذاتی اور مسموعات و منقولات کے فرق کو بہ خوبی جانتے ہیں۔

ایسا بھی نہ تھا کہ اس عہد اور ان واقعات میں ملوث اور ان سے تعلق رکھنے والوں سے صاحبِ تذکرہ نے بہ راہِ راست استفادہ کیا ہو۔ حافظ محمد ضامن ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو معرکہ شاملی میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر چکے تھے۔ اعلیٰ حضرت حاجی امداداللہ ۱۸۶۰ء میں ملک سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے جا چکے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبِ تذکرہ کی پیدائش سے ایک سال قبل ۱۸۸۰ میں جوار رحمت میں جگہ پا چکے تھے۔ مولانا عاشق الٰہی چار برس کے تھے تو معرکہ شاملی کے ایک شریک و مجاہد مولانا مظہر نانوتوی (ف ۱۸۸۵) اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد منیر نانوتوی نے ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ علیین کا سفر اختیار فرمایا تھا۔ مولانا منیر سے ان کے استفادے کا پتا نہیں چلتا۔ حضرت امام ربانی سے یقیناً انھوں نے استفادہ کیا ہوگا۔ اگر چہ ان کے ذریعۂ معلومات سے کتاب میں کہیں حوالہ نہیں آیا۔ اس لیے ہم اس ذریعے کو نقد و نظر کا ہدف نہیں بنا سکتے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے رسالے سوانح عمری مولانا محمد قاسم سے انھوں نے اخذ و اکتساب کیا ہے۔ اگر چہ آج کل کے اصول تحقیق کے مطابق اس کا انھوں نے حوالہ نہیں دیا ہے لیکن اس سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا۔ بعض عبارتوں میں تو وہ تحریف تک کے مرتکب ہوئے ہیں۔

حلیہ شریف

حضرت پیر و مرشد حافظ محمد ضامن شہید

از کلکِ عنبر فشاں

مولانا محمد یعقوب نانوتوی

مولانا محمد یعقوب مولانا مملوک العلی نانوتوی مدرس دہلی کالج کے بیٹے تھے۔ وہ ۱۳؍صفر ۱۲۴۹ھ مطابق ۲ جولائی ۱۸۳۳ء بہ روز سہ شنبہ (منگل) نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی سے اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کی خدمت میں تحصیل علمی کی منزلیں طے کی تھیں۔ تکمیل تعلیم کے بعد اجمیر کے سرکاری کالج میں تیس روپے ماہوار تنخواہ پر استاد مقرر ہوگئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کا تبادلہ بنارس ہوگیا اور پھر انھیں ان کے اپنے ضلع سہارن پور میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس وقت ان کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار تھی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا آغاز ہوا تو وہ سہارن پور میں تھے۔ حالات زیادہ خراب ہوئے تو مولانا محمد قاسم خود جا کر انھیں نانوتہ لے آئے۔ آزادی کی جنگ میں انھوں نے حصہ نہیں لیا لیکن جب ہنگامے کے ایام کی چھ مہینے کی انھیں تنخواہ پیش کی گئی تو چوں کہ ان ایام میں انھوں نے اپنے فرایض ادا نہیں کیے تھے، اس لیے تنخواہ کے نو سے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ البتہ ان کی زندگی کے حالات اور متعدد واقعات سے ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی سے ان کی دل چسپی اور مجاہدین آزادی سے ان کی ہم دردی کا ثبوت ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے کچھ عرصے بعد انھوں نے سرکاری ملازمت بھی چھوڑ دی تھی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئے تھے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے انھیں دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس اور شیخ الحدیث مقرر فرمایا تھا۔ کچھ دنوں انھوں نے اس منصب کی خدمات انجام دی تھیں۔ حضرت حاجی صاحب امداد اللہ مہاجر مکی سے رشتہ ارادت رکھتے تھے اور انھیں سے سلوک و معرفت میں فیض حاصل کیا تھا اور حضرت کے

زمرۂ خلفا میں شامل تھے۔ ۲ر ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۰ر دسمبر ۱۹۰۱ء کی شب میں انتقال ہوا۔ اگلی صبح کو بہ روز یک شنبہ (اتوار) نانوتہ ہی میں تدفین ہوئی۔

حضرت مولانا نانوتوی ایک مکمل عالم دین تھے۔ انھیں تمام علوم اسلامی پر عبور حاصل تھا۔ طبیبِ حاذق تھے اور بلند پایہ شاعر بھی۔ سوانح عمری مولانا قاسم نانوتوی، بیاضِ یعقوبی اور مکتوباتِ یعقوبی ان کی یادگار ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی ایک نظم حلیہ نگاری یا شمایل نویسی میں فن کا اعلیٰ نمونہ اور نادر یادگار ہے۔ اس میں حضرت حافظ محمد ضامن کی معرکۂ شاملی میں شرکت، ان کی بہادری، بے خوفی، کمال معرکہ آرائی کی کوئی تفصیل اور گولی لگنے کے واقعے کا تو ذکر نہیں ہے لیکن انھیں شہید لکھا ہے اور ان کی جدائی کے غم اور فراق کے رنج والم کا ذکر موجود ہے۔ یہ نظم انھوں نے لکھ کر حکیم ضیاء الدین ساکن رام پور منیہاراں مولف رسالہ ''مونس مہجوراں'' کو دی تھی لیکن ایسی صورت میں کہ یہ نظم ایک ایسی تالیف میں شامل ہو رہی تھی جو حافظ شہید کے حالات و مقامات کے تذکرے میں تھی، ضرورت ہی نہ تھی کہ اس میں موضوع علیہ فن (حلیہ نویسی یا شمائل نگاری) کے سوا حالات وسوانح یا معرکۂ شاملی کی تاریخ بیان کی جائے۔ اگر وہ ایسا کرتے اور یہ نظم اسی رسالے میں شامل ہوتی تو یہ ایک بے اصولی اور غیر فنی عمل ہوتا اور نظم کی خاص علمی اور فنی خصوصیت ختم ہو جاتی۔

حضرت نانوتوی کا حافظ ضامن شہید کے حلیے میں ایک نادر، فن کارانہ اور یادگار نظم لکھ دینا اور انھیں ''شہید'' لکھنا بھی کافی تھا۔ اس لیے کہ یہ نظم مونسِ مہجوراں ہی کا حصہ اور اس کا جزوِ لاینفک ہے۔ جس میں ایک حد تک ان کے حالات آ ہی گئے ہیں اور چوں کہ یہ نظم حکیم ضیاء الدین کی فرمایش پر لکھی گئی تھی جیسا کہ حضرت ناظم کی خاتمے کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فرمایش کا مقصد مضامین سوانح و سیرت اور شہادت کا بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اگر اس میں حافظ ضامن کی مجاہدانہ سیرت اور ان کی شہادت کی تفصیلات نہیں ہیں تو اس سے نظم کے نقص پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

خاتمے کی تحریر سے ایک اہم بات اس نظم کی تاریخ تحریر کا تعین ہے۔ مونس مہجوراں اور اس

کی تحریر کا زمانہ ایک ہی اور نظم کی تاریخ اس سے پہلے قرار پاتی ہے۔ مونس مہجوراں کی تحریر سے مولف ۵ اگست ۱۸۶۷ء کو فارغ ہوئے تھے۔ یہ بہتر صفحے کا رسالہ یقین ہے کہ چند ماہ میں مکمل کرلیا ہوگا۔ اس لیے ''حلیہ شریف'' کے زمانہ تحریر کو بھی ۱۸۶۷ء سے پہلے نہیں لے جایا جاسکتا۔ اگر غور کریں تو یہ نظم ہی حضرت حافظ محمد ضامن پر پہلی قلمی کاوش ثابت ہوتی ہے۔

نامناسب نہ ہوگا کہ ان کی نظم حلیہ شریف کی فنی حیثیت، ادبی شان اور شاعرانہ خصوصیات پر بھی ایک طایرانہ نظر ڈال لی جائے۔ یہ طویل نظم ''حلیہ شریف'' کے عنوان سے مونس مہجوراں کے شروع ہی میں شامل ہے۔ اس میں حضرت ناظم نے حافظ محمد ضامن شہید کے شمایل ظاہری و معنوی کو نہایت خوبی اور فن کاری سے بیان کیا ہے۔ یہ ایک نادر اور شاہ کار نظم ہے۔ شاعر نے اس میں انسانی جسم کے اعضا و جوارح کے ظاہری حسن اور خوبیوں کو تصوف کی زبان و اصطلاحات اور استعارات کے ذریعے ان کے معنوی محاسن کی گہرائی تک بیان فرمایا ہے۔ حقیقت حلیہ شریف کے بارے میں مولف مونس مہجوراں لکھتے ہیں:

> ''اے مشتاقانِ لقا و اے محبانِ باصفا! یہ حلیہ شریف حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ کا بعینہٖ لکھا گیا ہے۔''

اس کے مطالعے سے شاعر کے زبان پر عبور، قدرت کلام اور حسن بیان کے علاوہ سلوک و تصوف میں ان کے خاص ذوق اور طریقت میں ان کے مقام کا پتا چلتا ہے۔

یہ نظم حضرتِ ناظم کی ''بیاض یعقوبی'' میں موجود نہیں۔ مولانا محمد نسیم فریدی امروہوی نے ''مونس مہجوراں'' پر اپنے مضمون مطبوعہ ماہ نامہ ''تذکرہ'' دیوبند بابت ماہ نومبر ۱۹۶۱ء میں اس نظم کے منتخب ستائیس (۲۷) شعر نقل کیے ہیں۔ ان کا ماخذ یہی رسالہ ہے اور فریدی صاحب کے مضمون سے یہی اشعار محمد انوار الحسن شیر کوٹی نے اپنی تالیف ''سیرت یعقوب و مملوک'' میں پیش کر دیے ہیں۔ مونس مہجوراں میں یہ مکمل نظم چھپی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا ماخذ اس نظم کا خاکسار کے علم میں نہیں۔ اس لیے یہ کہنا شاید خلافِ حقیقت نہ ہو کہ مولانا امداد صابری کی مرتبہ اس کتاب (سردارِ شہیداں جس میں صابری مرحوم نے یہ رسالہ نقل کیا ہے) کے محدود حلقہء قارئین کے سوا شایقین اور اصحابِ ذوق کی نظر سے یہ مکمل نظم نہ گزری ہوگی۔

نظم کے شروع میں اور اس کے انتہا پر ابتدائیہ و اختتامیہ ہے۔ ابتدائیہ مولف رسالہ حکیم ضیاء الدین کے الفاظ میں اور اختتامیہ حضرت ناظم کے قلم سے ہے۔ ذیل میں یہ مکمل نظم ابتدائی اور اختتامی تحریرات کے ساتھ پہلی بار رسالے سے الگ شایع کی جارہی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

حلیہ شریف

شربت اول در بیان حلیہ شریف حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ نظم کیا ہوا جناب حافظ حاجی مولانا محمد یعقوب سلمہ اللہ تعالیٰ نانوتوی کا۔ خلیفہ جناب فیض مآب، ہادیِ زمان، رضائے گمراہان، وسیلہء دو جہاں، رئیس الاولیاء، قطب مدار حاجی، حافظ حضرت شیخ امداد اللہ علیہ الرحمہ کے ہیں، لکھتا ہوں۔

ان اوراق میں بعض جگہ لفظ جمع کا لکھا جائے گا، سو وہ انھیں دونوں برادرانِ طریقت اور پیشوایانِ راہِ حقیقت سے مراد ہے۔ ادام اللہ فیوضہما:

روح القدس کا اب سے نہ کیا ہم صفیر ہوں
میں شرح سازِ حلیۂ پیرانِ پیر ہوں

گردوں سنا اس اپنے بیانِ فصیح کو
تو طالبانِ شیخ کا میں دستگیر ہوں

حلیۂ پاک ان کا لکھے ہے قلم
ہیں ید قدرت کی جو نادر رقم

جن کا جہان میں نہیں کوئی نظیر
مرشد آفاق ہیں پیرانِ پیر

قطب زمان حافظ ضامن شہید
دید نظیر ان کی نہیں اور شنید

کیا کہوں مثل اس کے کوئی بھی نہیں
ایسا نہ دیکھا نہ سنا ہے کہیں

صورت و سیرت میں وہ سب سے بینہ
حضرتِ فاروق کی بالکل شبیہ

قامتِ موزوں ہے جو طوبا مثال
اس کی صفت ہو گئی لکھنی محال

قد ہے وہ اسلام کا قائم علم
جس کے ہوئے سر پہ مہ و مہر خم

دیں کی بنا کا ہے وہ قایم ستون
سروبھی ہو آ کے جہاں سرنگوں

قد متوسط، ہے نہ کوتہ نہ دراز
سامنے جس کے کرے طوبا نیاز

چہرۂ پر نور کا عالم ہے اور
چاہیئے یاں دیدۂ حق بیں کو نور

نورِ خدا اس میں نظر آئے ہے　　سامنے کیا برق ہو، شرمائے ہے

چہرۂ پر نور میں یوں ہے دمک　　نورِ تجلی کی ہو جیسے چمک

چاند کہاں، چہرۂ نیکو کہاں　　چشم کہاں نرگس جادو کہاں

سحر کہوں اس کو تو اعجاز ہو　　سازِ سخن اس میں سخن ساز ہو

گر کہوں فتنہ تو ادب سے ہے دور　　شرم سے بادام نہ آدمی حضور

چشم نہیں نسخ کا یہ صاد ہے　　صلِ علیٰ کیا عجب ایجاد ہے

بندۂ بے دام ہے بادام واں　　صاد ہے یا صلِ علیٰ کا نشاں

جس پہ کہ ایک بار پڑے وہ نگاہ　　وہ بنے کندن جو ہو قلب سیاہ

اس کی نگہ لطف بھی قہر ہے　　شہد عنایت بھی یہاں زہر ہے

لینے وہ پہنچائے خدا کے یہاں　　یعنے کہ وہ رہ جائے وہاں کا وہاں

کھب گئی ہے دل میں وہ نوکِ مژہ　　کر گئی اندھیر وہ چشم سیہ

سرخیِ چشم اُس کی جو یاد آئے ہے　　آنکھوں سے یاں خون ہی بہہ جائے ہے

یاد میں حق کی وہ اُدھر چشم نم　　اور ادھر ہم پہ یہ تازہ ستم

روتے ہیں محرومی پہ بس زار زار　　خوب دکھلائی ہمیں غم نے بہار

ہیچ نظر میں ہو جہاں ماسوا　　ہم سے غریبوں کا وہاں کیا پتا

ابروے خمدار بعینہ کمان　　نقشۂ محراب زمین و زمان

عرش پہ چوں قاب ہے قوسین کا　　ماتھے پہ یوں ابرو ہے جلوہ نما

سر نہ جھکے اس کے تو معنی ہیں کیا　　ہو جدھر ابرو کا اشارہ تیرا

قبلۂ حق کعبۂ عالم ہے یہ　　تیغِ قضا ابروے پرخم ہے یہ

اس کی طرف سب کا ہے سر جھکا　　اس کے اشارے میں دو عالم فنا

ابروؤں میں جو تھی پیوستگی　　اس میں ہے ایک اور ہی دل بستگی

یعنی کہ ہر فن میں ہے ہر ایک طاق　　اس لیے کہتے ہیں کہ ابرو میں طاق

ان کے محاسن میں یوں چمکے عذار　　شعلہ کے جوں دودِ سیہ میں بہار

ابر سیہ میں سے چمکتی ہے برق
آخر شب کے ہے مگر سمت شرق

دو لب نازک ہیں دو گل برگِ تر
جن میں چمکتے ہیں دو سلک گہر

موجِ تبسم نے یہ عالم کیا
گوہر و مرجان کو بے دم کیا

موتی چنے درج ہیں یاقوت کے
بطن میں پردین ہے یاقوت کے

لطف تبسم کا ہے لولو غلام
حلقہ بگوش اس کا ہے یاقوت نام

یا ہے ستاروں کی شفق میں بہار
یا کوئی جنت کا ہے خنداں انار

ایسی فصاحت کے وہ کرتے کلام
جس کے ہوں الفاظ لطیفہ تمام

بات ہی کیا بات' پر اسرار ہے
بات ہے یا مطلعِ انوار ہے

رمز و کنایہ سے لطیفوں سے پر
جیسے مرصع ہو کوئی سلک دُر

لطف سے سبحاں سے جو ہوں ہم کلام
بات میں ایک ان کا بنے وہ غلام

محو تجلی ہوں کہیں گر خموش
کس کے رہے تاب' رہیں کس کے ہوش

صورتِ دیوار مخاطب بنے
اپنی کہے اور نہ کسی کی سنے

ہیبت حق کا ہے سراسر ظہور
دم ہی نہ مارے کوئی اُن کے حضور

قہر سکوت اور تکلم غضب
محو ہیں سب مست' عجب در عجب

بات کرے تاب ہے کس کی مجال
دم ہی وہاں مارنا پھر ہے محال

لطف و عنایت سے تھے گستاخ سب
ہیبت حق ہوئی ہے ولیکن غضب

بینی ہے یا موجہء دریائے نور
تیغ ہے یا شعلہ زنانِ شمع طور

صفحہء رُخ پر ہے یہ سیمیں الف
یعنی کہ یکتائی سے ہے متصف

یا ہے یہ انگشت تہی ماہ پر
جس کے اشارے سے ہے شق القمر

یا یہ حباب آ کے بنا نور کا
شعلہ اُٹھا یہ کہ کوئی طور کا

پاس سے انفاس کے ہر دم مدام
فرۂ بینی کو نہیں ہے قیام

فرہ بینی کو یہ ہے اضطراب
شعلہء آتش یہ ہے ماہی کباب

پشت پہ لب کی ہے وہ خط کی بہار
صفحہء یاقوت پہ خطِ غبار

یاں خط یاقوت کی کیا تاب ہے
صحف رُخ صفحۂ مہتاب ہے

ایسے محاسن ہے کہ چہرہ کا نور
ہر بن موئی رکھے جس کے ظہور

بالوں سے یوں نور تجلی دکھائے
مہر کا نور ابر سے چھن چھن کے آئے

بال نہیں تارِ بریشم سیاہ
لپٹے ہے ریشم میں گویا کوئی ماہ

سنبل تر سامنے جس کے خجل
بلکہ بنفشہ بھی رہا پا بہ گل

گوش ہے وا سننے کو آواز کن
چھائی ہے ہر آن وہی ایک دُھن

کان میں اب تک ہے خطابِ الست
لفظِ بلٰی لب پہ ہے سرشار مست

سننے کو یوں سنتے ہیں سب کا بیان
پر وہی سنتے ہیں جو ہے بر زباں

دھیان میں ہیں جس کے وہی سنتے ہیں
اور کسی کی وہ کوئی سنتے ہیں

ہے صدفِ گوہر اسرار کان
مثل گل تر ہے شگفتہ عیان

چہرے پہ چیچک کے جو دیکھو نشاں
قطرۂ شبنم گل تر پر عیاں

یا یہ ستارہ ہیں کوئی، نور کے
یا کہ شرارے کہو کوہ طور کے

چمکے ستارے سے رُخِ ماہ پر
ذرّے سے خورشید پہ آئی نظر

کیا کہوں ایسی ہے وہ گردن بلند
زُلف کی پہنچے نہ جہاں تک کمند

یا یہ صراحی ہے ڈھلی نور کی
کوثر و زمزم سے لبالب بھری

قلقل مینا کا ہوا بند دم
جبکہ صراحی کا یہ ٹھہرا قدم

عشق الٰہی میں جو ہمت بڑھی
سر کو عجب طرح کی گرمی چڑھی

تاب نہ تھی سر پہ ذرا رکھیں بال
دیتے تھے سر پر سے بلا اپنی ٹال

رکھتے جو تھے ہمت شیر خدا
کرتے ادا سنت شیر خدا

دُود کی کیا تاب رُخِ مہر پر
شعلۂ طور آیا مصفّیٰ نظر

شمع بھی یاں شعلۂ بے دُود ہے
کیوں کہ تیرا نور ہی مقصود ہے

بالوں کی کیا واں نہیں بنتی تھی تاب
بلکہ کلاہ کو نہ تھی تابِ ثبات

شانۂ پر زور وہ بازو قوی
دست دراز ان کے عجب مستوی

پنجہ ہے یا یہ لکھا اللہ ہے　　وہ کفِ پر نور رُخِ ماہ ہے
ہے ید بیضا ہی کی زیبا مثال　　چیز نہ کچھ مہرؔ نہ کچھ ماہ مال
کنت یدہ ہے یہ وہی ہاتھ ہے　　یعنی آن خدا ساتھ ہے
دوستوں کے حق میں وہ دست عطا　　دشمنوں پر مظہر قہر خدا
دست سخا جیسے کہ دریا رواں　　نام نہ لوں حاتم و نعماں کا یاں
کیسے سخا مرتبہ ایثار ہے　　بلکہ کچھ اس گھاٹ سے بھی پار ہے
نعمت باطن کا خزانہ وہ دل　　آتش عشق اس میں سدا مشتعل
سینہ پر کچھ بالِ سیہ ہیں نمود　　ہیں یہ اسی آتشِ سوزاں کے دُود
سینہ کشادہ و مصفا تمام　　صحن بہشت اس کا ایک ادنا غلام
پر وہ تھا ناسوت کا ظاہر پڑا　　ورنہ تھا اس سینہ میں کیا کیا بھرا
علم لدنی سے ہے وہ سینہ پر　　گوہر اسرار سے گنجینہ پر
وہ شکم صاف ہے آئینہ ساں　　صبر و قناعت کا ہے بالکل نشاں
ایسا ریاضت سے گیا صاف ہو　　جس میں کدورت نہ رہے نام کو
یادِ خداوند میں بستہ کمر　　ہمت عالی ہوئی مشہور تر
ہمت عالی کا کروں کیا بیاں　　جس کے رہے زیرِ قدم آسماں
ایسی ترقی پہ وہ ہمت چڑھے　　یعنی کہ کونین سے آگے بڑھے
حوصلہ کیا میراؔ کروں کیا بیاں　　یہاں پہ فرشتوں کی ہے ساکت زباں
اس میں فرشتوں کا ہے کیا بند دم　　بلکہ تحیر میں ہیں لوح و قلم
پشت کی توصیف سنی ہر کہیں　　تکیہ جز اللہ کسی پر نہیں
ساق کی جب اس کی نہ ثانی ہوئی　　شمع لگن میں رہی پانی ہوئی
ناخن پا اُن کا گویا ماہِ نو　　بلکہ مہ نو بھی وہاں ہے گردِ رَو
ذرہ نہیں اس سے ٹلا ایک دم　　ایسا رہے حق میں وہ ثابت قدم
پاؤں توسط سے رہے آشنا　　جیسے تھی سب جسم کی ان کے بنا

خاکِ قدم ان کی وہ اکسیر ہے — قلب صفا ہووے یہ تاثیر ہے
چشم خرد کے لیے کحل البصر — اور دلِ عشاق کا نورِ نظر
میں جو کہا ہے یہ ہے میرا قیاس — ہے یہ اسی نور سے کچھ اقتباس
بند نہ اس جا پہ زبان کا ہے دم — بلکہ ہوئی لال زبانِ قلم
اس سے خموشی ہی مناسب ہوئی — جس کا نہ پایاں ہو کہے کیا کوئی

ایک سونو اشعار کی یہ نادر نظم اس مقام پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد شاعر کے قلم سے مرصع فارسی نثر میں ایک شذرہ (ترقیمہ) ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

ناظم ایں اشعار و منتظم ایں سلسلۂ آبدار یعقوب گمنام التماس از نظر فرمایاں بلند نظر و بندگانِ کرم گستر چناں می دارد ہر چند نظم این لالی مضامین بلند در رشتہ چنیں الفاظِ مستمند و آرایش آن رعنا درہم چو کسوتِ نازیبا پر عیب و بسا نازیبا بود و بے نمود، حسب الامر فوق الادب جسارت نمودہ و فیض بزرگان چنانچہ افاضہ فرمود کہ عروس بر منصۂ پیدائی جلوہ داد و کرسی جلوہ گری و صندلی زیبا منظری بلند نہاد۔ وللہ الحمد! امید از نظارگیاں روشنی پسند و پسندیدگانِ بارگاہِ ارجمند چناں چہ اگر بلفظے یا مضمونے یا بندشے یا مصرعے یا بیتے حسب الوقت لذت می شود و ذوق افزا گردد، ایں از ہمہ دور تر را بیاد نزدیک دور از یاد نفر مایند۔ و با امدادِ ادعیہ با امداد کہ امید ہا بداں بستہ مدام باد۔ ایں اُمیدوار فرمایند و با خالق کریماں منظورِ نظر اہل نظر باد و از دیدۂ نادیدہ کج طبعاں مستر دباد

مرثیۂ وحشت انگیز بہ یاد

حضرت حافظ محمد ضامن شہید معرکۂ شاملی ۱۸۵۷ء

از قلم حقیقت رقم

قاسم العلوم حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ

''مونسِ مہجوراں'' میں حضرت قاسم العلوم مولانا نانوتوی کی ایک اہم اور تاریخی نظم شامل ہے۔ پینسٹھ اشعار کی یہ نظم ایک مکمل مرثیہ ہے۔ یہ نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس میں بعض ارکان مرثیہ بھی ایک ترتیب سے موجود ہیں اس لیے ہیئت وفن کے لحاظ سے بھی اس کی حیثیت مسلّم ہے۔ اس میں تمہید ہے، گریز ہے، حضرت ضامن شہید کا نام لے کر اُن کے مقام ومنزلت کا بیان ہے۔ پھر ان کے فراق میں رنج والم کی شدت کا اظہار ہے۔ دنیا میں اپنی اور جنت میں ان کی زندگی کا موازنہ ہے۔ بغیر موت ملاقات ودیدار کے عدم امکان کا ذکر ہے اور آخر میں حضرت ضامن شہید ہی کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونے اور جنت میں ان سے لطف ملاقات اور حسرتِ دیدار کی دعا کرتے ہیں۔

یہ نظم انھوں نے مولف ''مونسِ مہجوراں'' حکیم ضیاء الدین کی فرمایش پر لکھی تھی اور اس میں انھی کے جذباتِ عشق اور رنج والم کی ترجمانی کی ہے۔ اگرچہ جذبات ان کے بھی یہی ہیں لیکن وہ اپنی ذات کو بیچ میں نہیں لائے۔ اس اسلوبِ بیان سے مولانا امداد صابری کو شبہ ہوا کہ یہ مرثیہ لکھ کر انھوں نے حکیم ضیاء الدین کو دے دیا تھا کہ وہ اسے اپنے نام سے رسالے میں شائع کرلیں۔ مجھے اس شبہے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مولف مونس مہجوراں لکھتے ہیں:

''اس قدر ہجومِ مضامین غم دلِ مہجور کو گھبراتا ہے کہ سینہ امڈ آتا ہے۔ چاہتا ہوں کہ تمام دفتر بیانِ غم اور ذکر حسرت والم سے بھر دوں۔ مگر بے مایگی

کے باعث جو کچھ دل پر گزرتا ہے زبان و قلم سے ادا نہیں ہوتا اور دل مضطر کے بہلانے کو ذکر محبوب ضروری ہے۔ اس لیے اپنے کلام کو چھوڑ کر حاصل مطلب فکر مطلوب سمجھ کر اور نیز کیفیت سمجھنے کے لیے قصیدۂ درد آمیز اور مرثیۂ وحشت انگیز نظم کیا ہوا معظمی جناب حافظ حاجی مولانا محمد قاسم سلمہ اللہ تعالیٰ نانوتوی کا کہ خلیفہ خاص جناب حاجی امداد اللہ صاحب قبلہ سلمہ اللہ تعالیٰ کے ہیں، لکھا جاتا ہے تاکہ اہل دل کو سوزِ درونی اور رنج مفارقتِ مخلصانِ مہجور کالعدم ہو، وہ بہ چشم غور و محبت دیکھنا چاہیے کہ کیا مضمونِ پریشان کو انتظام دیا ہے۔''

زبان اس مرثیے کی بہت سادہ، رواں اور دہلی کی بول چال کی عام زبان ہے۔ فراق و جدائی میں رنج و غم کے مضمون کو طرح طرح سے بہت خوبی اور کمال سے ادا کیا ہے۔ عربی و فارسی کے مشکل الفاظ، غریب تراکیب اور تشبیہات و استعارات سے طرز بیان کو حسین و رنگین بنانے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ اس کا سارا حسن زبان کے عام فہم ہونے اور اس کی سادگی و سلاست میں ہے۔

یہ مرثیہ حضرت قاسم العلوم کے مجموعۂ کلام ''قصاید قاسمی'' میں مونسِ مہجوراں ہی سے نقل کیا گیا ہے لیکن اس کا ایک شعر نقل میں نظر انداز ہو گیا ہے۔ شعر یہ ہے:

قدم عشق بیاباں ان دنوں مجھ کو ضروری ہے
عداوت ہاتھ تجھ کو چاہیے جیب و گریباں سے

حضرت قاسم العلوم کے نادر افکار کا مجموعہ اور حضرت ضامن شہید کے فراق میں رنج والم کے مضامین میں یادگار مرثیہ یہ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

نہ پوچھو ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم اپنی اس قدر جاں سے
ہمیں پالا پڑا ہے اب کے غم ہائے فراواں سے
کہیں سے مول لا دے، دل مجھے کچھ اور اے ہم دم
کہ اُٹھنے کا نہیں بارِ غم اس قلب پریشاں سے

غبارِ دل کی حاجت ہے غم سالارِ خوباں میں
مرے سینے کو بھر دو چیر کر ریگ بیاباں سے
رہِ دو چشم موجِ خون کو کافی نہیں ہوگا
کوئی مشق مرا تن چھان دے تیروں کے پیکاں سے
غمِ جاناں میں ہم کو ان دنوں رونا ضروری ہے
طلب کر اب کے نوبت چشمِ پر آب ابر باراں سے
قدم عشقِ بیاباں ان دنوں مجھ کو ضروری ہے
عداوت ہاتھ تجھ کو چاہیے جیب و گریباں سے
ہجومِ صدمۂ جاں کاہ ہر صبح و مسا اب کے
تقاضا ماتم غم کا کرے ہے جن و انساں سے
چھپا آنکھوں سے وہ نورِ مجسم خاک میں جا کر
کہ جس کا خالِ پا بہتر تھا اس مہر درخشاں سے
شہید راہِ حق حافظ محمد ضامن چشتیؒ
بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق و عرفاں سے
بچھاتے تھے ملائک بال و پر پاؤں تلے جن کے
لٹائے خاک میں ان کو عجب ہے چرخ گرداں سے
پریشاں ہو گیا دل صدمۂ اول میں کیا کیجئے
بہا تھا اشک کی جا لخت دل اس چشم گریاں سے
فراقِ یار میں کر فکر جاں کچھ اے دلِ ناداں
کہ اب کے برسر پر خاش غم آیا ہے ساماں سے
مدد کر صبر کچھ اب کے دلِ مضطر کے ہاتھوں سے
نظر آتا ہے غم میں ہاتھ دھو بیٹھیں گے ہم جاں سے
کشش نے عشق حق کی ان کو علیین میں کھینچا

رہے ہم سر پٹکتے ہجر میں ان کے کہتاں سے
فراقِ یار میں جینا تعجب ہے ولے ہمدم
اجل سے اُٹھ سکے شاید نہ ہم بارِ گناہاں سے
فراقِ یار میں ہر دم ہمارا حال ابتر ہے
مدد کرنا اجل فریاد کرتے ہیں گے سجاں سے
نہیں معلوم کیوں ہے اس قدر شوقوں کی بے تابی
وہ آئیں اپنے ویرانے میں یہ باہر ہے امکاں سے
وصالِ یار ممکن ہی نہیں نادان! جیتے جی
تو پھر بے تاب کیوں ہوتا ہے اے دل شوق پنہاں سے
تسلی ہمدمو! تاروں کے گننے سے نہیں ہوتی
کہ اس خورشید رُو کی یاد میں ہم ہیں گے غلطاں سے
قریبِ یار ہم کو دفن کرنا ورنہ محشر تک
صدائے نالۂ شوق آئے گی گورِ غریباں سے
کروں ہوں یاد ایامِ گذشتہ اور نہیں کرتا
کہ حسرت کے سوا کچھ ہاتھ آئے گا نہ ارماں سے
مزے لوں شوق کے، یا دفعِ غم دل سے کروں یارب
نہیں ہوتے یہ دو کام ایک دم میں مجھ سے حیراں سے
دل بے تاب کے ہاتھوں سے تنگ آیا ہوں ہجراں میں
نہ چپکے ہی بنے ہے اور نہ کچھ ہوتا ہے اُفغاں سے
کرے ہے تنگ شوقِ یار کیا صورت کروں یارب!
کہ یہ جانِ حزیں ہم بزم ہو اس جانِ جاناں سے
نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو
سنیں گے پھر بھی وہ آواز ان لب ہائے خنداں سے

تو اے یادِ عنایت ہائے دلبر اب تو لے بس کر
بہت سے رو چکے ہم حسرت و افسوس و حرماں سے
ہمیں یاد آئے ہے کچھ اور یاں ان کی تسلی سے
مرض بڑھنے لگا قسمت سے اپنی اور درماں سے
ہوا عالم سیہ آنکھوں میں اپنی بے رُخِ جاناں
نظر آئے مہ و خورشید کالے تا بہ...... تاں سے
اگر ہو وصل مر کر اور علاجوں سے رہوں زندہ
تو یارب آشتی ہو جا اجل کی آبِ حیواں سے
اجل ہم شوق جاناں میں تجھے جاں دیں تو پھر نہ لے
نہ ہو ایسا کہ پھر آنا پڑے ہم کو یہاں واں سے
ملیں گے پھر بھی یارب ہم یہ آنکھیں ان کے تلووں سے
تھمے گا بھی کبھی لوہو کا ٹپکا اپنی مژگاں سے
بحکم اتباعِ شوق یار آئیں ہم عاصی بھی
اگر گھسنے دے کوئی پوچھ دو جنت کے درباں سے
کسی کا کیا گیا پر رنجِ فرقت کی مصیبت کو
کوئی جا کر کے ٹک پوچھے ضیاء الدین نالاں سے
ہوئی ہم سے خطا یا تھی کشش حب الٰہی کی
کوئی پوچھے سبب رحلت کا اُس سالار خوباں سے
گناہوں کے سبب گر ہم نہیں تھے لائق صحبت
تو ہم کو بخشوا لینا تھا کچھ کہہ سن کے رحماں سے
اگر ممنوع تھا ہم سے گنہ گاروں کا لے چلنا
تو تنہا اس طرح جانا بھی نازیبا تھا سلطاں سے
اگر قاصد مجھے کوئی وہاں تک کا بہم پہنچے

تو کہلا کر کے بھیجوں یوں میں اس سالارِ نیکاں سے
مبارک ہو تمھیں وصلِ خدا خلد بریں میں پر
ہمیں یوں چھوڑ کے تنہا تمھیں جانا نہ تھا یاں سے
نشاطِ خلد میں گر یاد آ جائیں کبھی ہم بھی
تو آ کر دیکھنا پہنچے ہیں کس درجہ کو ہجراں سے
غم فرقت میں یہاں گزرے ہے پر کچھ بن نہیں پڑتی
تمھیں فرصت نہیں واں لذتِ دیدارِ یزداں سے
بھروسے کس کے چھوڑا آپ نے ہم سے غریبوں کو
دیا تھا دل تمھیں، کچھ یاد ہے کس عہد و پیاں سے
بنے تھے یوں تو ہم روزِ ازل سے غم اُٹھانے کو
نہ تھی پر یہ خبر ہوں گے الگ بھی تیرے داماں سے
رہیں تنہا ہم اور تم چل بسو قسمت میں یوں ہی تھا
بجز افسوس بن پڑتا نہیں کچھ اس پشیماں سے
تمھارے ہجر میں جانِ جہاں کچھ بن نہیں آتا
دلِ حسرت زدہ گھبرائے ہے سیر گلستاں سے
غم دُوری میں مرنا سہل تھا پر تیرا کہلا کر
گنہ لے کر خدا کے رُوبرو جاؤں کس عنواں سے
دلِ مایوس کی صورت نہیں کوئی تسلی کی
مگر ہاں! سر نکالو تم اگر گنجِ شہیداں سے
تمھاری بزمِ پر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو
تو اک شعلہ سا اُٹھے ہے ہمارے قلب سوزاں سے
نہ پوچھو گے کبھی مڑ کر کے یوں ہم سے غریبوں کو
گماں کب تھا ترے فضل و کرم اور لطف و احساں سے

خبر لے جلد اپنے کشتگانِ عشق کی شاہا!
قریب مرگ پہنچے ہیں غمِ بے حد و پایاں سے
تمھیں مشکل نہیں اب تک بھی کچھ اپنی خبرداری
شہیدوں کی حیات اور زندگی ثابت ہے قرآں سے
نہیں تم دُور ہو پوشیدہ جاں سے مثلِ جاں تن سے
وگرنہ دُور ہوتی ہیں کہیں ارواح ابداں سے
ہمارے قبلہ و کعبہ تمھیں ہو دین و دنیا میں
اگر تم سے پھریں، حق سے پھریں اور اس کے فرماں سے
تمھاری خاکِ پا اپنے لیے کحل الجواہر ہے
ترے کوچے کے ذرّے ہیں ہمیں خورشیدِ تاباں سے
غلامی سے تری نسبت نہیں جاہِ سکندر کو
ترے کوچے کی ذلت ہے زیادہ عز شاہاں سے
ترا در مطلعِ صبح سعادت ہم سمجھتے ہیں
ترے کوچے کو بڑھ کر جانتے ہیں خلدِ رضواں سے
ترا سایہ ہو جس پر اس پہ ہو اللہ کا سایہ
خدا راضی ہو تو راضی ہو شاہا جس مسلماں سے
مدد کر غوثِ اعظم بے کسوں ہم سے غریبوں کی
چھڑائے غیر تیرے کون دست نفس و شیطاں سے
پڑا پالا مجھے شیطان سے دشمن سے جیتے جی
ڈروں ہوں دے نہ وقتِ مرگ وہ میرے تئیں جھانسے
ملاذ من مناسب کب ہے شیطانِ لعیں ہم دم
ترے خادم کو یوں دامِ غرور و مکر میں پھانسے
خبر لینا ہماری اے شہ دنیا و دیں جلدی

کہ ہے گا برسرِ کیں نفس، اس ننگِ غلاماں سے
اسیرِ نفس ہوں کوئی نہیں صورت رہائی کی
نظر اک تیری جانب ہے فقط سب اہل دوراں سے
پکڑنا ہاتھ میرا شمع نور احمدیؐ جلدی
کہ رہ ملتا نہیں مقصود کا ظلماتِ عصیاں سے
عنایت سے تری اب بھی توقع ہے مجھے شاہا!
کہ پہنچوں تیری خدمت کے لیے جنت میں آساں سے
خدایا! ناتواں ہوں بارِ عصیاں اُٹھ نہیں سکتا
سفر عقبا کا اس پر آ لگا دنیائے ویراں سے
بحق شیخ دیں حافظ محمدؒ ضامنِ چشتیؒ
ضیاء الدین جاوے اس جہاں سے یارب ایماں سے

لائل محمڈنس آف انڈیا

از سید احمد خان صدر الصدور مراد آباد

سر سید احمد خان کی تالیف ''رسالہ خیر خواہ مسلمانان'' اردو اور انگریزی دو زبانوں میں ہے۔ داہنے کالم میں اردو اور بائیں کالم میں انگریزی ہے۔

عکسی اشاعت (مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ) اور منقولہ اشاعت (مجلس ترقی ادب لاہور) سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ''خیر خواہِ مسلمانان'' کی ترکیب اضافی ہے یا توصیفی؟ دونوں صورتوں میں معنی کا زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر بہ صورتِ ترکیب توصیفی ''خیر خواہ'' مسلمانوں کی صفت ہے تو سوال یہ ہے کہ ان کی خیر خواہی کا اشارہ کس طرف ہے؟ مسلمانوں کی خیر خواہی یا انگریزی حکومت کی؟ خیر خواہی کا مرجع کون ہے، یہ بات واضح نہیں ہوتی۔ البتہ اگر یہ ترکیب اضافی ہے تو مطلب واضح ہے کہ یہ رسالہ مسلمانوں کا خیر خواہ ہے یا اس میں موضوع علیہ شخصیات کے اعمال مسلمانوں کی خیر خواہی کے جذبات پر مبنی تھے یعنی خیر خواہی رسالے کی صفت اور اس خیر خواہی کا مرجع اور مشار الیہ مسلمان ہیں۔

چوں کہ ملک کے عوام و خواص کی اکثریت نے یہ کبھی تسلیم ہی نہیں کیا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں جنھوں نے انگریزی حکومت کا ساتھ دیا تھا وہ ملک اور اہل ملک کے بہی خواہ تھے اور اب تو کسی استثناء کے بغیر ہر طبقۂ ملک نے اور ہر مکتبۂ فکر نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ ''ہنگامۂ غدر'' نہیں ''جنگ آزادی'' تھا۔ ہندوستان سے پاکستان تک سر سید مرحوم کے ماننے والوں نے بھی اسے مان لیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں سر سید کے غلامی مسلک سے رجوع کر لیا ہے اور اسی اصول پر پاکستان میں بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، سیاسی اور تاریخی و علمی انسائیکلوپیڈیا ز تالیف کی گئی ہیں۔ اسی اصول پر معاشرتی اور سائنسی علوم کے نصابات اور تاریخیں مرتب کی گئی ہیں جو ابتدائی اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک پڑھائی جاتی ہیں۔

تاریخ میں اور جاسوسی کے اعمال میں مورخ اور جاسوس کے اخلاص اور نیت کو نہیں دیکھا

جاتا بلکہ اس کے مجرد عمل پر نظر کی جاتی ہے کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں اگرچہ اسمگلنگ، بلیک مارکیٹنگ، اشیاء کی قیمتوں کو مرضی کی حد تک بڑھانے، شرح سود کو بڑھانے یا گھٹانے، دودھ میں پانی ملانے کے جواز کا فتویٰ دے دیا گیا لیکن جاسوسی کے اعمال اور فلسفہ تاریخ میں ابھی اس قسم کا فتویٰ جاری نہیں ہوا۔

ہندوستان میں زمینداریوں، جاگیروں کی ضبطی اور ریاستوں کے نظام سے راجوں، مہاراجوں، نوابوں کے انخلا کے فلسفے میں ایک بہت بڑا محرک یہی نظریہ تھا کہ جن لوگوں نے انگریزی حکومت کے قیام واستحکام کے اعمال انجام دے کر اور اسی استعمار کی خدمت کے نتیجے میں جاگیریں بنائی ہیں، وہ ضبط کی جائیں اور اصولاً واولاً ان کے اصل مالکان کو کم از کم ان کی ضرورت کے مطابق واپس کی جائیں۔ اگر اُن کی تلاش ممکن نہ ہو یا نفاذِ فیصلہ کی مشکلات کی بنا پر ممکن نہ ہو تو قابضین کی ضرورت (ایک خاص حد تک) سے زیادہ زمین و جاگیر کو ان کے عاملین یا عوام —— کاشت کاروں وغیرہ میں تقسیم کر دیا جائے۔

پاکستان میں یہ فلسفہ ابھی تک تحریک کی صورت اختیار نہیں کر سکا، نہ عمل درآمد کی منزل تک پہنچ سکا ہے لیکن فتویٰ یہی ہے کہ تعزیرات ہند کی طرح وقت کی کوئی خاص اور طویل سے طویل مدت گزر جانے کی وجہ سے کسی شخص کا حق ساقط نہیں ہو جاتا ہے۔ اسی اصول کی بنا پر ایک دو جماعتوں کے سوا پاکستان کی تمام جماعتیں زمین داریوں، جاگیروں کی ضبطی کی حامی ہیں اور زمین داریوں اور جاگیروں کے محدود کر دینے کے اصول سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ مولانا مفتی محمود نے جو پاکستان میں دیوبندی مکتبۂ فکر کی دینی، سماجی فکر اور سیاسی تاریخ وروایات کے امین اور ترجمان ہیں، اپنی جماعت جمعیت علمائے اسلام کے اہم مقاصد میں زمینداریوں اور جاگیروں کے خاتمے کو شامل کیا ہے۔

انگریزی میں ''رسالہ خیر خواہِ مسلمانان'' کا نام ''لائل محمڈنس آف انڈیا'' ہے یعنی ''ہندوستان کے وفادار مسلمان'' اور ظاہر ہے کہ وفاداری کا تعلق انگریزی حکومت سے تھا۔ اس لیے اس کا بالکل صحیح نام ''انگریزوں کے وفادار ہندوستانی مسلمان'' ہوا۔ اس کا اردو نام نہایت مغالطہ آمیز ہے۔ اس سے ہند مسلمانوں کی انگریزی حکومت سے وفاداری کے بجائے

مسلمانوں سے خیرخواہی کا مغالطہ پیدا ہوتا ہے اور یہ حقیقت کے قطعاً خلاف ہے۔

یہ سرسید کا ایک یادگار رسالہ ہے تعجب ہے کہ روہیل کھنڈ سے اور شمال مغربی اضلاع یوپی و دہلی میں مرحوم کو صرف اکیس اور بہ شمول خود بائیس وفادار ملے جب کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے والے لاکھوں میں تھے۔ ہزاروں کی کئی دھائیوں میں تو سولیوں پر لٹکا دیے گئے تھے اور گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے تھے۔ معلوم نہیں مسلم لیگ کے سوادِ اعظم کے مسلک والے اس کی کیا تاویل کریں گے؟ یوپی کی کروڑوں کی آبادی غدار یہ کل بائیس افراد وفادار اور ''خیرخواہ مسلمانان'' تھے؟

اہل شوق نے محبان وطن اور جان نثاران حریت کے ذکر سنے اور حالات پڑھے ہیں سر سید کے ان وفاداران ازلی کے کارناموں کا مطالعہ کرنا چاہیں تو رسالہ خیرخواہ مسلمان موجود ہے ہم یہاں صرف ان کے نام درج کیے دیتے ہیں۔

۱-لائل محمڈنس آف انڈیا (حصہ اول): ۱۸۶۰ء موفیسی لائٹ (دیباچہ) پریس میرٹھ

سرسید احمد خان...... مصنف اس کتاب کا	۱۱
زکریا خان (رام پور)	۳۶
عبداللہ خان (رام پور)	۴۱
علی محمد خان (رام پور)	۵۲
محب اللہ خان (رام پور)	۵۳
سیف اللہ خان (رام پور)	۵۴
اللہ یار خان رام پوری	۵۴
محمد خان رام پوری	۵۴
عبدالکریم خان رام پوری (شاہجہان پوری)	۵۴
سید نور خان (ساکن امریا ضلع پیلی بھیت)	۵۴
غلام ضامن	۵۵

نوٹ: مجلس ترقی ادب لاہور کے سلسلہ مقالاتِ سرسید کی جلد ہفتم میں جو رسالہ ''لائل محمڈنس آف انڈیا'' شامل ہے اس کا نام حالات خیر خواہان مسلمانان'' ہے۔

مطالعہ مثنوی تحفۃ العشاق

ذکر حافظ محمد ضامن شہیدِ معرکہء شاملی

''کلیاتِ امدادیہ'' میں ایک مثنوی تحفۃ العشاق نامی عشق حقیقی کے مقامات و فضایل، معارفِ سلوک، اسرارِ طریقت اور نکاتِ تصوف سے معمور نہایت موثر منقول و مشمول ہے۔ مثنوی مولانا رومؒ کے درس میں حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ العزیز نے ایک حکایت دل چسپ بیان فرمائی۔ درس کے سامعین نے اسے ضبط تحریر میں لانے کی افادیت میں اپنے یقین کا اظہار اور حضرت مدرس اعلی اللہ مقامہ کے خواجہ تاش اور برادرِ طریقت حضرت حافظ محمد ضامن شہید مرید و خلیفہ اعلیٰ حضرت قبلہ نور محمد جھنجھانوی نور اللہ مرقدہ کا اصرار اس مثنوی کی تحریر کا سب سے بڑا محرک ہوا۔

تحریر مثنوی کا عزم اگرچہ حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے سکونت ہندوستان کے زمانے ہی میں فرما لیا تھا لیکن اس وقت ان کے لیے کوئی داعیہء شدید پیدا نہ ہوا تھا۔ نیز ۱۸۵۷ء کے حوادث پیش آ جانے اور واقعہء شاملی کے سانحے کے بعد حضرت حاجی صاحب ہجرت فرما کر عرب روانہ ہوئے اور مکہء مکرمہ زادھا اللہ شرفاً دائماً ابداً میں مستقل سکونت اختیار فرمالی۔ چوں کہ معرکہء شاملی میں حضرت حافظ محمد ضامن کی شہادت کا واقعہ پیش آ چکا تھا اور حضرت شہید کی یاد حضرت مہاجرِ بلدِ امین علیہ الرحمہ کو تڑپا رہی تھی اور مثنوی کا لکھا جانا جوار حرم و مکرم اور اسی بلدہٗ شریفہ میں مقدر تھا، چناں چہ مکہء مکرمہ کی ایمان پرور فضاؤں اور بیت اللہ الحرام کے بابرکت جوار میں حضرت کی توجہ سامی سے اور بہ امدادِ غیب یہ ایمان افروز و حکمت آفریں مثنوی پایۂ اتمام کو پہنچی۔

حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے حوالے سے اس کی صرف یہی اہمیت نہیں کہ حکایت کے بیان و تحریر کے لیے حضرت حافظ صاحب محرک ہوئے تھے بلکہ اس کی اہمیت یہ بھی ہے کہ

حضرت کی شہادت کے ساتھ فیض صحبت کے انقطاع اور رنج دوری و مہجوری نے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ و اعلی اللہ مقامہ کو تڑپا دیا تھا اور عشق کے داعیہ شدید کی حدت اور رنج و الم فراق کے ابر نیساں نے دامن مراد کو اشعار کے موتیوں سے بھر دیا۔ حضرت فیض درجت حافظ ضامن شہید کے رنج فراق و ذکرِ شہادت میں پچیس اشعار کے علاوہ دوسرے بزرگانِ طریقت اور یارانِ راہِ سلوک کی مفارقت کے ذکر میں بھی تقریباً اٹھائیس اشعار یادگار ہیں، اور اس سے پہلے کہ اصل داستان شروع ہو، تیرہ اشعار گریز میں ہیں نیز شروع میں پچپن اشعار مثنوی کی تمہید میں ہیں جنھیں دیباچہ قرار دیا گیا ہے اس طرح آغاز مثنوی کے سوا سو اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

پوری مثنوی ایک دل کش ادب پارہ ہے اور سلیس اور عام فہم زبان اور اسلوب نگارش کی شگفتگی و دل آویزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ نیز اعلیٰ خیالات، بلند افکار، حکمت کے بیان، موعظت کے تذکرے، سلوک و طریقت کے اسرار اور عشق کے رموز کا ایک لازوال خزینہ اور بے مثال سرمایہ ہے۔ اس کے ابتدائی حصہ میں جو یہاں نقل کیا جاتا ہے تاریخ ملت اسلامیہ پاک و ہند کی ایک حسین داستان پوشیدہ ہے اس حیثیت میں یہ مثنوی معرکہ شاملی میں حضرت حافظ محمد ضامن اعلی اللہ مقامہ کی شہادت کا ایک اولین ماخذ بھی ہے۔ اعلی حضرت حاجی صاحب نے یہ مثنوی تحفۃ العشاق ۱۲۸۱ ہجری میں تحریر فرمائی تھی مثنوی کے آخری دو اشعار میں مثنوی کا نام اور سال تحریر رقم فرمایا ہے......

بارہ سو تھے اور اکاسی سال ہجر　　ہو چکا جب حضرت تحفہ کا ذکر

ہو چکی جب مثنوی تحفہ تمام　　تحفۃ العشاق رکھا اس کا نام

۱۲۸۱ ہجری کا سال ۶۵-۱۸۶۴ عیسوی کے مطابق تھا۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مثنوی واقعہ شہادت کے سات آٹھ سال بعد لکھی گئی تھی۔

اب میں قارئین کرام کے مطالعے میں مزید رکاوٹ بننا نہیں چاہتا۔ مطالعہ فرمایئے اور اپنے ادبی اور ملی تاریخ و سوانح کے ذوق کو تسکین دیجیے:

دیباچۂ مثنوی وذکرِ حافظ ضامن شہید

ہوگیا اے دوستو یوں اتفاق باعث تحریر نظم پر مذاق
رہتا تھا مسجد میں اپنے متصل مجمع علماء و صلحاء اہل دل
ایک دن پڑھتا تھا نفحات اُنس لے رہے تھے حق سب سب نفحات اُنس
جوش پر تھا بحر علم عارفاں ہو رہے تھے گوہر معنیٰ عیاں
حاضروں کے دل میں واں باشانِ حق کھل رہا تھا گلشن عرفان حق
اولیا کا حال سن مسرور تھے ماسوا سے محو غرقِ نور تھے
رفتہ رفتہ حضرت تحفہ کا ذکر آ گیا اس عاشق خستہ کا ذکر
سن کے ان کی شان وشوکت جاہِ عشق ہمت مردانہ اندر راہِ عشق
بول اُٹھا ہر اک بصد ذوق و سرور ہے یہ قصہ نظم کے لائق ضرور
خاص کر قطبِ زماں شاہِ وفا آفتابِ معرفت بحرِ صفا
کامل اکمل ولی بے بدل عاشق ذاتِ خدائے لم یزل
صاحب ارشاد و تلقین و سبق عاشقِ صادق شہیدِ راہ حق
برگزیدہ دو جہاں مقبول رب مشرب چشتی و فاروقی نسب
یعنی شیخ حافظ محمد ضامن آپ مجھ کو فرمانے لگے کر کے خطاب
نظم کر اس قصۂ پر درد کو گرم کر اک بار ہر دل سرد کو
مثنویاں ہیں مجازی عشق میں پر بہت کم ہیں حقیقی عشق میں
قصۂ تحفہ اگر منظوم ہو رتبۂ عشاقِ حق معلوم ہو
ریختہ میں نظم کر اس کو تمام تا کہ سمجھیں اس کو سارے خاص وعام
جان لے تا ہر کوئی بے قیل وقال عاشقانِ حق کا یہ ہوتا ہے حال
دعویٰ جو کرتے ہیں جھوٹا عشق کا ہوش میں ہوں سن کے رتبہ عشق کا
تابش گفتار عشقِ حق سے گرم ہو کے بس دل سنگ ہو چوں موم نرم
عاشقِ صادق بھی سن کر جاہِ عشق چاق اور چوبند ہو اندر راہِ عشق

جان لیں تا عشق کی سب رسم و راہ | چاہتے کو اپنے کرتا ہے تباہ
عاشقاں رہتے ہیں سر ہتھیلی پہ دھر | ہے یہ راہِ عشق نے نانی کا گھر
عشق ہے جاں اک بلائے جاں گداز | ہے ازل سے دوست کش دشمن نواز
عشق کا سب سے الگ ہے رنگ ڈھنگ | ہے ازل سے عقل میں اور اس میں جنگ
عقل چاہے ہے کہ ہو عیشِ فراغ | عشق چاہے رنج و غم سینے پہ داغ
عقل چاہے عزت و جاہ و جلال | عشق ذلت خواری و درد و ملال
عقل چاہے مال ملک و سلطنت | عشق عجز و فقر و فاقہ مسکنت
عقل چاہے عیش و عشرت خرمی | عشق درد و کلفت و رنج و غمی
عقل چاہے ہے کہ ہو شیر و شکر | عشق کہتا ہے کہ کھا خونِ جگر
عقل کہتی ہے کہ چل گلزار میں | عشق لے جاتا ہے کوئے یار میں
عقل چاہے ہے قبا وَ پیرہن | عشق کرواتا ہے سامان کفن
عقل کہتی ہے کہ کر عیش و طرب | عشق کہتا ہے کہ لے رنج و تعب
عقل کہتی ہے کہ چل بازار میں | عشق لے جا جنگل و کہسار میں
عقل چاہے دولت و سرداریاں | عشق چاہے سو بلا وَ خواریاں
عقل لے جا گلشن و گلزار میں | ڈالتا ہے عشق جلتی نار میں
عقل چاہے ہے حیا وَ نام و ننگ | عشق کو ان سے ہمیشہ سے ہے جنگ
عقل میں اور عشق میں رہتی ہے لاگ | عشق جب آیا تو جائے عقل بھاگ
ہووے حضرت عشق کا جس دم ظہور | عقل سر سے جائے اور دل سے سرور
عشق کیا ہے درد و غم کی کھان ہے | غیر دل بر کا عدو جان ہے
کیا کہوں میں عشق کی نیرنگیاں | رنج میں راحت میں کرتا ہے عیاں
نار کو گلزار کر دیتا ہے عشق | دار کو دلدار کر دیتا ہے عشق
خاک میں جس کو ملا دیتا ہے عشق | تخت شاہی پر بٹھا دیتا ہے عشق
درد میں اس کے دوا ہے سربسر | مرض میں اس کے شفا ہے سربسر

مارنا اس کا جلا دینا ہے جاں
توڑنا اس کا ملا دینا ہے جاں
رنج میں اس کے ہے گنج بیکراں
مرگ اس کی ہے حیات جاوداں
عشق کے برعکس ہیں سب کاربار
نار کو اس کے سمجھ تو سو بہار
اس کی ویرانی کو آبادی سمجھ
خار کو گل غم کو تو شادی سمجھ
کلفت و تکلیف کو راحت تو جان
فقر اور فاقہ کو سو دولت تو مان
عشق کی ذلت کو تو عزت سمجھ
خواری و زاری کو تو حرمت سمجھ
عشق کی تعریف ہو کس سے عیاں
ہے ستم میں اس کے سو شفقت نہاں
قہر صورت رحمت پنہاں ہے عشق
اور طبیب درد بے درماں ہے عشق
اول آخر ظاہر و پنہاں ہے عشق
دونوں عالم جسم ہیں اور جاں ہے عشق

رجوع بہ قصۂ تحفہ و ماتم حضرت ضامن شہید

ہے بیانِ عشق بولیں بے بدل
اب کروں ارشادِ حافظ پر عمل
ان کے فرمانے کو میں نے بے عذر
رکھ لیا سر پر سعادت جان کر
گرچہ مجھ کو شعر گوئی میں نہ تھا
دخل کچھ پر حکم کو لایا بجا
توڑنا موتی کا ہے آسان تر
نے کہ حکم بادشاہ بحر و بر
لے کے اُن کے گوہر ارشاد کو
حقۂ دل میں لیا رکھ شاد ہو
وقت فرصت دیکھنا تھا یہ کہ جو
حکم پر اُس شاہ کے تعمیل ہو
پر نہ دیتا تھا مجھے فرصت زماں
تا لکھوں اس نظم کو باشوقِ جاں
لایا اتنے میں زمانہ اور رنگ
ہو گیا کچھ اور ہی عالم کا ڈھنگ
ہو گئے بس حضرت حافظ جی شہید
شام غم ہم کو ہوا وہ روز عید
فرقتِ جاناں سے بس ہو کے بہ تنگ
جانِ جاناں پر فدا کی بیدرنگ
خوش نہ آئی اس جہاں کی رنگ و بو
چل دیے بس جنت الفردوس کو
ہم بے چاروں کو تڑپتا چھوڑ کر
سوئے حق راہی ہوئے منہ موڑ کر

وہ تو واں جامِ شہادت پی رہے / زہرِ غم کھانے کو یاں ہم جی رہے
وصل سے حق کے ہوئے وہ بہرہ ور / پیتے ہیں حسرت سے ہم خونِ جگر
ناز و نعمت میں وہ ہیں مشغول واں / خاک و خوں میں لوٹتے ہیں ہم یہاں
جام و کوثر سے ہوئے وہ لب بہ لب / چاٹتے ہیں پیاس سے ہم اپنے لب
آپ تو جا کر کیا جنت میں گھر / کر دیا سرگشتہ ہم کو دربدر
آپ تو راحت کے ساماں لے گئے / مایۂ رنج و الم یاں دے گئے
آپ تو بے رنج و غم مثلِ عروس / جا کیا تختِ شہادت پر جلوس
لے لیا عیش و طرب ناز و نعم / رکھ دیا سر پر ہمارے کوہِ غم
عیش و عشرت میں ہوئے مشغول یوں / ایک لخت ہم کو گئے بس بھول یوں
عیش نے ہم کو دیا بالکل بھلا / حقِ اُلفت اور قرابت سب گیا
دعویٰ حب و قرابت گر گیا / خواجہ تاشانی کا بھی کیا حق نہ تھا
بے خبر ہم سے اگر رہنا تھا یوں / ساتھ اپنے لے گئے ہم کو نہ کیوں
گرچہ ہم لائق نہ تھے درگاہ کے / گو بہت خادم نہ ہوں تھوڑے سہی

حسرت و غمِ مفارقت بزرگان و یاران طریقت

آہ و واویلا دریغا حسرتا / ساتھ والے چل دیے میں رہ گیا
ساتھ کا اپنے ہر اک واصل ہوا / مدعا دل کا اسے حاصل ہوا
پہنچا ہر اک منزلِ مقصود پر / رہ گیا میں ہی پڑا بس دور تر
صاف تھے جو چل دیے صاف اور پاک / مثلِ تلچھٹ رہ گیا میں زیرِ خاک
جو کہ نوری تھے گئے افلاک پر / رہ گیا سایہ کے جوں میں خاک پر
بلبلوں نے گھر کیا گلشن میں جا / بوم ویرانہ میں ٹکراتا رہا
گھر کیا قمری نے شاخِ سرو پر / جھاڑ میں لٹکی ہے چمگادڑ اِدھر
گھر کیا طوطی نے شکرستان میں / زاغ نوحہ گر ہے خارستان میں

ماہی حق نے تو لی دریا کی راہ
موش سوراخ زمیں میں ہے تباہ

شیر حق کا آہو لے عرفاں شکار
سگ ہے بہر استخواں کوچوں میں خار

جا ملا دریا سے آب سیر بار
رہ گئے خشکی کے اندر سنگ و خار

نرگس و ریحاں کو جا آہو چرے
اور شتریاں خار و بن چنتا رہے

دست شہ پر جا ملا شہباز پر
کھول پر کرگس پڑا مردار پر

مرغِ آبی نے کیا دریا میں گھر
مرغ خاکی لوٹتا ہے خاک پر

پر تھے جن کے سوئے بستاں اڑ گئے
مرغ بے پر لقمۂ گربہ ہوئے

مردِ باہمت ہوئے شہ پر نثار
ہم سے دوں ہیں نفس کے ہاتھوں میں خوار

حیف ہے صد حیف یارانِ طریق
جا ہوئے دریائے مطلب میں غریق

گوہرِ مطلوب ہر اک نے لیا
غوطہ خور میں بحرِ حرماں میں رہا

آہ صد افسوس و حسرت آہ آہ!
جا کہوں کس سے مصیبت آہ آہ!

غم کا اپنے کون ہے غم خوار آہ!
حالِ دل جس سے کروں اظہار آہ!

جو کہ تھے غم خوار اپنے چل گئے
زیر پائے رنج ہم کو مل گئے

ہو گئے وہ محوِ نعمت اس قدر
خواب میں بھی تو کم آتے ہیں نظر

دورِ ساغر وصل کے چلتے ہیں واں
آتشِ فرقت میں ہم جلتے ہیں یاں

آہ واویلا! کوئی ہمدم نہیں
جو سنے میری مصیبت کے تئیں

نے مرا ہم دم نہ کوئی غم گسار
غم مرا غم خوار ہے میں غم کا یار

دل کی دل میں رکھے چپ رہتا ہوں میں
قصۂ تحفہ کو اب کہتا ہوں میں

شروع داستان بی بی تحفہ رحمۃ اللہ

بعد مدت کے اب آئی المراد
حضرت حافظ کی وصیت مجھ کو یاد

حسبِ ارشاد ان کے میں لے کر قلم
قصہ تحفہ کا کروں یارو رقم

عشق کی باتیں سناتا ہوں تمھیں
گمرہی سے رہ پہ لاتا ہوں تمھیں

راہ اس رہ سے کوئی بہتر نہ ہو — حق سے ملنے کی سمجھ اے راہ جو
گر نہ عاشق ہے تو سن عاشق کا ذکر — دور کر کے ماسوا کا اس سے فکر
عاشقوں کا ذکر کرتا ہے اثر — گرچہ پتھر سے بھی ہو دل سخت تر
عشق کی باتوں میں ہے وہ زورِ فن — مردہ دل زندہ ہو اندر گور تن
ہے وہ سیراب عشق کی باتوں کا باغ — خشک مغزوں کا ہو تر جس سے دماغ
ہوش سے بے ہوش ہو کر ہوش کر — گوش سے بے گوش ہو کر گوش کر
سب طرف سے بند کر کے کھول کان — جمع کر کے رکھ مری باتوں پہ دھیان
تا مزہ دیویں مری باتیں تجھے — عشق کی معلوم ہوں گھاتیں تجھے
تجھ کو بھی آ جائے شاید بوے عشق — کھینچ لے جا تجھ کو بوتا کوے عشق
زے وہ پہنچا شہر اُلفت میں تجھے — غرق کر دے بحرِ وحدت میں تجھے

دیکھنے ہی سے نہیں ہوتا ہے عشق
سننے سے بھی تخم خود بوتا ہے عشق

(مثنوی تحفۃ العشاق از معارف لدینہ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز صفحہ ۸-۶)

حصہ دوم

علمائے دارالعلوم دیوبند
اور
ان کے یادگار کارنامے

دارالعلوم دیوبند

ہندوستان میں عظمتِ اسلام کی ایک زندہ جاوید یادگار

(۱)

تحریکات کا منبع:

دارالعلوم دیوبند کا نام زبان پر آتا ہے تو تصور صرف ایک دینی مدرسے کے دایرے تک محدود نہیں رہتا۔ دارالعلوم معقول و منقول کی محض ایک رسمی و روایتی درس گاہ کا نام نہیں، بلکہ وہ بہت سے تعلیمی، ثقافتی، علمی، سیاسی اداروں اور تحریکوں کا جامع ہے۔ یہ ہندوستان کی سرزمین میں وہ شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑیں گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہیں اس کی شاخیں فضا میں دور دور تک پھیل گئی ہیں اس کا سایہ راستہ چلنے والوں کے لیے سکون وطمانیت کا باعث ہوا ہے اور اس کے ثمرات شیریں نے ملت اسلامیہ کے ذوق معنوی کو تسکین بخشی اور قومی وملی زندگی کو اس کے دور دراز گوشوں تک سیراب اور اپنے برکات سے مالا مال کیا ہے۔ وہ تاریخ کے کئی نشیب وفراز سے گزرا' اسے زندگی میں کئی دشوار گزار مراحل پیش آئے' دشمن تو خیر دشمن ہی تھے انھوں نے اس کے وجود کو مٹانے کی کوششوں میں کمی نہیں کی۔ اپنوں کی کوتاہ نظری نے بھی اس کے امتیازات کو ملیا میٹ کرنے میں نادانیوں کی مثال قائم کر دی۔ لیکن اس شجرہ طیبہ کی شاخوں کا گھنا سایہ نہ نادانوں پر سمٹا نہ بیگانوں پر تنگ ہوا۔ اس کے ثمرات تعلیم و تربیت سے سب نے فیض اٹھایا۔ اس کے اسلاف واخلاف کا ذوقِ خدمت بلا تمیز مذہب وملت سب کے لیے ایک فیضان تھا۔ اس کے متقدمین اسلامی اطوار اور انسانی اوصاف کا بہترین نمونہ تھے تو اس کے متوسطین اور متاخرین بھی زندگی کے ہر دایرۂ عمل میں اپنے اسلاف کے صحیح جانشین اور ان کی روایات کے امین تھے۔ اس کے اکابر تو ہر دایرہ علم وعمل میں اکابر ہی تھے' اس کے اصاغرد اخلاف کی سیرتوں کی پختگی وتابانی اور ایثار وقربانی کی مثالوں نے بھی زندگی کی کٹھنائیوں میں قوم کے عزایم کو پختہ کیا اور حوصلوں کو مضبوط اور ہمتوں کو بلند رکھا۔

دارالعلوم دیوبند، ایک سیرت کا نام ہے!

اللہ تعالیٰ نے انھیں ایمان کی پختگی، عقاید کی صحت، علم کے رسوخ، نظر کی بلندی، قلب کی وسعت، ذہن کی فراخی اور سیرت میں اعتدال، عمل میں استقامت اور دین و دنیا کے توازن کی بہترین خوبیوں سے نوازا تھا۔ ان کا ایک ایک فرد حسن سیرت کی مثال، اخلاق کا مجسمہ، عمل کا پیکر اور ایثار کا نمونہ تھا۔ وہ فرشتے نہیں تھے لیکن ایسے نیک سرشت تھے کہ فرشتے ان پر رشک کریں۔ ان میں کوئی معصوم نہ تھا لیکن نیک نفسی، پاکیزگیِ عمل، سلامت روی، خوش خلقی، تقویٰ و تدین اور برو احسان کے خصایص و خصایل سے ان کی زندگیاں آراستہ تھیں۔ وہ خود اپنی مثال اور آپ اپنا نمونہ تھے۔ علوم و فنون کے مختلف میدانوں اور خدمات قومی و ملی کے مختلف دایروں میں دوسرے مذاہب و فرق کے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور تاریخ میں اپنا نام یادگار چھوڑ گئے، لیکن بہ حیثیت مجموعی کسی ایک جماعت اور مکتبہ فکر کے ہر دور میں خصایص علم و عمل کے اتنے اعلیٰ درجات پر اتنی بڑی تعداد کہیں نہ ملے گی۔ وہ ایک عظیم الشان سلسلہ ذہب ہے جس کی ہر کڑی اپنی ماسبق سے زیادہ شان دار نظر آتی ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کی ایسی ٹیکسال ہے جس کے کھوٹے بھی دوسروں سے زیادہ کھرے نکلے۔ اس کی تعمیر کے حسن اور منظر کی دل ربائی نے دیکھنے والوں کو سرور بخشا ہے۔ اس کا وجود سر زمین ہند میں عظمت اسلام کی ایک زندہ اور مقدس یادگار ہے۔ وہ ایک بارانِ رحمت تھا جس نے مسلمانوں کی کھیتیوں ہی کو سیراب نہیں کیا اس سے بہ قدر ذوق و استعداد غیر مسلم سوسائٹی بھی مستفیض ہوئی اور جس کا فیضان ہندوستان کے کناروں سے نکل کر ایشیا اور افریقہ و یورپ کے دور دراز ممالک اور ان کے دیار و امصار تک پھیلتا چلا گیا وہ ایک سلسبیل تھی جس کا عرفان کسی کو تھا یا نہیں لیکن اس کا فیضان عام تھا اور اس نے ملت کی سب کھیتیوں کو سیراب کیا۔

مقبول بارگاہِ الٰہی:

اس کے وجود کا خمیر صبر و توکل اور اخلاص و للٰہیت کی مٹی سے اٹھا تھا اس لیے عنداللہ وہ ہمیشہ مقبول رہا اور عندالناس اُسے ہر دور میں عزت اور مرجعیت کا مقام حاصل رہا۔ تاریخ کے

سنین وشہور کا شمار کیجیے تو اس کے قیام پر ڈیڑھ سو برس پورے ہونے والے ہیں۔
اس کا وجود ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء میں نقش پذیر ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک برعظیم پاک و ہند کی تاریخ مذہب و سیاست میں وہ اسلام اور مسلمانوں کی شان اور عظمت کی علامت کے طور پر اپنا سر اونچا کیے ہوئے کھڑا ہے۔ اس مدت میں حوادث کے کتنے ہی طوفان آئے اور اس کے سر وشانہ سے ٹکرا کر اور اس کے جیب و داماں سے کھیل کر گزر گئے، زمانے کی شکست و ریخت نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، انقلابات نے عظیم ہندوستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا، بعض نادان یہ سمجھتے تھے کہ عظمت اسلام کی یہ یادگاران حوادث میں اپنا وجود برقرار اور تشخص قائم نہ رکھ سکے گی لیکن دنیا نے دیکھا کہ وقت آیا تو حوادث نے اپنا راستہ بدل لیا، خطرات موہوم ثابت ہوئے، اس کی ہستی مزید بلند ہوئی اور اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ اس کی زندگی کی ہر آنے والی صبح روشن تر از سابق ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ء کے حوادث کے بعد بھی اگر ایشیا میں ہندوستان کی سرزمین میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا کوئی اجلا نقش اور وطن و ملت کی خدمت کا کوئی یادگار مرکز ہے جس کا ہر دور شان دار، جس کے فیصلے مستحسن اور جس کا وجود فی نفسہ قابل فخر نظر آتا ہے، تو وہ صرف دارالعلوم دیوبند ہے! اس کا قیام و وجود مشیت ایزدی کی نمود اور منشاے خداوندی کا اظہار تھا۔ اس لیے انقلاب اور زمانے کی شکست و ریخت کا اس کے وجود پر کوئی اثر نہ پڑا۔ دارالعلوم تاریخ کا ایک روشن باب ہی نہیں بلکہ برعظیم کے مسلمان کی دینی و تعلیمی، علمی و تہذیبی اور سیاسی و ملی تاریخ کے ایک جلی نقش کا نام ہے۔ اگر دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کو نظر انداز کر دیا جائے، تو برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ ثقافت و سیاست کا تمام قابلِ فخر سرمایہ نظروں سے چھپ جاتا ہے، دینی خدمات نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں اور ملک کی آزادی ملتِ اسلامیہ کی سربلندی' اسلامی علوم و ثقافت کے تحفظ کی جدوجہد اور عزیمتِ دعوت کی تاریخ میں ایک طبقے کی گداگری ایک جماعت کی منت گذاریوں اور ایک گروہ کی ملت فروشیوں اور غداریوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

دارالعلوم دیوبند ایک سرچشمہ تھا، جس کی فیض رسانیوں اور نفع بخشیوں نے ملت کے نخلِ امید کو سرسبز و شاداب کر دیا اور زندگی کے ہر گوشے اور علم و عمل کے ہر میدان میں ملت اسلامیہ

کے دماغوں کو افکار حقہ اور دلوں کو امنگوں اور ولولوں سے معمور کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کے سامنے زندگی کے ہر گوشے میں راہ عمل کھولی اور اپنے اخلاق اور سیرت کی روشنی میں راہوں کو منور کر دیا۔ مسلمان چاہیں تو وہ نئے حالات میں یمین و یسار کے تذبذب کے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کا سفر طے کر سکتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

(۲)

مقصد قیام

علوم دینیہ کی تعلیم و اشاعت:

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو روشن اور تاب ناک! اس نے علوم دینیہ کی تعلیم و اشاعت میں جو کارنامہ انجام دیا اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی دور دراز گوشہ ایسا نہیں ہو سکتا جہاں مسلمان ہوں اور عقائد و اخلاق و سیرت اسلامی میں دیوبند کے اکابر اور فیض یافتگان کے دستِ تعلیم و تربیت کا کوئی اثر موجود نہ ہو۔ دنیا کی نظروں میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کا خاص مقصد علوم دینیہ کی اشاعت و تعلیم تھا اور اگر صرف یہی مقصد تھا تب بھی مسلمانوں کی علمی و عملی زندگی کا کون سا گوشہ، ذہنی و فکری تربیت کا کون سا اصول، اسلامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا کون سا کام، اخلاق و سیرت کی تعمیر کی کون سی ضرورت، دین و دنیا کی بھلائی کا کون سا میدان اور فلاحِ فرد و ملت کے نصب العین کا کون سا پہلو تھا جو اس میں نہیں آ گیا۔

مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کا حصول:

لیکن اگر کسی کو اصرار ہو کہ تاریخ کے حروف و سواد میں اس کے مقاصد قیام کے دیگر خصایص بھی بتلا دیے جائیں تو جان لینا چاہیے کہ اس کا قیام ہندوستان میں مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کا حصول اور قیامِ ملتِ اسلامیۂ ہندیہ کی تدابیر کے لیے ایک مرکز اور نظام فکر کے ایک بنیادی نقطے کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کے قیام کے پس منظر اور مقصد کے بارے میں ''سوانح قاسمی'' میں بہ تفصیل لکھا ہے۔ یہاں مختصراً عرض کیا جاتا ہے۔

پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

(۱) ''جس وقت شاملی کے میدان میں وہ خود (حضرت قاسم نانوتوی) اور ان کے

رفقاے کار بہ ظاہر ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے تو، یہ واپسی "متحرفا لقتال او متحیزا الی فئة." (انفال) جنگ ہی کے لیے کتراتے ہوئے یا کسی ٹولی سے ملنے کے لیے ہوسکتی تھی اور یقیناً اسی کے لیے تھی۔" (سوانح قاسمی: ج ۲،ص ۲۲۳-۲۲۲)

(۲) مقصد کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ (حضرت نانوتوی) کا دماغ مصروف ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اس لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی اور جوہری عنصر تھا۔" (ایضاً: ص ۲۲۳)

(۳) حضرت مولانا سید محمد میاں نے لکھا ہے کہ جب حاجی رفیع الدین نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ انھوں نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کے لیے دعا فرمائیں تو آپ نے عرض کیا:

> "سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے! یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سر بہ سجود ہوکر گڑگڑائی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقاے اسلام اور تحفظ علم دین کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔" (علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ج ۱،ص ۷۱)

(۴) مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند سے دریافت فرمایا کہ سیاسیات میں حضرت کا مسلک کیا ہے؟ تو حضرت پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی اور حضرت نے فرمایا:

> "حضرت الاستاذ (حضرت نانوتوی) نے اس مدرسے کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز ہو جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔" (سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۶)

مولانا گیلانیؒ نے اسے دارالعلوم کی ''اساسی خصوصیت'' قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''مدرسہ دیوبند کی یہی وہ ''اساسی خصوصیت'' تھی جس نے اس مدرسے کے تمام کاروبار حتیٰ کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرور خصوصیات پیدا کیں اور وہ دینی اور مذہبی حمیت اور غیرت کا ہند گیر ہی نہیں عالم گیر جامعہ اور اقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلا کا ایک خاص مکتبِ خیال نمایاں ہوا اور اس کے مستفیدین ایک ایسا خاص ملا جلا اور مرکب نصب العین لے کر باہر نکلے جس میں سب پر چھا جانے کی اسپرٹ موجود تھی۔'' (ایضاً)

اب تو دارالعلوم کے ان اصحابِ رخصت نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے جن کے بزرگ سیاست کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ یہ بات کچھ حضرت شیخ الہند یا کسی استاد کے دل میں چھپی ہوئی نہ رہی تھی بلکہ غیر درسی طور پر حضرت کے ذہن سے نکل کر تلامذہ کی زبانوں تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ ۱۹۰۵ء کے آغاز میں سر جیمس ڈگس لاٹوش جب دارالعلوم دیکھنے کے لیے دیوبند آئے اور اساتذہ سے ملے، طلبہ سے بات چیت کی اور دارالعلوم کی تعلیم کی غرض و غایت دریافت کی اور ان کی اپنی زندگی کا مقصد پوچھا تو انھوں نے جواب دیا:

''ہمارا نصب العین احیاے دین اور خدمت ملک و ملت ہے۔''

(تاریخ دارالعلوم دیوبند: از سید محبوب رضوی، کراچی، ۱۹۸۹ء ج ا، ص ۲۰۹)

یہ ۱۹۰۵ء کے آغاز کی بات ہے اس کے بارے میں اگر ۱۹۱۵ء میں کوئی شخص کہتا ہے کہ ''اس کا مقصد صرف اور صرف مذہبی تعلیم کی آزادی ہے، سیاست سے اس کو کوئی غرض نہیں'' یا آج کوئی پوچھتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا کیا مقصد تھا تو اس کی سادگی پر حیرت اور تجاہل پر افسوس ہوتا ہے آخر یہ اندازِ گفتگو کیا ہے اور اس پوچھنے کا کیا مقصد ہے؟

اگر کسی کو مزید اصرار ہو کہ اس کی خدمات کے ہر پہلو پر وقت کے اصول تالیف و تصنیف کے مطابق الگ الگ بحث کی جائے تو اس صحبت میں بھی گنجایش و فرصت کے مطابق اس کی خصوصیات کے مختلف پہلوؤں کی طرف ضروری اشارات کیے جاسکتے ہیں!

(۳)

مدارس کے قیام کی ہمہ گیر تحریک

دارالعلوم دیوبند ملت کے چند بہی خواہوں نے جن مقاصد کے لیے قائم کیا تھا وہ مقاصد سہارن پور کے ایک گم نام قریے میں صرف ایک مدرسہ قائم کر دینے سے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اس جذبے کو عام کیا جائے اور مدارس دینی کا ایک جال پورے ملک میں پھیلا دیا جائے۔ چناں چہ دارالعلوم کے بانیان کرام نے ایک ایسا دینی تعلیمی جذبہ پیدا کیا کہ اسی زمانے میں ملک کے طول و عرض میں کئی مدرسے قائم ہوئے۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں ''مدرسہ قاسمیہ، مراد آباد'' کا قیام عمل میں آیا، جواب عام طور پر ''مدرسہ شاہی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بنیاد حضرت قاسم العلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی۔ اس کے چند سال بعد حضرت قاسم العلوم ہی کے ایماء و تحریک پر ''جامعۂ اسلامیۂ عربیہ'' کے نام سے امروہہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ نگینہ یو پی میں ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) سے ایک مکتب قائم تھا۔ حضرت حجۃ الاسلام کے مشورے سے اسے ترقی دے کر علوم اسلامی کی ایک قابل فخر درس گاہ بنا دیا گیا اور حضرت ہی کے نام پر اس کا نام ''مدرسۂ قاسمیۂ عربیہ'' رکھا گیا۔ ''مظاہر العلوم سہارن پور'' کا قیام ۱۸۹۶ء میں عمل میں آیا۔ اس کے آغاز و بنا میں بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے احباب و اخلاف کا حصہ تھا اور دارالعلوم دیوبند کے مقاصدِ تعلیم و تربیت ہی اس کے مقاصد قرار پائے تھے۔ بانیان دارالعلوم دیوبند کے احباب اور شاہ محمد اسحاق اور حضرت مولانا عبدالحی، شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ کے تلامذہ میں سے مولانا سخاوت علی جون پوری نے جون پور میں گذشتہ صدی کے اواخر میں مدرسۂ قرآنیہ قائم کیا۔ مدارس کے قیام کا یہ سلسلہ دارالعلوم دیوبند کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا اور ملک کے طول و عرض میں متعدد مدارس قائم ہو چکے تھے لیکن یہ چمن بندی کا آغاز تھا فصل گل کا موسم ابھی دور تھا اس موسم کا آغاز حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی علیہ الرحمتہ کے عہدِ صدارت سے ہوتا ہے آپ کے زمانے میں اور آپ کے تلامذہ کی کوششوں سے برعظیم پاک و ہند کا چپہ چپہ علوم دینی کی ضیا

پاشیوں سے جگمگا اٹھا اور ملی تحریکات اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ آپ کے مساعی مشکور سے ملت کے مضمحل و منتشر قویٰ میں ایک نئی قوت اور اعضاو جوارح کے افعال میں ایک نظم پیدا ہوگیا اور دارالعلوم کا فیضان عام ہوتا چلا گیا۔

۱۸۹۵ء میں مولانا رشید احمدؒ گنگوہی کے خلیفہ، مجاہد ملت حافظ محمد صالح، مولانا فضل احمدؒ منشی رحمت اللہ اور دیگر حضرات نے ''مدرسۂ رشیدیہ'' کے نام سے رائے پور (ضلع جالندھر) میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۰۵ میں ''مدرسہ نعمانیہ'' کے نام سے امرتسر میں اسی سلسلے کے وابستگان نے ایک دینی درس گاہ قائم کی۔

دہلی کی مشہور دینی درس گاہ ''مدرسۂ امینیہ'' حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا امین الدین نے قائم کی اور دوسرے نامور شاگرد حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی کے اخلاص و ایثار نے اسے ایشا کی چند مشہور دینی جامعات کی صف میں شامل کر دیا سندھ میں حضرت شیخ الہند کے نامور شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی نے بمقام گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدرآباد) میں ''دارالرشاد'' کے نام سے ۱۹۰۱ء میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں اسی نام سے نواب شاہ (سندھ) میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس سے پہلے ۱۸۸۴ء میں مولوی عبداللہ مرحوم نے ایک مدرسہ کراچی کے محلہ کھڈا میں قائم کیا تھا۔ مرحوم کے فرزند ارجمند مولانا محمد صادق حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں سے ایک تھے، جنھوں نے سندھ میں علوم اسلامی کی ترویج واشاعت، تبلیغ اسلام، رد بدعات و محدثات اور تحریک آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد صادق کے مساعی حسنہ کا مرکز ان کے والد کا قائم کردہ مدرسہ تھا جو تاریخ میں ''مدرسہ مظہر العلوم'' کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور میں حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا احمد علی لاہوری نے جو علوم قرآنی میں اپنے امتیاز و تبحر کی بنا پر شیخ التفسیر کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں ۱۹۲۴ء میں ''مدرسہ قاسم العلوم'' کے نام سے ایک دینی درس گاہ کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۸ء میں ڈابھیل (سورت) میں ''جامعۂ اسلامیہ'' کے نام سے مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوششوں سے ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے بہت تھوڑی مدت میں دینی و تعلیمی حلقوں میں اعتماد پیدا کرلیا۔ اگرچہ اس مقام پر ایک چھوٹا سا مدرسہ پہلے سے قائم

تھا۔حضرت شیخ الہند کے تلامذہ کی صف میں ہر دو حضرات کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) میں چند مخلصین ملت نے جو اس سے پہلے انجمن اصلاح قائم کر چکے تھے۔ ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔جس کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہند کے شاگرد مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندی کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔۱۹۲۴ء میں گجرات کے ضلع کھیڑ میں آنند کے مقام پر حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں ''جامعہ عربیہ تعلیم الاسلام'' کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد پڑی جس نے گجرات کے علاقے میں علوم دینی کی اشاعت اور تبلیغ اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا۔۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہند کے مشورے سے مولانا عبیداللہ سندھی نے دہلی میں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا جس میں دو تین استاد درس قرآن و حدیث کی خدمت میں مصروف تھے اور ایک خاص جماعت جو دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے فارغین پر مشتمل تھی مولانا سندھی مرحوم کے زیر تعلیم و تربیت تھی لیکن انگریزی حکومت اس چھوٹے سے ادارے سے جس طرح لرزہ براندام تھی اس کا کچھ اندازہ ''تحریک شیخ الہند'' (مولفہ مولانا سید محمد میاں) کے مطالعے سے ہوتا ہے۔۱۳۵۰ھ (۱۹۳۲ء) میں مدرسۂ دینیۂ اسلامیہ غازی پور ملت کے چند بہی خواہوں اور علوم اسلامی کے شائقین کے ہاتھوں قائم ہوا لیکن اس کا نظام تعلیم و تدریس دارالعلوم سے مستعار اور زمام تعلیم و تدریس شروع سے اب تک فاضلین دیوبند کے ہاتھوں میں رہی ہے۔غازی پور کا مشہور اور تاریخی مدرسہ ''مدرسۂ چشمۂ رحمت'' ۱۸۶۹ء میں قائم ہوا اگرچہ اس کے بانیوں کا پہلا تعلق علماء فرنگی محل سے تھا لیکن آغاز کے بعد مدرسہ ہر دور میں فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کے مساعی اور خدمات کا منت گذار رہا ہے۔جون پور کے قصبہ صبر حد کی مثالی درس گاہ ''مدرسہ فاروقیہ'' کی تعلیمی و اصلاحی روح وہی ہے جو دارالعلوم دیوبند کے نظام تعلیم و تربیت میں رواں ہے۔پٹنہ کے مشہور و معروف ''مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ'' کا قیام ۱۹۱۲ء اور اس کی ترقی دارالعلوم دیوبند کے چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہونے والوں کی مرہونِ منت ہے۔اس سلسلے میں ''جامعہ ملیہ نواکھالی'' کا ذکر ضروری ہے اسے دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے۔اس کے امتحانات اور کارگذاری کی نگرانی

دارالعلوم کی طرف سے ہوتی ہے۔

یہ عہد سعادت تو حضرت شیخ الہند اور آپ کے تلامذہ کا دور تھا۔ یہ تحریک اس دور کے بعد ختم نہیں ہوگئی بلکہ آزادی کے بعد کے ابتدائی دس برس کے عرصے میں پاکستان کے مختلف شہروں میں چند ایسے دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے جن کے ذکر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان مدارس میں جامعہ اشرفیہ، لاہور (۱۹۴۷ء) جامعہ رشیدیہ ساہیوال (۱۹۴۷ء)' دارالعلوم خیر المدارس' ملتان (۱۹۴۷ء)' دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک (۱۹۴۷ء) دارالعلوم الاسلامیہ' ٹنڈوالہ یار حیدر آباد (۱۹۴۷ء)' دارالعلوم کراچی (۱۹۵۰ء)' جامعہ اشرفیہ' پشاور (۱۹۵۳)' جامعہ مدنیہ' لاہور (۱۹۵۵ء)' مدرسۂ عربیہ اسلامیہ' نیوٹاؤن کراچی (۱۹۵۵ء)' خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن اس سلسلہ ذہب کی یہ آخری کڑیاں نہیں ہیں۔ ان مدارس کے بعد بھی بے شمار مدارس پاکستان کے طول وعرض اور ہندوستان اور بنگلہ دیش کے دور دراز علاقوں میں قائم ہیں۔

یہ تمام ادارے برعظیم میں علوم اسلامی کی تعلیم و تدریس' اسلامی شعائر اور تہذیب وثقافت کے تحفظ، ملک کی آزادی کی جدوجہد اور ملی تحریکات اور اسلامی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ تمام مدارس اپنا اپنا جداگانہ اور مستقل نظام اور حلقہء اثر رکھتے ہیں لیکن ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں اسلامی تعلیم وتربیت کے نظام میں دارالعلوم دیوبند اور ان اداروں کا تعلق وہی تھا جو نظام فلکی میں سورج اور دوسرے سیاروں کا ہے۔

ان سطروں کے مطالعے سے دارالعلوم دیوبند کے دائرۂ فیضان کا جو تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے وہ حقیقت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی کام ہی نہیں کیا گیا اور کوئی سنجیدہ کوشش ایسی نہیں کی گئی۔ جس سے دارالعلوم دیوبند کے افادہ و فیضان کا واقعی اندازہ ہوسکے۔

یہ تو دارالعلوم دیوبند کے سلسلے کے چند خاص مدرسے تھے لیکن اگر صوبہ یا علاقہ وار جایزہ لیا جائے تو صرف ایک مضمون اس مواد کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ایک کتاب کی

ضرورت ہوگی۔ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کا کون سا گوشہ ایسا ہے جہاں دارالعلوم دیوبند کے سلسلے کا چھوٹا یا بڑا کوئی مدرسہ قائم نہیں ہے۔ ہندوستان میں اہم مدارس کی ایک مختصر سی فہرست غلام رسول نے مرتب کی ہے۔ دوسری فہرست جو بہار و اڑیسہ کے اہم مدارس کی ہے، پروفیسر عبدالمنان کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ گجرات کے باکمال اور برگزیدہ علمائے کرام کی دینی خدمات کا ایک مختصر جائزہ حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ نے لیا ہے اسی طرح مالا بار میں دینی تعلیم کی مرکزی درس گاہوں کے بارے میں محمد اسلم نے معلومات فراہم کی ہیں۔ (ان مضامین کے لیے دیکھیے البلاغ بمبئی (تعلیمی نمبر)۔ سابق مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کے عربی مدارس کا ایک مفصل جائزہ حافظ نذر احمد نے مرتب کیا۔ "علم و آگہی" کراچی کے دو ضخیم نمبروں (برصغیر پاک و ہند کے علمی ادبی اور تعلیمی ادارے جلد اول و دوم) میں دیو بندی مکتبۂ فکر کے بہت سے تعلیمی، علمی اور ادبی اداروں اور انجمنوں کے حالات سمیٹ لیے گئے ہیں اس سلسلے میں اردو کالج کے ترجمان "برگ گل" کراچی کا تعلیمی پالیسی نمبر بھی قابل توجہ ہے۔ ان کتب و رسائل میں مدارس کی تاریخ اور اس کے بانیوں کے حالات کے مطالعے سے بہ خوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دیو بند کی فیض رسانیوں اور اس کے اکابر و اصاغر کی نفع بخشیوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

(۴)

دارالعلوم دیوبند کے اثرات

مرکز علی گڑھ میں انقلابِ فکر و نظر کا پس منظر:

قدیم و جدید کی تفریق ہندوستان پاکستان میں مسلمانوں کی ملی زندگی کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ دیوبند کو قدامت کا پرستار اور علی گڑھ کو جدت کا والہ و شیدا بتایا گیا ہے۔ اس خلیج کو پاٹنے کی مختلف دردمندانِ قوم نے کوشش کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ الزام جدت کے پرستاروں کی طرف سے قدیم طرزِ فکر کے علماء پر! اور قدیم و جدید کے مابین خلیج کو پاٹنے کی تمام تر کوششیں انھیں کی طرف سے حیرت ہے کہ انھیں پر قدامت پرستی کا طعنہ! ندوۃ العلماء اس کی ایک مثال ہے جس کے محرکوں اور بانیوں میں دیوبند کے سلسلے کے بزرگ واکابر نمایاں ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین خلیج کو پاٹنے کی نہایت مخلصانہ کوششیں کیں۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے خصوصی نصاب کا بندوبست کیا اور دارالعلوم کے فارغین کی علی گڑھ جانے اور جدید علوم سیکھنے میں ان کی ہمت افزائی کی۔ مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی قائم ہوا تو اس کے سرپرستوں میں حکیم اجمل خان مرحوم کے ساتھ نواب وقارالملک کو برابر کا شریک بنایا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں بیماری کی انتہائی شدت کے باوجود حضرت شیخ الہند نے علی گڑھ کا سفر کیا۔ اپنے وصال سے چند دن قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کا سنگ بنیاد رکھا اور زندگی کے آخری لمحوں تک وہ اس کوشش میں مصروف رہے کہ علی گڑھ کے قلب کی سیاہی ایمان کی روشنی میں بدل جائے۔ لیکن ان مخلصانہ مساعی کے صلے اور جواب میں علی گڑھ کے فرزندوں نے حضرت شیخ الہند، آپ کے ساتھیوں، شاگردوں، جاں نثاروں، مولانا سندھی وغیرہ کی مخبری کی، ان کے لیے مشکلات پیدا کیں، قید و بند کے دروازے کھولے، گورنمنٹ میں عہدے اور منصب اور سرٹیفکیٹ حاصل کیے اور اس طرح دارالعلوم کے اکابر اور مخلصین ملت کی ایک ایک سعی کو ناکام بنا دینے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ ان بزرگوں کی توہین اور تضحیک اور انھیں رسوا و بدنام کرنے کے لیے افترا و بہتان اور ان کی جان لینے کی کوشش تک سے دریغ نہ

کیا۔ دیوبند اور علی گڑھ کی یہ کشمکش تھی۔ جس نے بعد میں مسلم لیگ اور جمعیت علمائے ہند کی چپقلش کی صورت اختیار کر لی۔ انتہائی تلخ تجربات کے باوجود اس دور میں بھی علمائے دیوبند مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور قدیم و جدید کی ہم آہنگی سے مایوس نہیں ہوئے۔ لیکن مسلم لیگ کے اکابر نے جو رویہ اختیار کیا اس کی دردناک روداد مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کر دی ہے یہ انٹرویو خواجہ عبدالوحید مرحوم نے لیا تھا اور علامہ عثمانی کی زندگی ہی میں لاہور کے اخبار سہ روزہ زمزم میں چھپوا دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ علی گڑھ دیوبند کو کبھی گوارا نہیں کر سکا، لیکن ملت کی غم گساری اور اسلامی اخلاق و سیرت اور اخلاص و عمل میں دیوبند سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہا۔

علی گڑھ کے جامد اور انگریز پرست ماحول سے جو چند آزادی کے متوالے اور ملت کے بہی خواہ نکلے، جنھوں نے علی گڑھ کی پیشانی سے کلنگ کا ٹیکا مٹانے کی کوشش کی اور اگرچہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئے۔ نہ بنیاد کی ٹیڑھ اور کج کو دور کر سکے اور نہ نیت و عمل کی کالک اس کی تاریخ کے چہرے سے دھوئی جا سکی (۱)۔ لیکن اس کے بعض اخلاف اپنے اخلاص اور بہی خواہی ملت کا نقش ضرور لوگوں کے دلوں پر ثبت کر گئے۔ ان میں مولانا محمد علی، شوکت علی، تصدق احمد خاں شیروانی، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مہدی افادی، مولانا حمید الدین فراہی، اقبال سہیل، عبدالمجید خواجہ، طفیل احمد منگلوری، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین،

---

(۱) علی گڑھ کالج کے قیام کا ضامن مقصد مسلمانوں کے طبقہ اشرافیہ میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کا رواج اور انگریزوں کے خدمت گزاروں کا ایک طبقہ پیدا کرنا تھا۔ نواب محسن الملک سے بڑھ کر علی گڑھ کالج کا سچا ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ انھوں نے سرسید کے جو ایڈریس اور اسپیچیس متعلق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ (از ابتدائے فونڈیشن ۱۸۷۵ء عنایت ۱۸۹۸ء) مرتب کیں اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس میں چھپوائے اور دسمبر ۱۸۹۸ء میں شایع کیے تھے اس کی تمہید (پیش لفظ) میں فرماتے ہیں:

''اصل مقصد اس کالج کا یہی ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجے کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان ہو از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں، مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں۔'' (ص ۲)

یہ محسن الملک کا بیان ہے سرسید کے بعد ان سے زیادہ ذمہ دار کون تھا؟ علی گڑھ تحریک کے رکن رکین تھے، کالج کے ٹرسٹی تھے، کالج کے سکریٹری ہونے اور ہر طرح علی گڑھ تحریک کی نمایندہ شخصیت اور سرسید کے جانشین اور ان کے ترجمان تھے۔

شیخ عبداللہ (کشمیری) اور چند ایسے ہی اور حضرات ہیں۔ یہ تمام اصحاب کسی نہ کسی درجے میں حضرت شیخ الہند سے متاثر اور آپ کے نقش سیرت کے گرویدہ تھے اور اسی تاثر اور گرویدگی کے نتیجے میں قومی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرایا تھا۔ علی گڑھ میں سرسید کی گدایانہ پالیسی کے خلاف جو احساس اور جذبہ پیدا ہوا اس میں سب سے نمایاں اثر دیو بند کا تھا، حال آں کہ دیو بند کے اکابر نے علی گڑھ کے خلاف نہ تو کبھی پر جوش تقریریں کی تھیں، نہ لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا تھا اور نہ محمد علی کی طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی دھمکی دی تھی، لیکن دیو بند کی ایک سیرت تھی جس نے علی گڑھ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ یہ سیرت اپنا کام کر رہی تھی اور اس کے اثرات رفتہ رفتہ پھیل رہے تھے۔

دوسرے علمی اداروں اور خانوادوں میں دیو بند کے اثرات:

علی گڑھ کے علاوہ ملک میں دوسرے سیاسی و دینی ادارے اور ثقافتی و تہذیبی حلقے بھی دیو بند سے متاثر ہوئے۔ نواب وقار الملک ظاہر ہے کہ علی گڑھ کی پیداوار نہ تھے۔ حکیم اجمل خاں ایک دوسرے دایرے سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری (مختار احمد) کا میدان دوسرا تھا، وہ ایک مختلف فن کے شخص تھے۔ علامہ اقبال کی تعلیم و تربیت کے سانچے دوسری مٹی سے تیار ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت اور فکر کے نشو و نما کی دنیا دوسری تھی۔ وہ اپنے ہی عالم افکار کے بلند پرواز شاہین تھے۔ حالی و شبلی اپنی الگ الگ دنیائیں رکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کا اپنا الگ مزاج تھا، لیکن حضرت شیخ الہند کی شخصیت اور دار العلوم دیو بند کے کردار سے سب متاثر تھے۔ ان میں ایسی کشش تھی کہ جو ایک نظر ان پر ڈالتا تھا انھی کا ہو جاتا تھا۔

دار العلوم دیو بند کے اثرات بعض مستقل مکاتب فکر اور علمی خانوادوں پر بھی پڑے اس سلسلے میں پنجاب کے غزنوی خاندان اور بہار و یوپی کے بعض اہل حدیث علماء کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ علمائے اہل حدیث خصوصاً غزنوی خاندان اپنی ایک مستقل علمی اور تعلیمی تہذیبی روایت رکھتا ہے اس کی فکر و خدمات کا پیمانہ بہت بلند ہے۔ وہ دین اور ملت کی خدمت گزاری کی عظیم الشان تاریخ میں اپنا امتیاز رکھتا ہے اسی طرح لودھیانہ کا خانوادۂ علمی جس کے آخری دور کے ورثائے علم و عمل میں مفتی محمد نعیم اور مولانا حبیب الرحمٰن جیسے اصحاب عزیمت و دعوت گزرے ہیں۔ دایرہ شاہ اجمل (الہ آباد)، فرنگی محل (لکھنؤ) اور بدایوں، رام پور، خیر

آباد، ٹونک، اجمیر وغیرہ کے خانوادہ ہائے علم وتصوف اور تعلیم وتدریس کے دورۂ آخر کے اکابر کے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ تمام حضرات حضرت شیخ الہند کی فکر کی تابانیوں سے متاثر اور حضرت کی شخصیت کی عظمت واجلال کے معترف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک مستقل حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت کا ابتدائی ماحول بالکل دوسرا تھا۔ ان کے والد نہ صرف ایک دوسرے بلکہ مخالف ومتحارب گروہ سے متعلق رکھتے تھے۔ لیکن ابوالکلام اپنی زندگی کی تعمیر میں اپنے والد کی فکری وعلمی شخصیت کے بھی رہین منت نہیں تھے۔ بلاشبہ انھوں نے اپنے والد کی سیرت کے کچھ اجلے نقوش کو اپنالیا تھا، لیکن دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور حضرت شیخ الہند کی سیرت کی جلوہ سامانیوں نے انھیں بھی اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

بیسویں صدی کی ایک بڑی علمی شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کی تھی۔ انھیں ندوۃ العلماء کا فرزند عظیم کہنا چاہیے لیکن دارالعلوم دیوبند کے دایرۂ اثر سے وہ بھی باہر نہ رہے۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی سے سلسلہء بیعت میں منسلک اور مجازِ بیعت وارشاد تھے۔ یہ حضرت تھانوی کا فیضان نظر تھا یا مکتبِ دیوبند کی کرامت کہ اس تعلق بیعت کے بعد ان کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ معراج روحانی کے اثبات میں ان کے پاس عقل ومنطق کے استدلات کی کمی نہ تھی وہ روایات کا سہارا لے سکتے تھے، بعض صحابہ اور علماء وحکماء کے اختلافات سے اپنے مقدمے کو مستحکم کرسکتے تھے، لیکن ان کی روح سعید وقلب سلیم نے ان بنیادوں پر افکار کی تعمیر گوارا نہ کی اور اسی مسلک کو اختیار کرلیا، جس کی طرف حضرت تھانوی کے فکر نے رہنمائی کی تھی اور علمائے دیوبند کا مسلک تھا۔

اسی سلسلے میں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام بھی آتا ہے۔ ان کی عقیدتوں اور ارادتوں کے رشتے اکابر دیوبند سے ہمیشہ استوار رہے۔ دور حاضر کی آخری شخصیتوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نامور شخصیت تھی ان کا تعلق رائے بریلی کے ایک تاریخی خانوادۂ علم وعرفان سے ہے وہ خود دعوت وارشاد کے سلسلے کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ان کے خاندان میں علم ودین، سیرت واخلاق اور عرفان وتصوف کا کون سا سرمایہ موجود نہ تھا جس کے لیے وہ دوسروں کے محتاج ہوتے لیکن علمائے دیوبند سے ان کی عقیدت وارادت معلوم ہے اور علوم قرآنی میں اسی مدرسہء فکر کے ایک عالم ربانی شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کی تعلیم وتربیت اور سیرت کی جھلک ان کے آثارِ علمیہ وسیرت میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۵) علمی خدمات

[illegible]

علمی خدمات کے میدان میں بھی دیوبند اور اس کے فرزندوں نے صرف کام نہیں کیا، کارنامے انجام دیے ہیں۔ یہ علمی خدمات شخصی طور پر بھی انجام دی گئی ہیں اور منظم علمی اداروں کی صورت میں بھی۔ دار العلوم دیوبند نے بلند پایہ اہل قلم، مصنف، شاعر، صحافی اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین پیدا کیے۔ [illegible]

خدام القرآن: [illegible]

[illegible] مفسرین و مترجمین قرآن کے سلسلے میں سب سے پہلا نام حضرت شیخ الہند کا آتا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں کئی حضرات ایسے گزرے ہیں جن کا شمار بلند پایہ مفسرین میں ہوتا ہے۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا اشرف علی تھانوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تھانوی سلسلے کے بزرگ مفتی محمد شفیع دیوبندی نے معارف القرآن کے نام سے اور بعض دوسرے بزرگوں نے تفسیری لٹریچر میں کتنے ہی دفاتر کا گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کا شمار بھی اسی خانقاہ علم و تصوف کے مفسرین میں کیا جانا چاہیے لیکن ان کا اپنا اندازِ تفسیر ہے [illegible]

[illegible] مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے دعوت قرآن و تفسیر کا ایک خاص میدان اور اسلوب اختیار کیا اور قصص القرآن کے نام سے اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ اسی مجوزہ اسلوب کو مخدومی و مطاعی حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب مدظلہ العالی نے دعوتِ قرآنی کی عمومی اشاعت کے لیے اختیار فرمایا ہے۔ تذکرۃ الانبیاء اور خاتم الانبیاء (دو حصے) حضرت کی تالیفِ لطیف ہے۔ [illegible]

[illegible] "شیخ التفسیر" کہیے تو مولانا احمد علی لاہوری کا نام ذہن میں اور چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ قرآن حکیم کے درس و تعلیم و اشاعت اور اس کے فیضان نے ہر کہہ و مہہ کی زبان پر ان کا نام شیخ التفسیر ڈال دیا جو ان کے عند اللہ مقبول ہونے کا اشارہ ہے۔ ان کے بعد ان کے

خلیفہ ارشد مولانا قاضی زاہد الحسینیؒ نے اپنے دروس قرآن کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کو پاکستان کے شمال مغربی علاقے کے امصار وقریات تک عام کرنے میں سعی بلیغ کی اوراس میں وہ بہت کامیاب رہے۔ موجودہ دور کے بزرگوں میں حضرت صوفی مولانا عبدالحمید سواتی دامت فیوضہم کی خدمت قرآن اور دروس تفسیر کی عظمت و وسعت اوراس کے فیضان و اثرات کا تقاضا ہے کہ اس پر تحقیق وتعارف کی خاص نظر ڈالی جائے۔ حضرت صوفی صاحب نے خانوادہ ولی اللہ دہلوی اور دیوبند کے اکابر علم وتفسیر کے بہترین خصایص کو اپنے دروس وتفسیر میں جمع کر دیا ہے۔ حضرت کی ذات گرامی موجودہ دور میں ایک تفسیری مکتبۂ فکر کے بانی کی سی ہے۔

یہ تمام مفسرین اپنی الگ الگ تفسیری خصوصیات کی بناء پر طبقۂ مفسرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ مولانا سندھیؒ اپنے خاص مجتہدانہ فکروذوق اور اندازِ تفسیر کی بناء پر گویا ایک مستقل دبستانِ تفسیر کے بانی ہوئے ہیں!

اہل قلم، صحافی اور مصلحین امت:

عام اہل قلم میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندی وغیرہ ایسے اصحاب علم واہل قلم ہیں جنھوں نے اپنے افکار اور تحقیقات سے اردو کے دینی، تاریخی اور سیاسی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ صحافیوں میں مولانا شائق احمد عثمانی (ایڈیٹر عصر جدید کلکتہ) اور مولانا تاجور نجیب آبادی کے سے نامور صحافی اور شاعر گزرے ہیں۔ مصلحین امت میں مولانا احمد علی لاہوریؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی، محققین ومفکرین اور محافظین ناموس رسالت میں مولانا انور شاہ کاشمیری اور دورِ آخر میں مولانا محمد یوسف موزی کی سی نابغۂ روزگار شخصیات گزری ہیں۔ مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحومین نامور خطیب ہوئے ہیں۔ قاری محمد طیب صاحب کا شمار بھی پاک وہند کے بلند پایہ خطیبوں میں ہوتا ہے۔

علمی ومجلاتی صحافت کے میدان میں تو دیوبند کی خدمات کا پیمانہ بہت ہی بلند رہا ہے۔

الرشید، القاسم، دارالعلوم وغیرہ رسائل تو دیوبند سے جاری ہوئے اس کے فرزندوں نے ملک کے طول وعرض میں اردو، عربی وغیرہ کے جو رسائل نکالے ان کی فہرست مرتب کرنے کی طرف ابھی شاید کسی نے توجہ نہیں کی۔ دیوبند کی خدمات کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ رسائل و جرائد کے ذریعے وقت کے اہم دینی، معاشی، سیاسی مسائل پر نہایت بلند پایہ لٹریچر فراہم ہوا۔ بلند پایہ علمی، تاریخی اور تحقیقی مقالات لکھے گئے، تہذیب وثقافت اور دورِ جدید کے بے شمار مسائل پر فکر انگیز مضامین کا ذخیرہ فراہم ہوا۔

علمی و تحقیقی اداروں کا قیام:

دارالعلوم دیوبند میں اور اس کے باہر اس کے فرزندوں نے حالات و وقت کے مطابق بلند پایہ علمی و تحقیقی ادارے بھی قائم کیے اور اب تو تقریباً تمام دینی مدارس میں تحقیق اور تصنیف و تالیف کے مستقل شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی بے شمار اور اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے فارغ التحصیل ایسی ذہنی وفکری تربیت سے آراستہ ہوتے ہیں، جو کسی راہ میں صرف مقلدانہ گام فرسائی پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ حالات و وقت کے مطابق اپنی راہ آپ پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کا جوں جوں تقاضا ہوا علمی ادارے بھی قائم ہوتے گئے اور رسائل و جرائد کا اجرا بھی عمل میں آتا گیا۔ اس کے فرزندوں نے علم وعمل کے مختلف میدانوں میں خدمتِ ملت کی راہیں خود تلاش کیں۔ دارالعلوم کے اندر تصنیف و تالیف کے انفرادی مشاغل کے علاوہ کئی اکیڈمیاں قائم ہیں۔ ان میں سے ''مجلس معارف القرآن'' ہے، شیخ الہند اکیڈمی ہے۔ دارالعلوم سے باہر ندوۃ المصنفین (دہلی) دارالعلوم کے فرزندوں کا کارنامہ ہے، مجلس علمی (ڈابھیل حال کراچی) اسی سلسلے کے تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والوں نے قائم کی، انجمن خدام الدین لاہور ہے، بیت الحکمت کے نام سے مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کا مرکز دہلی اور اس کی شاخیں کراچی، پیر جھنڈا، خان پور، لاہور میں قائم کیں۔ ان کے تحت بعض اہم تصانیف شائع ہوئیں۔ کراچی میں مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی اور مجلس یادگار شیخ الاسلام، مولانا سید حسین احمد مدنی کی یاد میں سرگرم عمل ہے۔ مولانا قاری شریف احمد صاحب اس کے صدر ہیں۔

ان کے علاوہ تبلیغی و اشاعتی ادارے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ حضرت مولانا سید محمد میاں اپنی ذات سے ایک اکیڈمی تھے، انھوں نے گوناگوں تصنیف و تالیف کا جو کام کیا کہ وہ کئی اداروں پر بھاری تھا۔ اگر آپ چاہیں اور نہ چاہیں جب بھی ان کے بجائے جمعیت علما ہند کا نام لے لیجیے کہ اس کے شعبہء تصنیف و تالیف کی سب سے بڑی شخصیت کا نام ''سید محمد میاں'' تھا۔ انھوں نے نہ صرف نظری اور عملی سیاسی موضوعات پر لکھا بلکہ سیرت، تعلیم، فقہ، افتا اور زبان کے مسائل و موضوعات سے لے کر افسانوی ادب کی تخلیق تک کی۔ کسی علم و فن کے بیان میں نہ ان کا قلم کوتاہ تھا اور نہ ان کے موضوعات کا دائرہ تنگ تھا۔ بہ حیثیت مجموعی علوم و معارف دینی کی تالیف و تدوین میں دارالعلوم کے فرزندوں کو خاص امتیاز حاصل ہی تھا۔ دیگر علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں بھی انھوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ قرآن کے متعلق علوم میں، حدیث کے مختلف میدانوں میں، فقہ میں، علوم نقلیہ وغیرہ علوم دینی میں مقلدانہ اور نقل و اقتباس کی خصوصیات ہی کی بنا پر نہیں بلکہ مجتہدانہ نظر و بصیرت کی بنا پر بھی ان کے امتیاز و اختصاص کو دینی و علمی حلقوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ امتیاز دیوبند کی تاریخ ماضی ہی کا حصہ نہیں بلکہ آج تک اس کا یہ امتیاز قائم ہے۔

(۶)

سیاسی خدمات

اکابرِ دار العلوم نے ہمیشہ اور ہر دور میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود، ملت کے قیام، ملک کی آزادی اور ترقی کی ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خواہ مسلمانوں کے مصالح ہوں یا تمام برادرانِ وطن کے مشترکہ مفاد کی جدو جہد ہو انھوں نے کبھی ملت کی بہی خواہی اور خدمتِ خلق کے کاموں میں اپنے آپ کو کسی سے پیچھے نہیں رکھا۔ ملک کی آزادی کی جدو جہد میں وہ کسی دوسری جماعت کے نہ مقلد تھے نہ پیرو۔ تحریکِ اصلاح و جہاد کے نام سے ان کے بزرگوں نے قیامِ ملت اور ملک اور تمام برادرانِ وطن کی آزادی اور فلاح و بہبود کا جو نصب العین اپنے سامنے رکھا تھا وہ اسی کی طرف بڑھتے رہتے تھے۔ اس میں اپنوں اور بیگانوں سے اختلاف و اتحاد کے مرحلے پیش آتے رہے، لیکن انھوں نے نہ کسی پر بھروسا کیا، نہ کسی کا انتظار! وہ تمام باتوں سے بے نیاز آگے بڑھتے رہے۔

وطنی اور غیر ملکی تحریکات

دار العلوم کے بزرگ فکر و عقیدہ اور علم و تہذیب کی روایات میں جن اسلاف کرام سے نسبت رکھتے تھے اور پھر انھوں نے اپنی تعلیم و تربیت سے جو اصحابِ استعداد اپنی روایات کے امین چھوڑے تھے، انھوں نے ایسا قلبِ گداز اور دلِ دردمند پایا تھا کہ ان کے وطن میں یا بیرونِ وطن دنیا کے دور یا نزدیک کسی ملک میں کسی کا استحصال ہو، کسی کے حقوق غصب کیے جائیں یا کسی کی آزادی چھینی جائے، غرضیکہ اپنی یا کسی غیر قوم کے گلے پر ظلم کا خنجر چلے، وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ ان کی ملت پروری، وطن دوستی اور انسانیت نوازی کی داستانیں تاریخ میں رقم ہیں۔ اصحابِ دار العلوم کی خدمات کا دائرہ وطنی تحریکات سے لے کر غیر ملکی تحریکات تک پھیلا ہوا ہے۔

(۱) وطن کی جنگ آزادی کے ابتدائی دور سے لے کر موجودہ زمانے تک جو ملی اور قومی تحریکیں چلیں، دار العلوم کے اسلاف سے لے کر اخلاف تک سب نے ان میں حصہ لیا۔ تحریکِ اصلاح و جہاد (......تا ۱۸۳۱ء)، جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء)، تحریکِ ریشمی رومال (۱۹۱۶ء)،

تحریکِ ستیہ گرہ یا تحریک مقاومت بالصبر (۱۹۱۹ء)، تحریکِ خلافت و ترک موالات (۲۴-۱۹۱۹ء)، تحریکِ ہجرت (۱۹۲۰ء)، تحریک نمک سازی اور تحریک سول نافرمانی (۱۹۳۰ء وبعدہ)، انفرادی ستیہ گرہ (مقاومت) کی تحریک (۴۱-۱۹۴۰ء)، ہندوستان چھوڑ دو تحریک (۱۹۴۲ء)، تحریکِ پاکستان (۱۹۴۰ء وبعدہ) وغیرہ میں وقت کے ایثار اور جان و مال کی قربانی کی مثالیں قائم کیں۔

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان سخت آزمائش سے دوچار ہوئے۔ ان کی زندگی کا پورا نظام تہ و بالا ہو گیا تھا، ان کی معیشت تباہ ہو گئی تھی، انھیں سخت فرقہ وارانہ تعصب کا سامنا تھا، اغوا، قتل، لوٹ مار کا بازار گرم تھا، انھیں ہر طرف سے خطرات نے گھیر لیا تھا لیکن دارالعلوم کے بزرگوں نے عوام، حکومت اور دستور کی مخالف اور دشمن قوتوں کا ہر سطح پر مقابلہ کیا اور مسلمانوں کی منجدھار میں پھنسی اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچا دیا۔

جن مسائل میں مسلمان ہندوستان میں گرفتار ہوئے، اسی قسم کے مسائل پاکستان میں اقلیتوں کو درپیش تھے۔ دیوبند کے بزرگوں نے دونوں جگہ حالات کا مقابلہ کیا اور متاثرین کی بہترین امداد و حمایت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کے نظام، مقابر و مساجد اور دیگر مقدس مقامات و آثار کے تحفظ، اوقاف کے نظام و بقا کے لیے دستور سازی، متروکہ و غیر متروکہ املاک پر کسٹوڈین اور دوسرے ناجائز قابضین، پاکستان سے واپس جانے والوں کے مسائل کی پیچیدہ صورت حال، تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور زبان کی بقا اور فروغ وغیرہ کے مسائل کا سامنا تھا۔ پاکستان میں فرقہ پرستی، تنگ نظری، عداوت، دشمنی کے کم وبیش اسی قسم کے مسائل درپیش تھے، لوٹ مار کا بازار گرم تھا اغوا، قتل کے واقعات نے زندگی کا سکون و اطمینان چھین لیا تھا۔ ان کے علاوہ جمہوریت کی بقا، دستور سازی، اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد تھی۔ مسلمانوں کی اصلاح، اخلاق کی تہذیب، باطل فرقوں کی ریشہ دوانیاں، غیر اسلامی تحریکات کا ظہور، وغیرہ مسائل درپیش تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے مکتب فکر کے علما و عوام نے ہر محاذ پر حالات کی اصلاح کے لیے سخت جنگ لڑی۔

(۲) دیوبند کے اکابر نے دنیا کے دیگر ممالک کی آزادی، اس کے تحفظ اور ممالک کی بقا و

استحکام کی تحریکات میں بھی حصہ لیا۔ افغانستان، ایران، ترکی، بلقان، حجاز، فلسطین، قبرص، مراکش، طرابلس، الجزائر غرضے کہ ایشیا اور افریقہ و یورپ سے لے کر مشرق بعید کے ممالک تک کی آزادی کی جنگ میں اور وہاں کے عوام پر ظلم اور ان کے استحصال کے خلاف جب بھی کوئی تحریک اٹھی تو دیوبند کے اکابر و اصاغر نے دامے، درمے اور قدمے، سخنے اس میں حصہ لیا اور ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھانے اور مظلومین کی امداد و حمایت میں کوتاہی نہیں کی اور حالات و وقت کے مطابق. ان تمام تحریکات و مسائل میں دین کی تعلیماتِ حقہ کے مطابق مسلمانوں کی بہترین رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

اصحابِ عزیمت وایثار:

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں جمعیت الانصار دیوبند اور ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماے ہند کے قیام سے علماے دیوبند کی ایک جماعت نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں منظم طور پر حصہ لیا۔ اس نے آزادی کی راہ میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں، قید و بند کی سختیاں جھیلیں، مال و متاع کا نقصان برداشت کیا اور تجارت و ملازمت کے بہترین ذرائع معیشت کو اس راستے میں قربان کر دیا۔ اس جماعت کے ایک ایک فرد نے اتنی قید و بند کاٹی اور اتنا نقصان برداشت کیا کہ مسلم لیگ کے تمام رہنماؤں نے مجموعی طور پر بھی نہ اتنی قید کاٹی ہوگی، نہ اتنا نقصان اٹھایا ہوگا۔ صرف ایک شخص مولانا عبیداللہ سندھی نے تقریباً چوبیس سال جلاوطنی کی زندگی کے مصائب برداشت کیے۔ ایک مختصر مضمون میں پوری جماعت دیوبند کی جنگ آزادی میں قید و بند کی تفصیلات کی گنجائش تو نہیں نکل سکتی۔ البتہ وقت کے عظیم مجاہد جماعت کے سربراہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضرت نے مالٹا میں تقریباً ساڑھے تین برس (دسمبر ۱۹۱۶ء تا جون ۱۹۲۰ء)، مقدمہء بغاوت کراچی میں تقریباً دو برس (ستمبر ۱۹۲۱ء تا ستمبر ۱۹۲۳ء)، سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں تقریباً ڈیڑھ ہفتہ (۱۹۳۲ء) اور ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے زمانے میں قریباً سوا دو برس (جون ۱۹۴۲ء تا اگست ۱۹۴۴ء) مجموعی طور پر تقریباً آٹھ برس قید کی زندگی گزاری تھی۔ حضرت کے علاوہ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سید محمد میاں اور جمعیت علماے ہند سے وابستہ

سیکڑوں رہنماؤں اور ہزاروں کارکنوں نے اپنی زندگی کے کتنے برس قید کی کوٹھڑیوں میں گزارے تھے، حد شمار سے باہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علمائے ہند اور دارالعلوم دیوبند کی کوئی ایسی تاریخ ابھی تک مرتب ہی نہیں ہوئی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ان دونوں اداروں سے وابستہ صوبوں کی سطح سے لے کر قصبوں اور قریوں تک کہاں کہاں کتنے لوگوں نے کن کن تحریکات میں کتنی سزائیں کاٹیں اور جان و مال کی کیا قربانیاں دیں اور تجارت، ملازمت وغیرہ ذرائع معیشت کی تباہی کی کن کن آزمائشوں سے گزرے تھے۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے وابستگان سے مجاہدین حریت کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس جماعت میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی ہیں۔ اسی جماعت میں حضرت شیخ الہند کی ذات والا صفات نظر آتی ہے۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ہیں، جاں نثار اسلام مولانا عزیر گل ہیں، امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی ہیں، فقیہ امت مفتی اعظم کفایت اللہ ہیں، مجاہد فی سبیل اللہ مولانا محمد میاں منصور انصاری ہیں۔ عازم حق مولانا محمد صادق (کراچی) وغیرہ، بہت سے اصحاب عزیمت ہیں۔

زنجیر کی آخری کڑیاں:

اس زنجیر کی آخری کڑیاں بھی ابتدائی کڑیوں سے کچھ کم اہم اور کم شاندار نہ تھیں۔ ان میں سے ایک کڑی مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی سیرت میں ڈھل کر ہمیشہ کے لیے تابندہ و زندہ جاوید ہو گئی تھی۔ حضرت سیوہاروی کی ذات ستودہ صفات بارش کا آخری قطرہ تھا، جو ملت کے نخل امید کو تر و تازہ کر گیا۔ انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی جو خدمت کی اور ان کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے جو مجاہدانہ کردار ادا کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں کا اصل میدان تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدوین کا تھا لیکن وہ عملی سیاست میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اور کئی بار قید و بند کی آزمائش سے گزرے۔ اگر ان بزرگوں کے بعد بھی ملت مسلمہ کا وجود باقی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت موجود ہے تو ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ دارالعلوم کے اخلاف میں بھی ایسی نابغہ اور صاحب عزیمت شخصیتیں ضرور پیدا ہوں

گی جوملت کی کشتی کو بھنور سے نکالیں گی اور اس کے مسافر ساحل مراد کو پالیں گے۔ موجودہ دور میں حضرت امیر الہند مولانا سید اسعد مدنی کی ذات گرامی تاریکیوں میں روشنی اور مایوسیوں میں امید کی کرن موجود ہیں۔ ملت اسلامیہ ہندیہ کے نخل امید کی برومندی کی تمام آرزوئیں حضرت مدظلہ کے وجود سامی سے وابستہ ہیں۔ پچھلی ربع صدی کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، حضرت موصوف کی فراست وتدبر اور جرأت مندانہ قیادت نے مسلمانوں کو بعض بڑے کٹھن مراحل اور مشکل حالات سے نکالا ہے اور نہ صرف ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی کی بلکہ پوری ہندوستانی قوم کو اتحاد وترقی اور عزت ووقار کی راہ دکھائی ہے۔

ادبی ولسانی خدمات:

اردو زبان کے باب میں بھی اکابرِ دیوبند کی خدمت کا پیمانہ نہایت بلند رہا ہے۔ اردو کو آسان بنانے، بول چال کی زبان سے اسے ہم آہنگ کرنے اور ایک علمی زبان کا رتبہ دینے میں سرسید کی خدمات کا صور کچھ اس بلند آہنگی سے پھونکا گیا ہے کہ لوگ یہی سمجھ بیٹھے کہ اس تحریک کے قافلہ سالار سرسید ہیں۔ ان بے خبروں کو معلوم نہیں کہ تاریخ کی شہادت اس سے مختلف ہے۔ سرسید کی پیدائش کا سال ۱۸۱۷ء ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین کا سال وفات بھی یہی ہے۔ شاہ عبدالقادر کا انتقال اس سے تین سال قبل یعنی ۱۸۱۴ء میں ہو چکا تھا۔ ان ہر دو ابنائے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فرد خدمات میں ترجمہ قرآن بہت نمایاں ہے۔

شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی اوّلیت اور حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی سلاست اور با محاورہ وٹکسالی زبان میں ہونے کی شہادت سرسید نے خود دی ہے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق تک اردو کے تمام مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان کے ترجمے کے ادبی ولسانی محاسن کا اعتراف کیا ہے۔ بلاشبہ یہ وہ حضرات تھے جن کی خدمات کو دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے زمرے میں محسوب نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ وہ اسلاف تھے جن کی وراثت علمی ودینی کا سب سے زیادہ حصہ اصحاب دارالعلوم ہی کے نصیب میں لکھا گیا تھا۔ ان اصحاب کے بعد مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل شہید کا دور آتا ہے۔ یہ زمانہ سرسید کی خوردسالی کا تھا۔ ان حضرات کی خدمات کا غلغلہ بلند تھا اور ٹکسالی اور با محاورہ اردو میں ان کی عظیم الشان کتاب ''تقویۃ الایمان'' منصۂ

شہود پر آ چکی تھی۔ سرسید نے حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کے مطالب سے اپنے دامن فکر کو بھرا تھا۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحب بھی بانیان دارالعلوم میں نہ تھے لیکن اس ابراہیم وقت کی میراثِ فکر وسیرت تو اکابر دیوبند ہی کے حصے میں آئی' نہ کہ سرسید اس کے وارث ہوئے؟ لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی، قطبِ وقت حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تو دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ حضرات اس وقت بامحاورہ بول چال کی زبان اور آسان وعام فہم اردو میں اپنی متعدد کتب و تصانیف تالیف فرما چکے تھے۔ جب بانی علی گڑھ کالج سرسید احمد خاں صہبائی مرحوم سے مقفیٰ و مسجع زبان لکھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ حضرت قاسم نانوتوی کی تالیف رسالہ حجۃ الاسلام، تقریر دل پذیر، مجموعہ رسائل، قاسم العلوم وغیرہ، حضرت امداداللہ کی تصانیف غذاے روح' ضیاء القلوب' تحفۃ العشاق' فیصلہ ہفت مسائل اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی تصانیف کا تعلق خاص سرسید کے عہد سے تھا۔ یہ حضرات بانیانِ دارالعلوم تھے۔ ان کی تصانیف کے ادبی محاسن اور لسانی خصائص کی طرف کم توجہ کی گئی ہے' لیکن ان کا دایرہ اس سے بہت وسیع ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ان کی ادبی اور لسانی خدمات کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سرسید کتمانِ عدم سے وجود میں بھی نہ آئے تھے۔ ان کی خدمات کا یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری تھا جب ان کے دودھ کے دانت بھی نہ اکھڑے تھے۔ وہ یہ خدمت اس وقت بھی اپنے قلم سے انجام دے رہے تھے جب سرسید اپنی تحریر و تالیف میں صہبائی کی نظر و کاوش کے رہین منت تھے اور یہ خدمت انھوں نے اس وقت بھی انجام دی، جب سرسید ''انگریزی حکومت کی برکتیں'' اور برٹش حکومت کے قیام اور استحکام کے لیے ''اپنی مدد آپ'' قسم کے مضامین لکھ رہے تھے اور دیوبند کی یہ خدمت اس وقت بھی جاری رہی جب اردو ادب کے عناصر خمسہ میں اختلال پیدا ہو گیا اور رفتہ رفتہ منتشر ہو گئے۔ سرسید اس جہاں سے رخصت ہو گئے اور ان کا کوئی جانشین پیدا نہ ہو سکا۔ نذیر احمد' شبلی' محمد حسین آزاد دوسرے دایروں سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے سرسید کی تحریک کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ حالی بلاشبہ اپنی وفاداری میں استوار رہے، لیکن ان کے جانشینوں نے ادب میں اپنی راہ آپ بنائی۔ بہرحال سرسید نے زبان وادب کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ اس سے ہرگز انکار نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ اولیت کا سہرا اس میدان میں بھی اربابِ دیوبند اور ان کے بزرگوں ہی کے سر ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصدِ اولیٰ

(دورِ قاسمی اور عہدِ محمودی پر ایک سرسری نظر)

(۱)

دورِ قاسمی اور اس کے خصائص

تحریک ولی اللّٰہی کا نیا دور:

دارالعلوم دیوبند کا قیام شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک کے دورِ تجدید واحیاے ثانی کا آغاز تھا۔ ولی اللّٰہی تحریک،

(۱) تالیف وتدوین افکار

(۲) تعلیم وتربیت افراد اور ترویج واشاعت مقاصد......اور

(۳) تنظیم جماعت وسعی انقلابِ حالات کے تین اہم مراحل سے گزری تھی اور ۱۸۵۷ء میں مساعی انقلاب کی ناکامی کے بعد ضرورت پیدا ہوگئی تھی کہ

۱- کسی نئے مرکز کی تلاش کی جائے جو دہلی کے مرکز انقلاب کے مقابلے میں محفوظ ہو۔ اس کے لیے دیوبند (ضلع سہارن پور) کے قصبے کا انتخاب کیا گیا۔

۲- نئے حالات میں افکار انقلاب کے تحفظ، تعلیم وتربیتِ اصحاب، ترویج واشاعتِ افکار اور تنظیم جماعت کا سروسامان کیا جائے۔ انھی دو اہم مقاصد کے حصول کے لیے دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے مربی:

دارالعلوم کے بانیوں میں متعدد حضرات شامل تھے لیکن اس کے قیام کا جو جامع تصور تھا وہ حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سوا کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ دارالعلوم میں تعلیم وتربیت اصحاب استعداد، ترویج واشاعت افکار اور تنظیم جماعت کے تمام کام دارالعلوم کے دو

اکابر، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمود حسن دیوبندی کے عہد میں تقسیم ہیں۔ حضرت قاسم العلوم کا کارنامہ منصوبہ بندی، مرکز انقلاب کے قیام، اجتماع و اتحادِ قویٰ اور تعلیم و تربیت کے دایروں میں ہے اور حضرت شیخ الہند کا کارنامہ تعلیم و تربیت اصحابِ استعداد سے لے کر تنظیم قوائے ملت، اتحادِ اجزائے قوم اور افکار و اعمالِ انقلاب کے تمام جزئیات و کلیات تک وسیع ہے۔

دارالعلوم کے قیام کا مقصد اولیٰ:

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد محض ایک دینی درس گاہ کا قیام نہ تھا بلکہ وہ احیائے اسلام اور قیامِ ملت کی ایک ہمہ جہت تحریک تھی۔ اس میں دینی و اسلامی علوم وفنون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مسلمانوں کی ذہنی، فکری اور عوائد و رسوم کی اصلاح اور دعوت و ارشاد بھی شامل تھی۔ تبلیغ و اشاعت اسلام بھی اس کی ایک جہت تھی۔ اسلامی زندگی کا قیام اور ملک و قوم کی آزادی بھی اس کے مقاصد کے دایرے میں آتی تھی۔

دیوبندی جماعت اور اس کا سلسلہ:

دارالعلوم نے جو جماعت تیار کی تھی، اس میں مختلف صلاحیتوں کے اصحاب شامل تھے اور اگرچہ بہ ظاہر الگ الگ اپنے کاموں میں مصروف تھے لیکن بہ باطن ان میں ایک رابطہ اور اتحادِ فکری موجود تھا۔ تمام قوائے جماعت تقسیم کار کے اصول پر کامل نظم و ضبط کے ساتھ مصروفِ عمل تھے۔

اس سے آگے بڑھ کر ملک کی دوسری مذہبی (سیاسی جماعتوں اور مردانِ کار سے بھی تعلقات استوار کر لیے گئے تھے جو بنیادی طور پر دارالعلوم کے مذہبی) اور سیاسی مکتبۂ فکر سے تو تعلق نہ رکھتے تھے لیکن ولی اللہی سلسلے کے بزرگوں سے عقیدت و ارادت یا دینی و ملی یا سیاسی و قومی مقاصد میں اتحاد و اتفاق کا کسی نہ کسی درجے میں کوئی رشتہ ضرور رکھتے تھے۔ البتہ یہ کام بہت احتیاط اور رازداری کے ساتھ انجام پا رہا تھا۔ حتیٰ کہ دارالعلوم کے لوگوں کو بھی جو سیاسی ذوق سے ناآشنا تھے، خبر نہ تھی۔

دارالعلوم دیوبند نے علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس، دعوت و ارشاد، اصلاحِ عواید و رسوم، تصنیف و تالیف اور تدوین علوم و معارف کے میدانوں میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی خدمات کا دایرہ ملک کی آزادی، برٹش استعمار سے عوام کی نجات اور برطانوی قوم کے استحصال سے قوم کو نجات دلانے کی کوششوں، قومی و سیاسی شعور کی تربیت، قوائے ملکی و قومی میں اتحاد قوم و وطن کی تعمیر کے تمام کاموں، سماج اور سیاست کے تمام میدانوں اور عوام کی زندگی کے تمام گوشوں تک پھیلا ہوا ہے۔

ایک سوچا سمجھا منصوبہ:

دارالعلوم کے مردانِ کار نے سیاسی زندگی کے مقاصد اور ملک و قوم کی خدمت کے میدان کو محض اتفاق یا حادثے کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ ملک کے بعض دوسرے اداروں کے افراد حالات کے جبر یا کسی سیاسی تحریک یا شخصیت سے متاثر ہو کر سیاسی میدان میں آئے تھے۔ ملک کی سیاسی و سماجی خدمت اور قوم کو برٹش استعمار کے استحصال سے نجات دلانا اور قومی و سیاسی نظام کا احیا دارالعلوم کے مقاصد قیام میں شامل تھا۔

دارالعلوم کے مقاصد قیام کا یہ پہلو اتنا واضح اور نمایاں ہے کہ اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں لیکن اس موضوع کا تقاضا ہے کہ اسے خاص طور پر نمایاں کیا جائے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی دارالعلوم کے قیام کے پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جس وقت شاملی کے میدان سے وہ خود (حضرت قاسم نانوتوی) اور ان کے رفقائے کار بہ ظاہر ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے تو یقیناً ان کی یہ واپسی یاس اور نامرادی کی واپسی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ واپس تو وہ بے شک ہوئے تھے لیکن یقیناً یہ واپسی ''متحرفاً لقتال او متحیزاً الی فئة'' جنگ ہی کے لیے کتراتے ہوئے یا کسی ٹولی سے ملنے کے لیے ہو سکتی تھی اور یقیناً اسی کے لیے تھی۔''

(سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۳-۲۲۲)

نئے محاذِ جنگ کی تیاری:

آگے چل کر دارالعلوم کے قیام کو "قتال کے نئے محاذ اور میدان کی تیاری" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ (حضرت نانوتوی) کا دماغ مصروف ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اس لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی وجوہری عنصر تھا۔" (ایضا: ص ۲۲۳)

مولانا سید محمد میاں مرحوم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے دارالعلوم کے قیام کے بعد جب اسی جماعت کے ایک بزرگ حاجی رفیع الدین نے (جو دارالعلوم کے دوسرے مہتمم حضرت شاہ عبدالغنی کے خلفاء میں سے تھے) عرض کیا:

"ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا فرمائی جائے تو آپ نے فرمایا:

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاے اسلام اور تحفظ علم دین کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔"

(علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: (حصہ اول) ص ۱۷)

مولانا گیلانی نے اس پر لکھا ہے کہ

"اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہوکر سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھ گئے تھے۔ "بقاے اسلام اور تحفظ علم دین" کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لیے دماغ بھی مصروفِ فکر تھا اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لو لگائے "غیبی لطیفہ" کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔" (سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۴)

اس ''نئے محاذ'' کے قیام کی حکایت میں مولانا گیلانی مرحوم کے لیے نہ جانے کتنی لذت تھی کہ وہ ''سوانح قاسمی'' کی بڑی تقطیع کے صفحات میں صفحہ ۲۲۲ سے لے کر صفحہ ۲۲۵ بلکہ اس کے بعد تک اسے دراز کرتے چلے گئے ہیں۔ اس بیان کے چیدہ چیدہ جملوں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے، تاکہ دارالعلوم کے مقاصد قیام کا یہ پہلو قارئین کرام کے ذہن مین خاص طور پر نمایاں ہو جائے کہ دارالعلوم کا قیام محض ایک درس گاہ کے قیام کا واقعہ نہ تھا بلکہ ملک کی آزادی اور قیام ملت اسلامیہء ہند کی تاریخ کے ایک نئے دور کے آغاز کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''الغرض واپس ہونے والا جب واپس ہوا تھا تو کسی ''نئے محاذ'' ہی کے قائم کرنے اور اس ''فئۃ'' یا جماعت سے رشتہ اتصال و رابطہ کو درست کرنے ہی کے لیے واپس ہوا تھا۔ جس کے اجتماعی شیرازے کو درہم برہم کر کے چاہا جا رہا تھا کہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا جائے۔''
>
> (ایضا: ص ۲۲۵)
>
> ''واقعہ یہی ہے کہ دیکھنے والوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رُست و خیز کے ڈھیلے پڑ جانے کے بعد اُس (حضرت نانوتوی) کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا بہ ذاتِ خود اس کے لیے اور واپس ہونے والے ساتھیوں کے لیے یہ سب کچھ دیکھا بھالا تھا۔ ایک طے شدہ ''لائحہ عمل'' تھا۔ اپنے وقت پر اس کے فیصلے عملی قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مصلحتِ الٰہیہ اور ''اجل مسمی'' کا اٹل قانون ہندی مسلمانوں کے اندر اس کے قیام کی مدت کو اگر حد سے زیادہ مختصر نہ کر دیتا تو دیکھنے والوں کو خدا ہی جانتا ہے وہی کیا کیا کر کے دکھاتا۔'' (ایضا: ص ۲۶-۲۲۵)
>
> ''مدرسے کے اجرائے قیام کی حد تک وہ (مولانا قاسم نانوتوی) اپنے اور اپنے رفقائے کار کے اسی طے شدہ ''لائحہ عمل'' کے ساتھ ''نئے محاذ'' کے کھولنے کے لیے صرف صالح اور قابل ذہن کی تلاش میں سرگرداں

تھا۔ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام جس میں عصری اقتضاؤں کی تکمیل کا بھی سروسامان تھا اس کے اس لائحہ عمل کا اہم ترین جز بلکہ قالب کے لحاظ سے سب کچھ وہی تھا کہ نئے محاذ کا یہ نیا قالب یا ''عملی مرقع'' کہاں قائم ہو۔ (ایضاً:ص۲۹-۲۲۸)

''اسی نئے محاذ کے بانی سیدنا الامام الکبیر (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی) کے دیو بند والوں سے قرابت قریبہ کے موروثی تعلقات پشتہا پشت سے قائم تھے۔ (ایضاً:ص۲۳۰)

وہ ''نیا محاذ'' جسے سیدنا الامام الکبیر شاملی کے میدان سے واپس ہونے کے بعد کھولنا چاہتے تھے اس ''نئے محاذ'' اور اس کے دوررس مضمرات و مکنونات خواہ کچھ ہی ہوں لیکن ظاہری قالب تو اس کا یہی تھا کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی حفاظت کے لیے دینی تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں جہاں تک ممکن ہو بڑی سے بڑی تعداد دینی علوم کے علم برداروں کی پھیل جائے۔ اس جدید تعلیمی نظام کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے قدیم علما کی تدریس و تعلیم کا آزاد اور انفرادی طریقہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک قطعاً ناکافی تھا۔ اپنے اسی اصولی نقطۂ نظر کے زیر اثر آپ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی ممکنہ حد تک سمونے اور جذب کرنے کی صورت چاہا جاتا تھا کہ نکالی جائے۔'' (ایضاً:ص۲۳۳)

۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی:

اور اب تو اس حقیقت کو شمس العلماء حافظ محمد احمد کے صاحبزادۂ مرحوم نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ دارالعلوم کے مقاصد کا دایرہ درس و تدریس کے عام مقصد سے بلند بھی تھا اور بہت زیادہ وسیع بھی! حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کا بیان کفایت کرتا ہے۔ اس پر کسی تبصرے کی

ضرورت نہیں لکھتے ہیں:

''عامۃً ان موسس اکابر مدرسہ کا تصور صرف تعلیم و تعلم ہی کی حد تک تھا۔ حتیٰ کہ عمارت مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھنے تک یہی رہا۔ جب کہ مدرسے کے اجرا پر آٹھ نو سال بھی گزر چکے تھے۔ یہ وسیع اور عالم گیر نصب العین ان کے سامنے نہ تھا جو حضرت قاسم العلوم اور ان کے رفقاے جہاد شاملی بہ اشاراتِ غیب و بہ فیضان ولی اللہ و امداد اللہ اپنے اندر لیے ہوئے تھے اور جہادِ شاملی کے بعد یہ مقاصد اور بھی زیادہ قوت اور عزیمت کے ساتھ ابھر آئے جس کا سرچشمہ حضرت حاجی امداد اللہ اور سرخیل حضرت قاسم العلوم تھے۔

اس ولی اللہی اور امداد اللہی تصور میں اوپر تعلیم کا پردہ تھا اور نیچے اسی تعلیمی لائن سے اعلاے کلمۃ اللہ، مسلمانوں کی آفاقی عزت و شوکت اور ملت کی عالم گیر خدمت کے اجتماعی جذبات پنہاں تھے۔ اسی حقیقت کو نمایاں کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مضمون ''دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' جو ''دارالعلوم'' (رسالہ) میں شائع شدہ ہے۔ حضرت شیخ الہند کا یہ مقولہ نقل ہے:

''حضرت الاستاذ (حضرت مولانا نانوتوی) نے کیا اس مدرسے کو درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔''

(نیز دیکھیے ''سوانح قاسمی''، ج ۲، ص ۲۲۶)

☆ چناں چہ حضرت نے احاطہ مدرسہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھانے کا بندوبست بھی فرمایا۔ تاکہ علم کے ساتھ سپاہیانہ اسپرٹ بھی ان میں

قائم رہے۔

☆ محکمہء قضا بھی قائم فرمایا تاکہ تنفیذ احکامِ شرعیہ کی خوبھی ان میں محفوظ رہے۔

☆ ترکوں کی امداد کے لیے بھی مساعی فرمائیں۔

☆ سلطان ترکی کی مدح میں قصائد بھی لکھے تاکہ خلافت اسلامیہ سے مدرسے کے نونہالوں کا ربط قائم رہے۔

☆ انگریزی تسلط کے بعد ایسی اجتماعی انجمنوں کی حمایت وتائید بھی کی، جو انگریزوں سے ملکی حقوق حاصل کرنے کے لیے قائم کی گئیں۔

☆ حضرت کی وفات کے بعد ان کے علمی جانشین شیخ الہند رحمہ اللہ نے ان ملی مقاصد کو آگے بڑھایا اور پھر ان کے تلامذہ نے بھی تعلیمی لائنوں کو مضبوط کیا مگر اجتماعی خدمات سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی، بلکہ آزادی کی تمام تحریکات میں قائدانہ حصہ لیا۔ ان کے سرخیل اگر انگریزوں کے مقابلے میں میدان شاملی میں سربکف تھے تو ان کی ذریت اسی انگریز کے مقابلے میں قید و بند اور جیلوں میں سربکف رہی اور آج بھی کلمہء حق کہنے میں آگے ہی آگے ہے۔"

(مقدمہ ءتاریخ دارالعلوم دیوبند: (اشاعت کراچی)، ص ۴۳ تا ۴۵)

حقیقت کا اعتراف:

یہ بیان شمس العلماء حافظ محمد احمد علیہ الرحمہ کے صاحبزادۂ محترم قاری محمد طیب مرحوم کا ہے اور اس بات کا کھلا اعتراف کہ ۱۹۱۳ء میں دارالعلوم میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے اور حضرت شیخ الہند کے مقابلے میں شمس العلماء مرحوم نے جو رویہ اور برٹش استعمار پرستانہ جو پالیسی اختیار کی تھی وہ ہرگز درست نہ تھی۔ مدرسے کے مقاصد قیام کے بارے میں حضرت شیخ الہند کا مسلک ہی درست تھا اور جس حقیقت کو ۱۹۱۳ء میں جھٹلایا گیا تھا اسے چونسٹھ برس کے بعد انھی مرحوم کے بیٹے نے تسلیم کرلیا۔ اگرچہ انھوں نے بھی اس دور کے نہایت اہم تاریخی واقعات کو اپنے مقدمہ

میں نظر انداز کر دیا ہے۔ اپنی ''مختصر تاریخ دارالعلوم'' میں ان واقعات کی پرچھائیں نہیں پڑنے دی اور سید محبوب رضوی کی جامع ''تاریخ دارالعلوم'' میں بھی جمعیت الانصار کے قیام اور مولانا عبیداللہ سندھی کے تذکرے میں مصنف کو اسی اندازِ فکر کو اپنانے، بلکہ انھی جملوں کو اختیار کرنے کی طرف رہنمائی کی جو خود انھوں نے اپنی مختصر تاریخ میں اختیار کیے تھے لیکن تاریخ نے بالآخر اس حقیقت کو منوا ہی لیا۔ بھلا کہاں گورنر یو پی سر جیمس مسٹن کے حضور سپاس نامے میں یہ فرمانا کہ

> ''ہمارا ایک اور صرف ایک مقصد ہے اور وہ ہے ''مذہبی آزادی کا تحفظ اور صرف مذہبی آزادی کا تحفظ'' اس سے ہٹ کر کسی سیاسی تحریک کو مسترد کرنا یا قبول کرنا ہمارے قائم اور نا قابل تبدیلی نظریے کے باہر ہے۔ اگر حکومت اسلام اور اس کے عقائد و رسوم کو اور ہمارے ''حقیقی لیڈر'' کو واقعی عزت دیتی ہے تو دل اور زبان سے اس کا شکریہ ادا نہ کرنا یا اپنے کسی عمل سے اس کے لیے مشکلات پیدا کرنا انتہائی ''ناشکری'' اور ''معصیت'' ہے۔

اور کہاں شمس العلما کے صاحبزادۂ نامدار قاری محمد طیب کا یہ اعتراف کہ

> ''حضرت شیخ الہند نے ملی مقاصد کو آگے بڑھایا پھر ان کے تلامذہ نے اجتماعی خدمات انجام دیں۔ آزادی کی تمام تحریکات میں حصہ لیا۔ انگریز کے مقابلے میں قید و بند کی زندگی کو اختیار کیا اور کلمۂ حق کہنے میں آگے رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بلاشبہ دارالعلوم میں یہ کارنامہ انجام دیا گیا، مگر ان کے شاگرد اور جانشین علمی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، ان کے بعض تلامذہ مولانا عبیداللہ سندھی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم اور ان کی ذریت نے خصوصاً ان کے بعد مولانا سید اسعد مدنی نے جو شمس العلماء اور ان کی ''ذریت'' کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتے رہے۔

جب نئے محاذ کے قیام کا فیصلہ کیا جا رہا تھا تو کئی مقامات کے نام ذہن میں آئے تھے لیکن یہ سعادت تو اللہ تعالی نے پہلے ہی دیو بند کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ مولانا سید محمد میاں نے

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں:

''یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گراں مایہ کو یہ سرزمین لے اڑی۔'' (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: حصہ اول، ص ۷۱)

مدارس کا وسیع نظام اور اس کا مقصد:

دارالعلوم کے اعلیٰ دماغ اور بلند فکر بانی کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ پورے ملک کی اجتماعی زندگی میں انقلاب اور قیام ملت کی ضرورت کے لیے صرف دیوبند کا مرکز انقلاب اور محاذ ہی کافی نہیں ہوسکتا۔ ضرورت تھی کہ ملک کے مختلف علاقوں اور ان کے شہروں میں یہ محاذ قائم کیے جائیں جو اپنے اپنے دائروں میں خدمات انجام دیں۔ البتہ اُن کا فکری تعلق دیوبند کے مرکزِ انقلاب سے ضرور ہو۔ چناں چہ مولانا گیلانی مرحوم کے بہ قول:

''دیوبند میں اس نئے محاذ کی بنیاد ڈالنے کے بعد دیوبند کے علاوہ مراد آباد، نگینہ، تھانہ بھون وغیرہ میں اس کی شاخیں سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشا کے مطابق کھلتی چلی گئیں۔''

مراد آباد، امروہہ، نگینہ اور سہارن پور کے مراکز کا قیام تو دارالعلوم دیوبند کے قیام کے تھوڑے ہی عرصے بعد عمل میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد تو یہ تحریک ایسی پھیلی کہ ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں کوئی مدرسہ ہو اور اس کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے نہ ہو یا کوئی مسجد ہو جس میں حضرت قاسم نانوتوی سے عقیدت رکھنے والا اور حضرت شیخ الہند سے نسبتِ ارادت یا رشتہ تلمذ رکھنے والا امام اور خطیب نہ ہو اور کوئی چھوٹا یا بڑا حلقہ درس قائم نہ ہو۔ خاکسار نے ایک مضمون میں جو مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند (از سید محبوب رضوی) کی اشاعت کراچی میں شامل ہے۔ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور دیوبند کی سیاسی خدمات اور قومی و ملی زندگی، شخصیات اور تحریکات پر اس کے اثرات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس لیے یہاں ان مطالب کے اعادے کی ضرورت نہیں۔[1]

---

(۱) ''دارالعلوم دیوبند...... ہندوستان میں عظمت اسلام کی اک زندہ جاوید یادگار'' کے عنوان سے جو مضمون اس مجموعہ مضامین میں شامل ہے۔ یہ وہ مضمون ہے جو تاریخ دارالعلوم دیوبند (کراچی ایڈیشن) میں شامل ہے۔ یہاں اصلاح و ترمیم و اضافہ مطالب کے بعد بالکل ایک نیا مضمون بن گیا ہے۔

(۲)

عہد محمودی اور اس کے کارنامے

دارالعلوم دیوبند......سیاسی سفر کا آغاز:

حضرت شیخ الہند کے سامنے دارالعلوم کے قیام کے علمی و تعلیمی اور اجتماعی و سیاسی دونوں پہلو تھے۔ حضرت کا تعلق دارالعلوم کے عہد قیام سے، بہت قریبی رہا تھا۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی کا شمار دارالعلوم کے ''اکابرستہ'' میں ہوتا ہے جو دارالعلوم کی تنظیم، تعمیر، ترقی کے تمام امور میں حضرت قاسم العلوم کے ساتھ شریک رہے تھے اور جنھیں ان کے ذوق و خدمات کی بنا پر وہ دارالعلوم کے اولین بانیوں میں شمار ہوتے تھے (تاریخ دارالعلوم دیوبند)۔ حضرت شیخ الہند دارالعلوم کے پہلے طالب علم تھے۔ گھر سے باہر تک ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی ولی اللہی جماعت کے ارکان نے کی تھی۔ وہ دارالعلوم کے قیام کے مقاصد سے کسی کے بتانے سے پہلے واقف تھے۔ وہ اپنی اس واقفیت کے لیے کسی اخبار یا کتاب کے مطالعے کے محتاج نہیں تھے۔ ان کی واقفیت کسی پراسپکٹس یا دستاویز کے مطالعے پر مبنی نہ تھی بلکہ شاملی کے معرکے میں شریک ہونے والی جماعت کے پسپا ہونے اور قومی و ملی مقاصد کے لیے جدوجہد کا نیا محاذ کھولنے والوں کی نجی محفلوں اور راز و نیاز کی گفتگوؤں پر مبنی تھی۔ حضرت شیخ الہند کی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی اور دارالعلوم کے بانیانِ کرام کی جماعت نے کی تھی۔ حضرت اس جماعت کے ارکانِ عظیم الشان کے شاگرد اور مرید تھے۔ اسی جماعت کے بزرگوں نے انھیں قرآن و حدیث کے درس دیے تھے، اسی جماعت نے انھیں شریعت و طریقت کے رموز سکھائے تھے، اسی جماعت نے انھیں قومی و ملی سیاست کے بھیدوں سے آشنا کیا تھا۔ حضرت شیخ الہند کو بہ یک وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت قاسم العلوم و الخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی سے نسبت بیعت تھی اور خلعت خلافت حاصل تھی اور نہایت فخر کا مقام یہ تھا کہ وہ ان حضراتِ گرامی منزلت کے مرید ہی نہیں ''مراد'' تھے۔ حضرت قاسم العلوم

نے ان کی تعلیم وتربیت میں خاص ہمت صرف فرمائی تھی۔ حضرت شیخ الہند حضرت قاسم العلوم و الخیرات کے تربیت یافتہ تھے، انھیں حضرت کا اعتماد حاصل تھا۔ مولانا قاری طیب صاحب نے بھی انھیں حضرت قاسم العلوم کا ''جانشین علمی''، تسلیم کیا ہے۔ وہ حضرت الاستاذ الکبیر کے مزاج شناس اور واقف اسرارِ نہاں تھے۔ دارالعلوم کے بانیوں اور ابتدائی مخلصین ومحسنین کے سلسلے میں جن بزرگوں کے نام آتے ہیں، حضرت شیخ الہند نے ان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان سے علمی وروحانی استفادہ کیا تھا اوران کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔

عہدِ محمودی کے خصائص چہارگانہ:

دیوبند کی عظمت کی داستان حضرت شیخ الہند نے ہم دورافتادگانِ عہد کی طرح کتابوں میں نہیں پڑھی تھی۔ اُس کی عظمت کا نقش حضرت کی نگاہوں کے سامنے اُجاگر ہوا تھا اور پھر آپ نے خود بھی اسے عظیم سے عظیم تر بنانے میں حصہ لیا تھا۔ پھر تاریخ نے وہ وقت بھی دیکھا کہ وہ حضرت قاسم العلوم کے علمی جانشین اور آپ کی جماعت کے رہنما بنے۔ دارالعلوم میں انھیں مرکزیت اور مرجعیت کا مقام حاصل ہوا۔ دارالعلوم کی صدارت اور اجتماعی زندگی میں ان حضرات کا بلند کیا ہوا علم آپ کے ہاتھوں میں آیا، جسے حضرت نے پوری قوت اور ہمت کے ساتھ پوری زندگی سربلند رکھا۔ حضرت شیخ الہند کے ان چہارگانہ خصائص اور خدمات کو تاریخ بھلا نہیں سکتی۔

۱- حضرت کی ذاتِ گرامی اور خدماتِ دینیہ واجتماعیہ سے دارالعلوم کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

۲- حضرت شیخ الہند نے حضرت مولانا محمد قاسم کی نہ صرف سیاسی تحریک کو آگے بڑھایا بلکہ آپ کی علمی وتعلیمی تحریک کو بھی وقار بخشا اور حضرت نانوتوی کے فیضانِ علمی اور منصوبۂ تعلیمی کو کہیں سے کہیں پہنچادیا۔

۳- حضرت نے قاسمی جماعت کو منظم کیا، اس پر عمل وانقلاب کا دروازہ کھولا اور اُسے ایک بین الاسلامی انقلابی تحریک بنادیا۔

۴- حضرت نے ہندوستان کے طول وعرض میں اس کے اثرات کو پھیلایا

اور مسلمانوں کی اس ملی تحریک کو ہندوستان کی کل قومی انقلابی تحریک کا
حصہ بنا دیا۔

جمعیت الانصار کا قیام:

تعلیم و تربیت کے ایک زمانے تک تو یہ بات چھپی رہی لیکن ترویج و اشاعت افکارِ سیاسی واجتماعی اور تنظیم جماعت کے دور میں رفتہ رفتہ یہ بات ظاہر ہوگئی کہ تعلیم و تربیت اور ترویج و اشاعت افکار سیاسی کا مرکز اور انقلاب کا سرچشمہ دارالعلوم اور تعلیم و تربیت سیاسی کے سب سے بڑے معلم اور مربی دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا محمود حسن دیوبندی ہیں۔ ایک مدت تک ان کا یہ کام ایسی رازداری اور اتنی خوش اسلوبی سے چلتا رہا کہ خود دارالعلوم کے ارکان کو بھی اس کا پتا نہ تھا۔ دارالعلوم کے بانی اعظم حضرت مولانا محمد قاسم کا یہ قول ہے کہ ہم نے دارالعلوم کے اصل مقصد پر درس و تدریسِ علومِ اسلامی کا پردہ ڈال دیا ہے۔ ہر شخص کی زبان پر تھا لیکن وہ اصل مقصد کیا تھا اور کہاں اور کس طرح انجام پا رہا تھا کسی کو پتا نہ تھا۔ حال آں کہ یہ کام اس حد تک انجام پا چکا تھا کہ متعدد اصحابِ استعداد کی سیاسی تربیت مکمل ہو چکی تھی ملک کی سیاسی انقلابی شخصیتوں اور جماعتوں سے روابط اور ملک کے متعدد علمی، دینی اور انقلابی مراکز سے سیاسی تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ دارالعلوم کے کئی فارغ التحصیل ملک کے مختلف علاقوں میں سیاسی کاموں میں مصروف تھے۔ یہ راز ۱۹۱۰ء میں جمعیت الانصار کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ کھلا اور جب راز کا انکشاف ہوا تو نہ صرف دنیا بلکہ دارالعلوم کے بعض حضرات بھی حیران و ششدر رہ گئے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری حضرت شیخ الہند اور دارالعلوم سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے لیکن انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت اپنے مخصوص تلامذہ و مریدین سے بیعت جہاد بھی لیتے ہیں۔ جب معلوم ہوا تو انھیں اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ حال آں کہ حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز اور اسارت مالٹا کے زمانے میں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں تحریک شیخ الہند اور دارالعلوم کی سب سے اہم شخصیت تھے لیکن ایک عرصہ دراز تک حضرت شیخ الہند کی عملی، سیاسی سرگرمیوں کا انھیں بھی پتا نہ تھا۔

جمعیت الانصار کے مقاصد:

۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ سندھی کو دار العلوم بلایا اور جمعیت الانصار کے قیام اور اس کے تحت دار العلوم کے قدیم طلبہ کی تنظیم کا کام ان کے سپرد کیا۔ جمعیت الانصار کے اغراض و مقاصد اسی زمانے میں کتابچے کی شکل میں [1] اور رسالے القاسم میں چھپ گئے تھے۔ ''تذکرہ شیخ الہند'' (از مفتی عزیز الرحمٰن) میں بہ تفصیل اور دیگر کتب میں بھی موجود ہیں لیکن ہم یہاں ''ریشمی خطوط سازش کیس'' سے ان مقاصد پر روشنی ڈالتے ہیں:

> ''(جمعیت الانصار) مولوی عبید اللہ کی نظامت اور چھ سات ممبروں پر مشتمل مجلس منتظمہ کے ساتھ قائم ہوئی۔ یہ انجمن دیوبند میں تعلیم پائے ہوئے مولویوں کی انجمن کے طور پر قائم ہوئی ہے تاکہ
>
> ۱- مدرسہء دیوبند کا انتظام کرے اور اس کو بہتر بنائے۔
>
> ۲- مدرسے کے لیے رقم کا انتظام کرے۔
>
> ۳- دیوبند میں جن عقائد کی تعلیم دی جاتی ہے ان کی تبلیغ کرے اور انھیں فروغ دے اور
>
> ۴- دوسرے مقامات پر ایسے ہی مدرسے قائم کرے۔
>
> ۵- تمام مدارس اسلامیہ کو جمعیت الانصار کے تحت کر دیا جائے اور
>
> ۶- دیوبند کے فارغ التحصیل مولویوں کو ایسے تمام مدارس میں بھیجا جائے۔

(تحریک شیخ الہند......ریشمی خطوط سازش کیس: مرتبہ: مولانا سید محمد میاں، کراچی، ص ۳۵-۴۴)

جمعیت الانصار کا قیام منتظمہ کی منظوری سے عمل میں آیا تھا۔ اسی نے اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کی منظوری دی تھی۔ اسی کے فیصلے کے مطابق مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (نائب مہتمم دار العلوم) کو اس کا صدر بنایا گیا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو ناظم اور مولانا ابو احمد آف

---

(۱) قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار لطلبۃ المدرسۃ السالیۃ الاسلامیۃ الدیوبند۔ منظور شدہ جلسہ منعقدہ ۱۳ محرم ۱۳۲۸ھ، احمدی پریس، قاسم المعارف کے نام سے جمعیت الانصار کی کلکتہ اور سندھ میں شاخیں بھی قایم ہوئی تھیں۔ کلکتہ شاخ کا ذکر ریشمی خطوط سازش کیس میں آیا ہے۔ سندھ کی شاخ کے قواعد و مقاصد مستقل کتابچے کی شکل میں مطبع قاسمی دیوبند سے چھپوا کر مولانا عبید اللہ سندھی نے شایع کیے تھے۔

چکوال (ضلع جہلم) کو نائب ناظم مقرر کیا گیا تھا لیکن اس کے بانی حضرت شیخ الہند تھے۔ مولانا سندھی حضرت کی ہدایت کے مطابق ہی کام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کا انھیں قرب اور اعتماد حاصل تھا۔

برٹش حکومت کی تشویش:

جمعیت الانصار کے مقاصد میں بہ ظاہر ایسی کوئی دفعہ شامل نہیں تھی جس سے اس کے سیاسی عزائم و مقاصد کا اظہار ہوتا ہو، لیکن اس کے پہلے سالانہ اجلاس مراد آباد (۱۹۱۰ء) میں جو تجاویز پاس کی گئیں اس سے اندازہ ہوا کہ جمعیت الانصار کالجوں کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشنوں سے قطعاً مختلف اور اس کا دایرہ مقاصد ان سے بہت زیادہ وسیع اور عزائم کاران کے کارکنان سے بہت زیادہ بلند ہیں۔ (۱)

انگریزوں کے لیے تو کسی ملکی تنظیم کا مجرد آزادانہ قیام ہی شکوک وشبہات کے لیے کافی تھا۔ مسلمانوں کی تنظیم واصلاح اور قدیم اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تربیت' قیام مدارس و نظام مبلغین اسلام کی تیاری وغیرہ کے عزائم تو حکومت کے شبہات کو یقین میں بدل دینے کے لیے کافی تھے۔ چناں چہ حکومت اسی وقت چوکنی ہوگئی۔ اس نے مولانا احمد حسن امروہوی سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی اور حضرت شیخ الہند کی آمدنی پر ٹیکس لگا دیا گیا۔ حضرت اس وقت دارالعلوم سے صرف پچاس روپے مشاہرہ وصول فرماتے تھے۔ (۲)

جمعیت کے قیام پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حکومت کو یقین ہو گیا کہ اس کے سامنے صرف وہی مقاصد نہیں جن کا اعلان کیا گیا ہے یا اس کے اجلاس میں پاس شدہ تجاویز سے ہوتا

---

(۱) تجاویز کے مطالعے کے لیے ''قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار...... یا ''تذکرہ شیخ الہند'' از مفتی عزیز الرحمن سے رجوع کرنا چاہیے۔

(۲) حضرت شیخ الہند نے جب دارالعلوم میں خدمات تدریس انجام دینا قبول فرمایا تھا تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے اصرار پر پندرہ روپے مشاہرہ مقرر ہوا تھا۔ پھر کئی بار میں پچاس روپے تک اضافہ ہوا۔ حضرت گنگوہی کے انتقال کے بعد پچھتر روپے آپ کی تنخواہ تجویز کی گئی لیکن یہ اضافہ آپ نے قبول نہ فرمایا اور آخر میں اسے بھی لینا ترک کر دیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں جب حضرت کی پچاس روپے تنخواہ پر ٹیکس لگایا گیا تھا تو دارالعلوم ہی میں مدرس سے لے کر ارباب اہتمام تک کئی حضرات کی تنخواہیں اس سے زیادہ تھیں لیکن برٹش حکومت کی یہ خصوصی نظر صرف حضرت شیخ الہند کے لیے وقف تھی۔

ہے۔حکومت کے خلاف بھڑکانے والی انجمن ہے اور جمعیت الانصار کے پردے میں مسلمانوں کو منظم کیا جارہا ہے۔ریشمی رومال سازش کیس میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے:

''جلد ہی مولوی عبیداللہ نے انگریزی پڑھے ہوئے نوجوانوں کو طالب علم کی حیثیت سے لینا شروع کردیا اور اس انجمن نے نیم سیاسی نوعیت اختیار کرلی۔ جب جنگ بلقان شروع ہوئی اور دیوبند کے ذمہ داروں نے ترکی کی مالی امداد کے جواز کا فتویٰ دیا تو اچانک جمعیت الانصار اپنے اصلی رنگ میں آگئی اور انتہائی متعصب سیاسی جماعت بن گئی۔

مولوی، طلبہ اور دوسرے لوگ مبلغ بنا کر بھیجے جانے لگے اور ترکی کی مدد کے لیے ہلال احمر فنڈ میں بڑی بڑی رقمیں جمع کی جانے لگیں۔

غیر ملکی سامان کے بائی کاٹ کی تبلیغ بڑے شدومد سے کی جانے لگی۔اس کی شاخ قاسم المعارف نے کلکتہ میں چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔

اس پر مدرسے کے عملے کے سنجیدہ لوگ چوکنے ہوئے اور ایسے اختلافات پیدا ہوئے کہ عبیداللہ کو ۱۹۱۳ء میں استعفادینا پڑا۔''

(تحریک شیخ الہند ——ریشمی خطوط سازش کیس: کراچی، ص۳۵-۴۳۴)

حضرت شیخ الہند کی عظمت:

اس ریشمی رومال سازش کیس میں حضرت شیخ الہند کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

☆ دیوبند میں ان کا مکان اتحاد اسلامی کی سازشوں کا گڑھ تھا۔

☆ انھوں نے سیف الرحمٰن، فضل الٰہی، فضل محمود وغیرہ کو سرحد پار قبائلیوں کو جہاد پر بھڑکانے کے واسطے بھیجا۔

☆ ہندوستان میں اتحاد اسلامی کی سازش میں مولانا (محمود حسن) کی رہنمایانہ اور قائدانہ شخصیت بڑی سرکردہ ہے۔(ایضاً: ص۴۴۲)

یہ تھے مولانا محمود حسن جن کی شخصیت کا خمیر قوم وملت کی ہم دردی اور غم خواری کی مٹی سے

اٹھایا گیا تھا۔ جنھوں نے دیوبند کے مدرسۂ اسلامیہ میں ملت کے لیے ایثار وغم خواری کا سبق حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھا تھا اور جب ان کی عمر ستر برس کی تھی تو انھیں جوار حرم میں گرفتار کر کے ملت کے عشق کے جرم میں کامل ساڑھے تین سال کے لیے جزیرۂ مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''مولانا مرحوم ہندوستان کے گذشتہ دورِ علماء کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہدِ حرمان وفقدان میں علماے حق کے اوصاف وخصایل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا تھا۔ وہ علماے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا، عین جوار حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرہ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ مصیبت انھیں صرف اس لیے برداشت کرنا پڑی تھی کہ اسلام وملت اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انھوں نے اعداے حق کی مرضات واہوا کی تسلیم واطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا تھا۔ فی الحقیقت انھوں نے علماے حق وسلف کی سنت زندہ کر دی اور علماے ہند کے لیے اپنی سنت حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔''

(خطبہ، صدارت جمعیت علماے ہند: (اجلاس سوم لاہور)، قومی دارالاشاعت میرٹھ، ص ۱۰)

عمل حق اور اس کا نتیجہ:

حضرت قاسم العلوم نے حریت فکر اور عزیمتِ دعوت کی تخم ریزی کا جو عمل حق انجام دیا تھا حضرت شیخ الہند نے اس شجر طیب کی آبیاری کی اور اس کی نشو ونما وحفاظت کے اعمال حقہ میں اپنی زندگی کے شب وروز گزار دیے اور یہ انھیں اعمال حقہ کا نتیجہ تھا آپ کی وفات پر ابھی پورا ایک قرن نہ گزرا تھا کہ براعظم پاک وہند آزاد ہو گیا اور جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی افریقہ تک پچاسوں ممالک رفتہ رفتہ آزاد ہونا شروع ہو گئے اور جس استعمار کی حکومت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا وہ سمٹ کر ایک چھوٹے سے خطہ زمین میں محدود ہو کر رہ گئی۔

میری ناچیز رائے میں دارالعلوم دیوبند کا عہد محمودی کوئی الگ دور نہیں بلکہ دور قاسمی کا تکملہ ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کے ابتدائی چند برسوں میں بعض انتظامی اور دیگر ایسے واقعات پیش آئے جس کی وجہ سے تشویش پیدا ہوئی لیکن جلد ہی ان حالات پر قابو پالیا گیا اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی صدارت سے دارالعلوم کو جو رہنمائی ملی تھی۔ اس نے دارالعلوم کی عظمت کو چار چاند لگا دیے اور جو مقاصد اس کے قیام کے حضرت بانی اعظم قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر تھے اور گذشتہ کسی دورِ اہتمام میں بعض اوقات دھندلے بھی نظر آنے لگے تھے وہ حضرت مدنی کے عزائم و مجاہدات نے نہایت روشن اور تاباں کر دیے اور اس کی خدمات کا دایرہ مقاصد قیام مصرمہ حضرت شیخ الہند کی آخری حدوں تک پہنچ گیا لیکن اس کے تذکرے کے لیے نہ تو ایک مقالے کی زیادہ سے زیادہ وسعت کافی ہو سکتی ہے اور نہ خاکسار کی کمزور صحت اس موضوع میں کاوش و تحقیق کا حق ادا کر سکتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اردو نوشت و خواند کی معمولی صلاحیت سے تحقیق کا یہ دشوار مرحلہ طے نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کی خدماتِ عملی و علمی کے تمام پہلوؤں ۔ نہ مطالعے کی رسائی ہے نہ ضروری مواد اور کوئی رفاقت و تعاون ہی میسر ہے۔

خدا کی ذات سے ضرور امید ہے کہ جس طرح گذشتہ پچاس ساٹھ برس میں کسی تحریک اور نظم و اہتمام کے بغیر دارالعلوم دیوبند اس کے بانی اعظم اور اس کے متعدد فرزندان گرامی پر عظیم الشان لٹریچر بہم ہو گیا ہے آیندہ حضرت شیخ الحدیثؒ مولانا مدنی کے عہد زریں کے بارے میں بھی وہ سب کچھ مہیا ہو جائے گا جس کو میرا جی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ محض میرے دل کی خواہش نہیں تاریخ کی ضرورت اور وقت کا تقاضا ہے۔ جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ قدرت ضرور اس کی تکمیل کا سروسامان کر دے گی۔

جمعیت علماے ہند

علماے حق کی ایک زندہ وتابندہ یادگار!

جمعیت علماے ہند کا قیام تاریخ کا کوئی حادثہ نہ تھا جو اچانک پیش آ گیا تھا۔اس کے پس منظر میں تقریباً دو صدیوں کے فکر وتدبر، مشاہدات وتجربات، تعلیم وتربیت، سماجی اور سیاسی تاریخ اور وطنی وقومی زندگی میں پیدا ہونے والی تحریکات اور ان کے اثرات کارفرما تھے۔

اس کے قیام کی گفت وشنید میں کئی دیگر علمی خاندانوں اور مکاتبِ فکر کے اصحاب اور علماے وقت بھی نظر آتے ہیں، لیکن اس کے سیاسی سفر میں اور منزل آزادی تک پہنچتے پہنچتے صرف وہی حضرات رہ گئے تھے جن کا تعلق دارالعلوم دیوبند اور اس کے مکتبۂ فکر سے تھا۔ بلکہ دیوبند کی اس انقلابی جماعت سے تھا جس کی نقش آرائی میں حضرت قاسم العلوم کا ذوقِ سیاسی، حضرت شیخ الہند کی سیاسی تربیت اور حضرت شیخ الاسلام کے مجاہدانہ کارناموں کا سب سے زیادہ حصہ تھا۔

عام لوگوں کی نظر میں جمعیت علماے ہند کے قیام کے فوری اسباب میں نظر آنے والی چیز ترکی کے حالات، خلافت کا مسئلہ، اسلامی ممالک کے خلاف برٹش استعمار کا مستبدانہ رویہ اور ایک بدیشی قوم کی غلامی سے پیدا ہونے والے حالات ہی تھے، لیکن اہلِ نظر اور اصحابِ بصیرت جانتے تھے کہ یہ گذشتہ دو صدیوں میں پیش آنے والے حالات اور ایک بہت بڑے فکری انقلاب کا لازمی اور قدرتی نتیجہ تھا۔

ہمارے بزرگوں نے اٹھارھویں صدی میں ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے زوال کے اثرات اور آیندہ صدیوں میں اس کے نتائج کا اندازہ کر کے سیاسی میدان میں قدم رکھا تھا۔ انھوں نے اسلامی اقتدار کے احیاء کے لیے کوششیں کی تھیں، لیکن ان کی منصوبہ بندی سے یہ خیال بھی دور نہ رہا تھا کہ اگر آیندہ صدیوں میں اسلامی اقتدار ہندوستان میں باقی نہ رہا تو مسلمانوں کی آبرومندانہ زندگی کی صورت گری کیوں کر اور کیا ہوگی۔ اس لیے ان کے مساعی

کے دایروں میں اسلامی اقتدار کی مجرد بحالی ہی نہ تھی۔ وہ ان اسباب و موثرات کا تدارک بھی چاہتے تھے جو ملی اقتدار کے قصر کی بنیاد کو رفتہ رفتہ کھوکھلا کر رہے تھے۔ ان کے سامنے منصوبے کی پہلی چیز کسی نئے نظام کی تاسیس نہیں، قدیم نظام ہی کی تجدید اور احیاء تھا۔ وہ اولاً قدیم نظام کی اصلاح اور استحکام چاہتے تھے۔ ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک پورے اسلامی معاشرے اور مسلمانوں کے کل عقائد و اعمال کی اصلاح بھی نہ ہو۔ کل نظام کا مقام اور ایک نئے جہان کی تلاش و تعمیر کی منزل بعد کو سامنے آئی۔ حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے ذہنی واردات، فکری تجربات اور غور و تدبر کے نتائج کو اپنی تالیفات میں مدون اور محفوظ کر دیا تھا اور شاہ عبدالعزیز نے اس فکر کو نہ صرف پھیلا دیا تھا بلکہ اسے عملی دنیا کی ایک موثر تحریک بنا دیا تھا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک اصلاح و جہاد ولی الٰہی سیاسی فکر کی عملی شکل تھی۔ اس کے مقاصد کے خاص دایروں میں مسلمانوں کے اقتدار کا احیاء تھا لیکن پورے ملک میں تمام اہل ملک کے سیاسی، اقتصادی، مذہبی حقوق کی بحالی اور سب کے لیے رفاہیت ناقصہ سے بلند رفاہیت متوسطہ کا قیام تھا۔ برٹش استعمار کے پنجۂ استبداد سے ملک کے کل عوام کی نجات اس تحریک کا منتہائے نظر تھا۔ سید احمد شہید کے خطوط ان کے ان افکار و مقاصد کا آئینہ ہیں۔ وہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کے آرزو مند اور مکمل برصغیر میں مسلمانوں کی باعزت زندگی کے حصول کے لیے سرگرم کار تھے لیکن کسی ملکی نظام و اجتماع کے دشمن نہ تھے۔

۱۸۵۷ء میں اس تحریک کے باقیات و متاثرین نے ملک کی غیر مسلم انقلابی قوتوں کے ساتھ مل کر برٹش استعمار کے استیصال کے لیے جدوجہد کی تھی اور ناکامیٔ حالات کے انتشار و افتراق کے بعد ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام تجربات اور غور و فکر کی روشنی میں ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی اور استعمار سے نجات کے لیے جدوجہد کے ایک نئے مرکز کے قیام کا اعلان تھا اور انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے ہی دارالعلوم میں ''ثمرۃ التربیت'' کا قیام دراصل طلبہ کے اجتماعی فکر اور سیاسی ذوق کی تربیت کا پہلا قدم تھا۔ اس کا دوسرا مرحلہ جمعیت الانصار کی تنظیم تھی۔ یہ ایک ایسا سیاسی قدم تھا جس پر نہ پردہ ڈالا جا سکتا تھا اور نہ اس کی کوئی تاویل کی جا

سکتی تھی۔ بعض اسباب کی بنا پر اس کا مرکز دارالعلوم سے باہر لے جانا پڑا۔ اب جمعیت الانصار نے نظارۃ المعارف القرآنیہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بہ ظاہر یہ ایک دینی مدرسہ اور قرآن کی درس گاہ تھی، لیکن اس کے قیام کا مقصد، اس کا نصاب، تعلیمی نصب العین، اس کا طریقہ تعلیم، اس کا معلم اور اس کے طلبہ وہی تھے جو پہلے دیو بند کے دارالعلوم کے احاطے میں تھے۔ اب دہلی میں مسجد فتح پوری کے حجرے میں موجود تھے اور جلد ہی یہ بات دنیا پر آشکارا ہوگئی کہ ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' بھی سیاسی فکر کا ایک مدرسہ اور انقلاب کی تربیت گاہ ہے۔

خلافت ترکیہ کے مسائل انیسویں صدی کے ربع آخر سے برابر پیش آرہے تھے۔ ترکی پر حوادث کی یورش ہو رہی تھی۔ استعمار نے اسے نرغے میں لے رکھا تھا اور پے در پے حملوں سے اس کے نظام سیاسی کو چکنا چور کر دیا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا کابل جانا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کا حجاز کا سفر اختیار کرنا ایک ہی منصوبے کے سلسلے کے دو اقدام تھے لیکن جو حالات پیش آئے ان میں سبق آموزی کے کئی پہلو تھے۔ حالات نے تربیت گاہ کا کام کیا معلومات و مشاہدات اور تجربات کے بے شمار فوائد حاصل ہوئے، لیکن سیاسی کامیابی کی منزل ابھی دور تھی۔ جو زعما ہندوستان میں رہ گئے تھے، ان میں سے کچھ پہلے سے نظر بند تھے۔ کچھ بعد میں نظر بند کر دیے گئے۔ مولانا سندھی کو کابل میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند کو حجاز میں حراست میں لے کر جزیرۂ مالٹا لے جا کر قید کر دیا گیا۔ گورنر مکہ نے ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ ریشمی رومال تحریک کے انکشاف نے ہندوستان میں دارو گیر کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ جنگ عظیم کے وقوعہ داجرا نے منہ پر تالے ڈال دیے تھے۔ اخبارات پر بندش، جلسوں اور جلوسوں پر پابندی کا قانون نافذ تھا۔ ملک میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ نے رولٹ بل کے نفاذ کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ جنگ عظیم کے خاتمے کے اعلان (۱۹۱۸ء) نے حالات میں تبدیلی کی نوید سنائی۔ رولٹ بل کے نفاذ نے عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ جلیاں والا باغ کے حادثے نے ملک میں ہل چل پیدا کر دی تھی۔ گاندھی جی کی تحریک مقاومت (ستیہ گرہ) نے ملک کو منظم کر دیا تھا اور احتجاج کی ایک نئی راہ دکھائی تھی۔ تحریک خلافت منظم ہوئی، خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جمعیت علمائے ہند کی بنیاد پڑی۔

طبقۂ علماء کو اجتماعی سیاسی زبان ملی۔ ان کا الگ اور مستقل سیاسی پلیٹ فارم آراستہ ہوا۔ مولانا محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی وغیرہم ہندوستان میں رہا ہوئے۔ شیخ الہند اور ان کے رفقا مالٹا سے چھوٹ کر ہندوستان پہنچے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک منظم سیاسی تحریک کا سورج طلوع ہوا جس کی روشنی نے رفتہ رفتہ ملک کے خشک وتر کو روشن اور سیاسی زندگی میں حرارت اور جوش پیدا کر دیا۔ اس دور کی ایک بڑی بات یہ ہوئی کہ مذہبی طبقے کی سیاست مدرسوں اور خانقاہوں سے نکل کر پبلک، پارٹی اور پلیٹ فارم کی سیاست بن گئی۔ علما کی تحریکات اور ان کی سیاست کا انداز بدل گیا۔ پارٹی پالیٹکس کے میدان میں انھوں نے پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا لیکن ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس میدان کے منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں۔

جمعیت علماے ہند کسی وقتی جوش و جذبات کے زیر اثر قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے قیام کا صدیوں پر پھیلا ہوا تاریخی پس منظر تھا۔ اس کے بانیوں کے افکار و خدمات سیاسی کی عظیم الشان تاریخ تھی۔ اس کی بنیاد ڈالنے والے صاحب نظر و بصیرت تھے۔ وہ تاریخ کے شناور اور سیاست کے نباض تھے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے لے کر عالمِ اسلامی کی پوری تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر ان کی نظر تھی۔ وہ ملک کے حالات کے ہر گوشے اور عوام کے زندگی کے ہر پہلو اور ان کی ضرورتوں اور حالات کے تقاضوں سے واقف تھے۔ ان کے قلب ملک کے کل عوام کی خدمات کے جذبے سے سرشار اور تعصبات سے پاک تھے۔ ان کے ذہن کھلے ہوئے اور نظر بلند اور دور بین تھی۔ وہ ''الخلق عیال اللہ'' اور ''کلکم اخوکم کلکم بنو آدم و آدم من تراب'' کے نظریے پر یقین رکھتے تھے۔ وہ زمین پر اللہ کی مخلوق سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے تھے۔ وہ محض تصورات میں کھوئے رہنے والے اور رومان پسند نہ تھے۔ وہ سب عمل کرنے والے، اصحابِ عزم و ہمت اور مردانِ کار تھے۔ وہ زمین پر بسنے اور زمینی رشتوں اور زندگی کے تقاضوں اور ان کی اہمیت کو سمجھنے والے تھے۔ ان کے ذوقِ عمل نے ان کے کاموں میں ایک فطری ترتیب قائم کر دی تھی۔ وہ مسلمان تھے اور ہندوستان میں اسلامی ملت سے پہلا رشتہ رکھتے تھے اور اس رشتے کے حقوق اور اپنے فرائض سے خوب واقف تھے۔ اس

لیے ملک وقوم کے بعد اجتماعیت کے بلند دایروں اور اعلیٰ سطحوں، براعظمیت اور کل انسانیت کے جوشِ خدمت اور اس کے مفادات کے تحفظ کے وفورِ شوق میں اپنے ملی وجود اور اس کے حقوق اور اپنے فرایض سے صرفِ نظر نہ کر سکتے تھے۔ ملک کے عام سیاسی، اقتصادی مسایل میں وہ اکثریت کے ساتھ اور اس میں شامل تھے لیکن ملت اسلامیہ کے خاص تعلیمی، تہذیبی، دینی اصلاح وتعمیر اور رشد وہدایت کے امور ومسایل میں وہ اکثریت سے الگ اور اپنا تشخص تھے اور اپنے فرایض دینی وملی سے غافل نہ تھے۔ ان کی نظر بلاتفریق مذہب وملت ملک کی تمام اقوام و ملل کے ہمہ قسم کے مسایل پر بھی اور ان کے حل کے لیے انھوں نے وہ تمام طریقے استعمال کیے جو ان کے تصفیہ وحل کے لیے ضروری تھے۔ انھوں نے عام ملکی وقومی مسایل میں بلاتفریق مذہب وملت سب کی خدمت کی اور عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا اور اجتماعی تربیت کی۔ گورنمنٹ کے فیصلوں، اقدامات، ملکی اور بین الاقوامی حالات وانقلابات کے نتیجے مین پیدا ہونے والی تحریکات کو منظم کیا اور عوامی احتجاجات میں ملک کی رہنمائی کی۔ غلط سیاسی فیصلوں، غلط دستور سازی اور عوام کے لیے حکومت کے مضرت رساں اقدامات کے خلاف عملی احتجاجی تحریکات کو اصلاحِ احوال کا ذریعہ بنایا اور ملک کی علمی وفکری رہنمائی کی اور مسلمانوں کے خاص دینی اور ملی نقطہ نظر سے ملک میں آزاد اسلامی نظام کے قیام کی تحریک کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔ ہندوستان کے دستور میں مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، تہذیبی وثقافتی، اقتصادی اور سیاسی حقوق کا تحفظ، عام دستور سازی کے مراحل میں مسلمانوں کے حقوق ومفادات کی نگرانی، خالص ملی اور دینی مفادات کے نقطۂ نظر سے ملت کے خواص اور عوام کو حالات اور وقت کی ضروریات کے مطابق منظم کرنا، اسلامی تعلیم کی اشاعت اور فروغ کے لیے نظامِ مدارس قائم کرنا، مسلمانوں کی اندرونی اصلاح اور ترکِ عواید ورسوم کی تحریک، دعوت وارشاد کا کام، اتحاد بین المسلمین، نظامِ مساجد، نظامِ اوقاف، نظام زکات، قصبے کی اور شہر کی سطح سے لے کر صوبے اور کل ہند سطح تک نظامِ شرعی کے قیام کی جدوجہد، نکاح وطلاق اور عایلی مسایل کے حل اور تصفیے کے لیے مسلمان قاضیوں کے تقرر کی تحریک۔

ان تمام امور کی انجام دہی مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری تھی۔ البتہ اگر کسی کلی یا جزوی مسئلے

میں کسی درجے میں دستور سازی کی ضرورت اور حکومت کا تعاون ناگزیر ہو تو حکومت کی مداخلت کا خطرہ لیے بغیر اس سے تعاون کیا جا سکتا تھا۔

یہ تمام امور جمعیت علمائے ہند کے مقاصد میں ہمیشہ شامل اور اس کے رہنماؤں کے مساعی کا سب سے بڑا اور اہم ہدف بنے رہے۔ قومی اور سیاسی مسایل تو پیدا ہوتے اور حل ہوتے رہے، تحریکات کامیابی سے ہم کنار ہو کر یا ناکام رہ کر ختم ہوتی رہیں، لیکن قوم کی ترقی اور فلاح و بہبود کے کام اور ملی مقاصد جن کا اوپر دفعات چہارگانہ میں ذکر آیا ہے دائمی توجہ کے طالب مسایل تھے۔ اس لیے جمعیت کے رہنماؤں کی توجہ کا ہمیشہ ہدف بنے رہے۔ وہ نہ تو کبھی نظروں سے اوجھل ہوئے اور نہ دایرہ مساعی سے باہر ہوئے۔ ہر مسئلے پر ہمیشہ بروقت توجہ دی گئی۔ یہ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم و تربیت کا فیضان تھا کہ جمعیت علمائے ہند کے مقاصد کے دایرہ کار اور ہر محاذ پر کام کرنے والے پیدا ہوتے رہے۔ دارالعلوم نے ہر قسم کی قابلیت اور صلاحیت کے رہنما اور کارکنان پیدا کر دیے تھے۔ ان میں بہترین مقرر اور خطیب تھے، مبلغ اور مناظر تھے اور شاعر، ادیب، مصنف اور اہل قلم تھے۔ صحافی اور اخبار نویس تھے۔ تحریکوں کو منظم کرنے والے اور عوام کے مجمعوں اور بھیڑوں سے کام لینے والے تھے۔ قانونی امور اور دستور سازی کے ماہر بھی تھے اور پارلیمینٹیرین بھی تھے۔ جمعیت علمائے ہند کے میدان خدمت اور اس کے اسٹیج پر آ کر ان کی صلاحیتیں اور قابلیتیں اور نکھر گئی تھیں۔ اس لیے جمعیت کو کبھی یہ شکایت پیدا نہیں ہوئی کہ کسی قومی اور ملی محاذ پر کسی تحریک میں اس کا کوئی رہنما یا کارکن موجود نہیں تھا۔ ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد سے کسی صاحب نے شکوہ کیا کہ جمعیت علمائے ہند تو جمعیت علمائے دیوبند بن گئی ہے۔ مولانا نے فرمایا ''اس لیے کہ دیوبند نے آدمی پیدا کیے ہیں۔'' مولانا مرحوم کا یہ بہت پر معنی جواب اور دارالعلوم کی خدمات کو بڑا اخراج تحسین ہے۔

فرقہ وارانہ اتحاد کا منکر کون تھا؟ لیکن جمعیت علمائے ہند سے بڑھ کر بھی اس کا آرزومند کون تھا؟ لیکن اس نے اسلامی شعایر اور مسلم مفادات کو نظر انداز کر کے بھی کوئی اتحاد گوارا نہ کیا۔ میثاق لکھنو کی مخالفت حضرت مفتی کفایت اللہ نے اس لیے کی تھی کہ اس میں مسلمانوں کے عمومی مفاد کو نظر انداز اور بعض صوبوں میں ان کے ملی خصایص، امتیازات اور

تشخص کے بہترین امکانات کو مجروح کر دیا گیا تھا۔ آزاد ہندوستان میں دستور سازی کے اصول و مسایل جمعیت کے قیام کے اول روز سے اس کے سامنے تھے۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہی تھی۔ اس کے پہلے سالانہ اجلاس سے آخری اجلاس تک کی روداد یں موجود ہیں۔ ایک اجلاس بھی ایسا نہیں گزرا جس میں ملت اسلامیہ کا کوئی نہ کوئی مسئلہ زیر بحث نہ آیا ہو۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک فرزند اور حضرت شیخ الہند کے تلمیذ رشید مولانا عبیداللہ سندھی نے انقرہ (ترکی) میں بیٹھ کر آزاد ہندوستان کے لیے ایک جامع دستور تنہا مرتب کر دیا تھا۔ آزاد ہندوستان کے لیے دستور سازی کی شاید یہ پہلی کوشش تھی جس میں پورے ملک اور کل اقوام ہند کے اتحاد کے لیے اصول سازی کی گئی تھی۔ جمعیت علماے ہند نہرو رپورٹ کی تالیف وتسوید کے مساعی کی موید تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مسائل اور مفادات کو نظر انداز کیا گیا ہے تو اس نے رپورٹ کی صحت و افادیت کو ماننے سے انکار کر دیا لیکن اسے کلیۃً رد کر دینے کے بجاے اس میں مثبت اور تعمیری اصلاحات منظور کر لینے پر زور دیا۔ عام تعلیم کے فروغ کی ضرورت اور اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا تھا؟ اس سے بھی انکار نہ تھا کہ قومی تعلیم کی ایک مستحکم اور متفقہ بنیاد ہونی چاہیے لیکن ودیا مندر اسکیم اس کے مطلوبہ قومی معیار سے بہت کم تھی۔ اس میں اسلامی عقاید پر زد پڑتی تھی، اس سے اسلامی شعایر مجروح ہوتے تھے۔ اس لیے جمعیت نے اسکیم کی ضرورت کے اعتراف کے باوجود پیش کردہ اسکیم کی افادیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس پر زور دیا کہ اس کے نقایص دور کیے جائیں اور ایسی متفقہ بنیاد تلاش کی جائے جس سے مذہبی معتقدات، تہذیبی تشخص اور اسلامی و ملی روایات پامال نہ ہو جائیں۔ ملک کے قومی جھنڈے کے احترام اور قومی ترانے کی ضرورت سے انکار نہ تھا لیکن کوئی قومی جھنڈا ایک سیاسی روایت سے زیادہ مذہبی عقیدے کی جگہ نہیں لے سکتا اور کوئی قومی ترانہ جو کسی قوم کی تہذیبی روایات اور مذہبی تعلیمات کے خلاف ہو کثیر القومی ملک کا قومی ترانہ نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ جمعیت علماے ہند نے ''بندے ماترم'' کو ہندوستان کا قومی ترانہ ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

برٹش دورِ حکومت کے آخری دس برسوں (۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء) میں مسلم لیگ کے انداز

سیاست نے مسلمانوں کو غیر مسلم اقلیت کے جس غیض وغضب کے حوالے کر دیا تھا اور جن سنگین حالات میں چھوڑ کر لیگ کے اکابر و اصاغر نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ وہ نہایت ہول ناک اور ہلاکت خیز تھے اور جمعیت کے بزرگوں کے لیے ایک بڑی چنوتی تھی۔ اس دور میں جمعیت علماے ہند کی عظیم الشان خدماتِ ملی تاریخ کا ایک الگ موضوع ہے۔

جمعیت علماے ہند اور اہل حدیث

جمعیت علماے ہند کی تحریک سیاسی میں ابتداءً مختلف مکاتب کے علماء شریک تھے۔ اس کے قیام کی تحریک اور فیصلے میں مختلف دوائرِ فکر وخیال کے علماء کا حصہ تھا۔ ان میں نظام اسلامی کے قیام کی ضرورتوں اور مقتضیات وقت کے احساس کی کمی نہ تھی لیکن بعض علماء کی سیاسی اور اجتماعی کاموں کی کوئی تاریخ اور روایت نہ تھی، بعض علمی خانوادے تھے لیکن سیاسی تربیت سے محض نا آشنا۔ وہ کچھ عرصے سرگرم کار رہے لیکن سیاست کے نشیب وفراز میں وہ بہت دور تک جمعیت کا ساتھ نہ دے سکے اور رفتہ رفتہ الگ ہو گئے۔ بعض نے مقابل تنظیم قائم کر لی۔ بعض مخالف جماعتوں میں شریک ہو گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے خود کوئی سیاسی تنظیم قائم کی اور نہ وہ کسی تنظیم میں شامل ہوئے لیکن مخالفت میں سرگرم رہے اور ان کی مخالفت سے فایدہ دوسروں نے اٹھایا۔ ان میں سے کچھ بے فیض وثمر مر گئے جو زندہ رہے وہ پاکستان بھاگ آئے۔ پاکستان میں وہ جو فایدے اٹھا سکتے تھے، ان سے انھوں نے دریغ نہیں کیا لیکن سیاسی منظر سے رفتہ رفتہ سب ہٹ گئے۔ سیاسی میدان میں اصحابِ عزم اور اہل ہمت کی دو ہی جماعتیں رہ گئیں۔

۱- اہل سنت والجماعت (حنفی علماء) میں دیوبندی مکتب فکر کے انقلابی

۲- پیروانِ سلف میں اہل حدیث مکتب فکر کے علماء کی ایک جماعت

ان دونوں کے سیاسی افکار کا سرچشمہ حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ذاتِ گرامی اور ان کے علوم وافادات تھے۔ دونوں ایک ہی سیاسی روایت کے پیرو تھے۔ ولی اللہی خانوادۂ علم وفکر کے بزرگوں سے دونوں کو عقیدت تھی۔ تحریک اصلاح و جہاد میں دونوں

جماعتیں شریک تھیں۔ حضرات شہیدین سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی دونوں کے مرجع عقیدت تھے۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اسلامی زندگی کے احیاء کی تحریک میں اور شمال مغربی ہندوستان کے معرکوں میں دونوں شریک تھے۔ بالاکوٹ کے معرکہء جہاد میں دونوں جماعتوں کے ایثار پیشہ گان اور جاں نثارانِ ملت نے جامِ شہادت نوش فرمائے تھے۔ ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے حوادث میں دونوں نے جان و مال کے نذرانے پیش کیے تھے اور جاگیر و امارات کے اتلاف اور قید و جلاوطنی کی آزمایشوں سے گزرے تھے۔ دونوں نے ایک نظم کے تحت اور ایک ہی طریقہ کار کے مطابق عملی سیاسی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ دونوں کی سیاسی تاریخ ایک تھی اور دونوں نے ایک ہی انداز نظر کے مطابق یکساں سیاسی ماحول میں تربیت پائی تھی۔ ان دونوں جماعتوں کے بزرگوں میں بعض علمی مسایل میں نقطہ نظر اور فکر و رائے کا اختلاف تھا لیکن سیاسی میدانِ عمل دونوں کا ایک تھا اور دونوں کے مابین تعلقات استوار تھے۔

تاریخ و تحریک سیاسی کے مطالعہ و نظر خصوصاً ۱۸۵۷ء کے حوادث کے تجربات و مشاہدات نے نقطہ نظر کو متاثر کیا۔ اس میں کچھ لوگ عزیمت دعوت کی راہ چھوڑ کر سیاسی اعمال سے دست کش ہو گئے اور اپنے تئیں درس و تدریس، تعلیم و ارشاد اور ایک مخصوص انداز فکر کے مطابق دعوت و اصلاح کے کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ کچھ لوگ میدان عمل میں رہے۔ انھوں نے قوم و وطن اور دین و ملت کی خدمت کو اپنا شعار بنایا لیکن زمانے کے تغیرات و انقلابات نے ان کے نقطہء نظر اور طریقہء کار میں فرق پیدا کر دیا۔

اہل سنت کی حنفی جماعت نے دیوبند کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا۔ اہل حدیث کا مرکز حسب سابق دہلی تھا۔ دیوبندی جماعت کی تحریک کی شاخیں رفتہ رفتہ پورے ملک میں پھیل گئیں۔ اہل حدیث کے کئی مراکز بہار، پنجاب وغیرہ میں قائم ہو گئے۔ دیوبندی جماعت اور اس کی شاخوں میں فکر و نظر سے عمل تک زیادہ ہم آہنگی اور روابط میں زیادہ پختگی تھی۔ اہل حدیث کے روابط ملک سے بیرون ملک تک بعض دینی خانوادوں اور تحریکوں سے بہت گہرے اور قوی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ دونوں جماعتیں بہ ظاہر الگ ہوتی چلی گئیں۔ اس کے باوجود خانوادۂ

ولی اللہی سے دونوں کی عقیدت اور سیاسی تاریخ اور سرچشمہ افکار سے دونوں کی دلچسپی اور تحریک اصلاح و جہاد سے تعلق ہمیشہ قائم رہا۔

۱۹۱۹ء میں جمعیت علماے ہند کے قیام نے دونوں جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۱۹ء میں علما کے جلسہ ہاے دہلی میں مولانا محمد اکرم خان (کلکتہ)' مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد ثنا اللہ امرتسری علماے حدیث جمعیت علماء کے قیام کے فیصلے میں شریک مشورہ و صلاح تھے۔ جمعیت کے اغراض و مقاصد اور نظام کی ترتیب و تشکیل میں مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی (دیوبندی) کے ساتھ مولانا محمد اکرم (کلکتہ) اہل حدیث برابر کے شریک تھے۔ مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کی صدارت اور نظامت کی قرارداد مولانا ثنا اللہ امرتسری نے پیش کی تھی۔ امرتسر میں کانگریس' خلافت' لیگ کے اجلاس کے ساتھ جمعیت علماے ہند کے پہلے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی دعوت مولانا ثناء اللہ نے دی تھی اور انتظامات و اخراجات کی ذمہ داری قبول کی تھی۔

اس وقت سے لے کر تقسیم ملک کے واقعے اور پاکستان کے قیام تک دونوں جماعتوں کا سب سے بڑا سیاسی پلیٹ فارم ایک اور صرف ایک جمعیت علماے ہند کا پلیٹ فارم تھا۔ تقریباً ۱۹۳۵ء یا اس کے بعد اہل حدیث جماعت میں سیاسی فکری شعور کی ایک نئی تاریخ شروع ہوئی۔ اس نے الگ سیاسی تنظیم کے بارے میں سوچا لیکن اس کی وجہ دینی عقاید اور مذہبی مسایل میں اختلاف نہ تھا۔ سیاسی حالات میں تیز رفتار تغیرات وقت کے تقاضے اور نقطہ نظر اور سیاسی اندازِ فکر کی لازمی تبدیلیاں تھیں۔ ملت اسلامیہ کے حقوق و مفادات کی حفاظت' اسلامی زندگی کا قیام' ہندوستان میں مسلمانوں کا دینی و تہذیبی تشخص اور ان کی اصلاح و تنظیم اور ملکی اور قومی معاملات اور تحریک آزادی میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کے مطابق رہنمائی وغیرہ کے مسایل میں دونوں کے مابین مطمح نظر کا اختلاف نہ تھا۔ پختہ سیاسی ذوق اور تاریخی سیاسی نظر رکھنے والے پختہ کار مدبر جمعیت علماے ہند کے مسلک ہی سے وابستہ رہے۔ حال آں کہ تحریک خلافت کے دورِ زوال میں جب فرنگی محل لکھنؤ' بدایوں' وغیرہ کے علماء کی سرگرمیاں باقی نہ رہی تھیں اور وہ جمعیت علماے ہند سے دور ہو گئے تھے۔ جمعیت کے نظام پر دیوبندی جماعت چھا گئی تھی اور اہل

حدیث کی حیثیت بہ ظاہر ثانوی نظر آنے لگی تھی، اس کے بزرگوں کی علمی رائے کی اہمیت اور ان کے شخصی احترام میں اس وقت بھی جمعیت کے حلقے میں ذرا فرق نہ پڑا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد وہ دو دینی مکاتبِ فکر اور سیاسی تنظیمات جو الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے سب سے زیادہ قریب ہیں دیوبندی مکتبہ فکر کے احناف اور جماعت اہل حدیث کے پیروانِ سلف اور متبعین کتاب وسنت ہیں۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں دو باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

اسلامی فکر کے احیاء، دعوت وارشاد، اصلاحِ عواید و رسوم، دینی زندگی کے قیام اشاعتِ کتاب وسنت، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تحقیق وتدوین علوم ومعارف، خدمتِ قوم وملک، تعمیر ملت کے کاموں اور علم وعمل کے مختلف میدانوں میں اصحابِ کتاب وسنت اور پیروانِ سلف نے کارنامے انجام دیے اور معرکے سر کیے ہیں۔ اس جماعت میں اہل علم اور اصحابِ قلم کی نادرِ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں لیکن اسلاف کرام کی اس یادگار تحریک کو سیاسی مورخ اب تک میسر نہیں آیا بلکہ اتنا ہی نہیں اہل حدیث کی کوئی جامع الاطراف تاریخ اور تذکرہ بھی مدون نہیں ہو سکا۔ بلاشبہ بعض نہایت مفید علمی کام انجام پائے ہیں لیکن وہ افراد کے ذوق کے آئینہ دار اور اشخاص کے وسائل کی تنگ دامانی کے شکوہ سنج ہیں؛ بر بعض کاموں میں تو اہل حدیث کے وسیع دایرے کے مصالح ومفادات کے بجائے اس کے حزبی وگروہی تعصبات کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ حال آں کہ یہ تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی اتنی طویل، جامع جہات اور عظیم الشان ہے کہ افراد کے ذوق و وسایل اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے اہل حدیث کے اجتماعی وسایل، تاریخی نقطہ نظر، مختلف علوم وفنون کے ماہرین، اصحابِ ذوق ونظر، اہل علم کے مجمع اور حزبی وفرعی مفادات ومصالح سے بلند نقطہ نظر رکھنے والے اصحابِ ایثار اور اہلِ وسایل کے اجتماع کی ضرورت ہے۔ وہ کھلے ذہن ودماغ کے مالک اور وسیع النظر ہوں۔ ان کا تعلق بلاشبہ مشرق و مغرب سے ہو لیکن وہ بہاری، دہلوی، پنجابی، فقرا و امراء میں منقسم اور مخصوص خانوادہ ہاے علم وفکر کے روایت فروش نہ ہوں۔

پاکستان میں اسلام کے شان دار مستقبل کا دار ومدار دیوبندی مکتبہ فکر کی انقلابی جماعت

اور اہل حدیث کے اصحابِ عزائم کے اتحاد و اشتراک پر ہے۔ یہ دونوں جماعتیں نہ صرف مذہبی اور دینی عقاید میں دوسری جماعتوں، گروہوں اور مکاتبِ فکر کے مقابلے میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں بلکہ ان میں سیاسی شعور بھی زیادہ ہے اور انھوں نے اپنے سیاسی ذوق اور سلیقۂ عمل سے بھی ملک کی اکثریت کو متاثر کیا ہے۔ ان کے ساتھ اہل ہمت اور ایثار پیشہ نوجوانوں کی جماعت ہے اور اگر نفاذِ اسلام کی مخالف قوتیں ملک میں کسی جماعت کے اتحاد اور جدوجہد سے خوف زدہ ہیں تو وہ یہی ایک جماعت ہے جو دو مستقل حصوں میں بٹی ہوئی اور وہ وقت نہیں آیا کہ کسی ایک نظم کے تحت اشتراک و اتحاد کے رشتے میں منسلک ہو جائے۔ اہل علم و نظر اور اصحابِ فکر و رائے کو سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیے۔

دارالعلوم دیوبند کے فرزند عظیم

مولانا عبیداللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ

یا

آزاد ہندوستان کا پہلا دستوری خاکہ

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے جس منصوبے پر یہاں تبصرہ پیش نظر ہے وہ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں ترکی سے شائع کیا تھا۔ اس کی تیاری میں ان کے شاگرد اور ساتھی ظفر حسن ایبک (ف ۵؍جنوری ۱۹۸۹ء) ان کے شریک رہے تھے۔ یہ منصوبہ مختلف ذرائع سے ہندوستان بھیجا گیا تھا لیکن برٹش گورنمنٹ نے ملک میں اس کے داخلے پر پابندی عاید کردی تھی۔ اس کے باوجود مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، ایم این رائے، توارش وغیرہم کی نظر سے یہ منصوبہ گزرا تھا اور ردعمل بھی سامنے آیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے مسائل کے حل کی ایک عمدہ کوشش قرار دیا تھا اور سید سجاد حیدر یلدرم اس سے متفق اور اس کے مؤید تھے۔ مولانا سندھی اس ردعمل سے مطمئن تھے۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ یا ہندو مسلم مسئلہ ہمیشہ بہت اہم مسئلہ رہا ہے۔ جس کے حل یا عدم حل کے ملک کے مستقبل پر گہرے اثرات پڑنا تھے اور پڑے۔ ہندوستان کے سیاسی مسائل کے بارے میں سوچنے والوں کے کئی گروہ تھے۔

ایک گروہ وہ تھا جو فرقہ وارانہ اور ہندو مسلم اختلاف کو اہمیت ہی نہ دیتا تھا۔ اس کے نزدیک مسلمانوں کا یہ شور و شغب صرف انگریزوں کے ایما سے تھا اور ملک کی آزادی کی تحریک میں محض رکاوٹ کھڑی کرنے کے لیے تھا۔ اس کی کوئی واقعی حیثیت نہ تھی اور اس لیے نظر انداز کردیے جانے کے قابل تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جس روز مسلمان یہ بھول جائیں گے کہ ان کے معتقدات، مذہب، تہذیب، تاریخ کا ہندوستان کے باہر کے کسی اور ملک سے کوئی تعلق ہے یا کسی دوسرے ملک کی کسی قوم سے کوئی فکری، اعتقادی اور تہذیبی رشتہ ہے اور اول و آخر وہ اپنے

تئیں ہندوستانی سمجھنے لگیں گے۔ تمام اختلافات خود بخود مٹ جائیں گے۔ اس گروہ میں اکثر ہندو فرقہ پرست جماعتیں شامل تھیں۔ خود کانگریس میں شامل ایک مختصر جماعت کا بھی یہی خیال تھا۔

دوسرا گروہ وہ تھا جو ان اختلافات کو صرف عقاید و مذہب کے دایرے اور تہذیب و روایات میں محدود سمجھتا تھا اور دوسرے تمام سیاسی، معاشی، اقتصادی عوامل کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے نظریے کے مطابق ملک کے تقسیم ہوتے ہی تمام مسائل یک لخت طے پا جائیں گے۔ یہ گروہ بسم اللہ کے گنبد میں رہتا تھا اور عام طور پر مسلم لیگ سے وابستہ یا اس کے نقطہ نظر کا حامل تھا۔ لیکن اس نے دیکھ لیا کہ اس کے نظریے کے مطابق انقلاب آنے کے باوجود ملک اور قوم کا ہر وہ مسئلہ جس کے حل کی اس نے آرزو کی تھی نہ صرف اپنی جگہ پر ہے بلکہ اس نے اور زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کر لی ہے۔

ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اختلافات ونزاعات کا سبب صرف معاشی مسائل کو قرار دیتا تھا۔ آج ہندوستان پاکستان میں جو لوگ تقسیم ملک کے اسباب ومحرکات صرف معاشی قرار دیتے ہیں یہ اسی گروہ کے باقیات ہیں۔ یہ عام طور پر وہ لوگ تھے جو اپنے تئیں ترقی پسند کہلاتے ہوئے فخر کرتے تھے اور مذہب کی ضرورت کے عام طور پر قایل نہ تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب انتہا پسندانہ نظریات تھے۔ ہر دایرہ فکر میں بعض بہت اہم مسائل کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ ان میں اعتدال وتوازن اور جامعیت کا حامل نقطۂ نظر صرف مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ وہ اختلافات اور تنازعات کے ہر سیاسی، مذہبی، تہذیبی، معاشی سبب اور محرک کو اس کی قرار واقعی جگہ دے کر اختلاف کا حل تلاش کرتے تھے۔ مولانا سندھی مرحوم نے اپنے افکار کو ایک جامع پروگرام کی شکل میں مرتب کر دیا تھا جب کہ مولانا آزاد کے افکار کو کانگریس کے سنجیدہ، معتدل اور حقیقت پسند و بالغ نظر ارکان کے مساعی اور رویوں میں تلاش کرنا چاہیے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے اس منصوبے کی اشاعت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی سیاست دانوں، اہل علم، اصحاب نظر اور سرکاری حلقوں اور مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی طرف سے دو چار

دس پانچ نہیں، بہت سی اسکیمیں پیش کی گئیں جن کی تعداد سو تک پہنچ گئی ہے لیکن ان میں سے بیشتر ناقص اور کم فہمی اور عدم بصیرت پر مبنی تھیں۔ اس لیے شمار میں آ جانے کے باوجود وہ اصحاب علم وتدبر کی توجہ حاصل نہیں کر سکیں۔

فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے جو تجاویز پیش کی گئیں تھیں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو انھیں دو قسمیں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پہلی قسم ان تجاویز کی تھی جن میں کسی نہ کسی طور پر برصغیر کے اتحاد کو برقرار رکھا گیا تھا۔

۲۔ دوسری قسم ان تجاویز کی تھی جن میں برصغیر کی دو اکثریتوں' ہندو اور مسلمانوں میں ملک کو تقسیم کر دیے جانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

اگر نوع کے اعتبار سے مولانا سندھی کے منصوبے کو دیکھا جائے تو اس میں ملک کے اتحاد کو برقرار رکھا گیا تھا۔ تقسیم کے تمام منصوبوں میں مولانا سندھی کی اسکیم سب سے زیادہ جامع تھی۔ اس میں نہ صرف ملک کی دو اکثریتوں کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ملک کی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کے مسائل کا حل اور اس کے اطمینان کا سر و سامان کیا گیا تھا۔

☆ فرقہ وارانہ مسائل میں مذہبی' لسانی' تہذیبی' تعلیمی مسائل تھے۔

☆ طبقہ وارانہ مسائل میں کسان' مزدور' تاجر' ملازم پیشہ' زمیندار کے مسائل تھے۔

☆ علاقائی مسائل میں علاقوں' صوبوں' ریاستوں کے مسائل شامل تھے۔

اس کے علاوہ مذہب' زبان' رسم الخط' تہذیب' معاش' روزگار' تعلیم' صحت وغیرہ کے عام مسایل جنھیں حل کرنا ہر ملک کی حکومت کے اہم فرایض ہوتے ہیں شامل تھے۔ برصغیر کے خاص جغرافیائی حالات اور مختلف صوبوں' علاقوں اور ریاستوں میں مختلف اقوام کی کم وبیش آبادی اور مذاہب وفرق کی کثرت' افکار وعقاید کے اختلافات نے زندگی کے ہر شعبے میں مسائل کے حل میں جو پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں اور پورے ملک کے لیے ایک انتظامیہ اور ایک تعلیم' عدالتی

نظام کے نفاذ اور یکساں اصول کے تحت قانون سازی کی مشکلات' مذہبی تعلیم کے مسایل' تہذیبوں اور ثقافتوں کے تحفظات وترقیات وغیرہ کے بے شمار مسایل تھے جن کا سنجیدہ وحقیقت پسندانہ حل پیش کیا گیا تھا۔

مولانا سندھی نے اپنی اسکیم میں نہ صرف ملک کے ہمہ قسم کے اور چھوٹے بڑے مسائل کا حل پیش کیا تھا۔ بلکہ ہندوؤں' مسلمانوں' سکھوں وغیرہ کے قومی خصایص وامتیازات نے ان میں ایک دوسرے پر برتری اور تفوق کے جذبات واحساسات اور عصبیتوں کو جو پختہ کر دیا تھا اسکیم میں ان تک کا لحاظ رکھا گیا تھا۔

آج ہم یہ بات بالیقین نہیں کہہ سکتے کہ اگر یہی اسکیم برصغیر کے سیاسی مسئلے کے حل کے طور پر اختیار کر لی جاتی تو اس کی عملی افادیت کیا ہوتی اور اس سے ملک کے مسایل کس حد تک حل ہوتے لیکن ہم جب ایک اسکیم کے عمل میں آنے کے بعد برصغیر پاک وہند میں مسایل کا ہجوم دیکھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اس اسکیم ہی میں نقص تھا اور اس کے بنانے والوں کو ملک کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسایل اور ان کے تمام پہلوؤں اور اس کے نتیجے میں آیندہ پیش آنے والے حالات ومسایل کا کامل شعور نہ تھا۔ اس کے ساتھ مولانا سندھی کی اسکیم کی جامعیت' اس کی منطق اور استدلال کی قوت دل کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور اس کی افادیت ومعنویت ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔

یہاں تک لکھ لیا تو مجھے خیال آیا کہ حضرت مولانا سندھی کی اسکیم کا کسی اور اسکیم سے موازنہ ہی نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ مولانا سندھی کی اسکیم ایک جامع الاطراف اسکیم تھی۔ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری اسکیم تھی ہی نہیں۔

۱- علامہ اقبال مرحوم نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے خطبہ الٰہ آباد میں جو کچھ کہا تھا وہ ایک مجمل تصور سے زیادہ نہ تھا۔ پھر یہ کہ اس کی تعبیر وتشریح پر بھی تمام اصحابِ فکر ودانش متفق نہیں اور اب تو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی اسکیم سے رجوع فرما لیا تھا۔(۱) (تفصیل کے لیے دیکھیے:)

۲- مسلم لیگ کی قرار دادِ لاہور (۱۹۴۰ء) جسے قرار دادِ پاکستان کا نام دیا گیا وہ محض ایک قرار داد اور اسکیم کی خوبیوں کی تمام تفصیلات سے عاری ہے۔ حتیٰ کہ اس کے متن کی صحت پر بھی سب کا

اتفاق نہیں۔ اس کا تحریر و تالیف کنندہ ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ اس کے مطالب کے نقائص بھی زیرِ بحث آئے ہیں اور بعض دوسری خرابیوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اس لیے حضرت علامہ اقبال کے تصور اور مسلم لیگ کی مجمل و ناقص قرارداد سے مولانا سندھی کی جامع اسکیم کا موازنہ ہی اصولاً غلط ہے۔ اگر اس کے مقابلے میں کوئی اسکیم لائی جاسکتی ہے، جس میں ملک کے تمام مسائل کا کامل طور پر جائزہ لیا گیا تھا اور ہر مسئلے کے حل کے لیے دوٹوک الفاظ میں فیصلہ کر دیا گیا تھا تو وہ صرف نہرو رپورٹ تھی لیکن وہ بھی روبہ عمل نہ آسکی۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے حل میں اس کے قرارداد ہ اصولوں سے عدم اطمینان اور ایک خاص سیاسی ذوق رکھنے والوں کی غوغا آرائی سے متاثر ہوئے بغیر جو کچھ منظور کیا گیا تھا، اس کے روبہ عمل آنے میں حکومت رکاوٹ بن گئی۔ بالآخر کانگریس نے خود اسے واپس لے کر مکمل آزادی کے لیے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ جب بھی کسی پروگرام اور نظام کو جو عمل و نفاذ کے لیے ہو، منطق اور کلام کے حوالے کر دیا جائے گا تو عام طور پر نتیجہ یہی نکلے گا۔ جو مشکلات خاص عمل کی ہوتی ہیں، ان کا حل موقع ہی پر تلاش کرنا چاہیے۔ اس کے حل میں منطق ہرگز سودمند نہیں ہوتی۔ نہرو رپورٹ تو بہر حال ایک چیلنج کا جواب تھا اور اگر چیلنج دینے والے کی نیت و خواہش کو دیکھنا ضروری ہو تو یقین رکھنا چاہیے کہ نہرو رپورٹ کا یہی انجام ہونا تھا۔

خواہ نہرو رپورٹ آزاد ہند کے نظام سیاسی اور اقلیتوں کے حقوق کا اطمینان بخش اور کافی حل نہ ہوتا، تب بھی اس میں شبہ نہیں کہ وہ مسائل کے تصفیے کی ایک پختہ بنیاد ضرور ثابت ہوسکتی تھی۔ اس میں ملک کے ہمہ قسم کے مسائل کا جامع الاطراف جائزہ لیا گیا تھا۔ اس لیے مولانا سندھی کے پروگرام سے اس کا موازنہ کرنا غلط نہیں ہوسکتا۔ دونوں اسکیموں کا تقابلی مطالعہ ایک عمدہ اور دلچسپ موضوع ہے لیکن اس بات کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ نہرو رپورٹ ملک کے منتخب اعلیٰ دماغوں کے غور و فکر کا حاصل تھا اور مولانا سندھی کی اسکیم صرف ایک تنہا شخص کی دماغی اور فکری کاوش کا نتیجہ تھی۔ اس کی تالیف و ترتیب میں ان کے ساتھ ان کے ساتھی اور شاگرد ظفر حسن شامل تھے۔ ان کے اخلاص میں کوئی شبہ نہیں لیکن مولانا کے فکر کی بلندی، ذہن کی رسائی

اور علمی مرتبے کو تو وہ اس کے ۶۴ برس ۳ ماہ اور ۲۰ دن بعد اپنے انتقال (۱۹۸۹ء) تک بھی نہ پہنچ سکے تھے۔ اس لیے ان دونوں کے موازنے میں اہل علم کی ایک جماعت کے غور وفکر بہ مقابلہء یک تنہا شخص کی دماغی کاوش کے فرق کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔

بلاشبہ مولانا عبید اللہ سندھی کی اسکیم بہت جامع ہے۔ وہ ان کے افکار کے نظام سیاسی یا ملک کے آیندہ سیاسی انتظامی ڈھانچے کا ایک قابل عمل اور عمدہ نمونہ ہے۔ لیکن کسی ملک کی تعمیر و ترقی، فلاح و بہبود، انتظام و انصرام، تعلیم و تربیت، امن و امان اور دفاع ملک و قوم کے تمام کام مجرد ایک سیاسی انتظامی ڈھانچے کے بن جانے سے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ جاتے۔ اس لیے متعدد اور اسکیموں، منصوبوں، تنظیموں، مختلف قسم کے اداروں کی تشکیل اور ان کے لیے نصب العین کا تعین، لائحہ عمل اور طریقہ کار کی تیاری اور بہترین نتائج کے حصول کے لیے پروگرام بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور برصغیر ہند پاکستان جیسی کثیر المذاہب اور مختلف النوع اقوام کی سرزمین میں یہ مسائل اور زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مولانا سندھی مرحوم کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف ملک کے سیاسی نظام اور دستوری مسائل کے بارے میں ایک جامع اسکیم پیش کی، بلکہ دوسرے ہر قسم کے مسائل اور ان کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی اور ہر ایک ضرورت کے بارے میں کوئی تنظیم، کوئی پارٹی یا کوئی ادارہ تشکیل دے کر اس کے مقاصد، قواعد وضوابط اور لائحہ عمل تک بنا کر ملک و قوم کے لیے رہنمائی مہیا کر دی ہے۔ ان کے مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی اور دوسری اسکیموں اور تنظیموں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ سب ہمیں ایک بڑے نظامِ فکر سے مربوط معلوم ہوتی ہیں۔

تعجب اور حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ سب اسکیمیں اور تنظیمیں مولانا سندھی کے اعلیٰ دماغ کی تخلیق اور ان کے نکتہ رس ذہن کی پیداوار تھیں۔ یہ ان کی ذہانت اور فطانت کے ثبوت ہیں جن کا مطالعہ ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارے سامنے مختلف پارٹیوں، کئی مشنوں، اہل تدبر کے مجمعوں کے غور وفکر اور بحث و نظر کے بعد منظور کردہ تجاویز ہیں لیکن حیرت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک تنہا شخص کی بنائی ہوئی ایک اسکیم کی خوبیوں کا عشر عشیر کے درجے میں بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

مولانا سندھی مرحوم کی یہ اسکیمیں جن کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے اور جو ایک ہی جامع نظامِ فکر کے ضروری اور اہم اجزا ہیں۔ ان میں سب سے پہلے تو مولانا سندھی ہی کا ''کل ہند سرو راجیہ پروگرام'' ہے جو یہاں ایک تاریخی اور انقلابی منصوبے کی حیثیت میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ آزاد ہندوستان کے لیے ایک بہت جامع اور مکمل اسکیم تھی۔ دوسری تنظیمیں اور اسکیمیں یہ ہیں:

۲-سندھ ساگر پارٹی کے اصول اور پروگرام ۳-جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی

۴-جمعیت خدام الحکمہ

۵-سندھ ساگر نیشنل بورڈ

۶-اسی سلسلے میں مولانا سندھی کی ایک تحریر ''ہم کیا چاہتے ہیں؟'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

۷-ان کے علاوہ چند اور مسائل و مباحث ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بارے میں یہ بحث ہے کہ آیا یہ تنظیم نیشنل (قومی) ہے یا انٹرنیشنل (بین الاقوامی)؟ یہاں اقوام سے مراد ہندوستان میں بسنے والی اقوام ہی ہیں نہ کہ سرزمین عالم پر پھیلی ہوئی اقوام اور مذاہب کے نام پر پکاری جانے والی اقوام۔ مولانا سندھی کے لیے یہ بحث نہایت ضروری تھی۔ کانگریس کے ساتھ ''نیشنل'' کا لفظ یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ یہ کسی ایک قوم کی جماعت ہے یا کانگریس ہندوستان میں مسلمان، سکھ، عیسائی کے عقائد و مذہب کے امتیازات کو مٹا کر ''ایک نیشن'' یا ایک قوم بنانے کا عقیدہ رکھتی ہے اور اس عقیدے پر ہندوستان کی تمام قوموں اور اہل مذاہب کو جمع کرنا چاہتی ہے۔

مسلم لیگ کے پروپیگنڈے نے کم از کم مسلمانوں کے دلوں میں اس خیال کو پختہ کر دیا تھا، لیکن کانگریس کے مقاصد میں مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کے اختلافات و امتیازات کو مٹا کر ایک نیشن یا ایک قوم بنانے کا، کوئی مقصد نہ تھا۔ کانگریس صرف یہ چاہتی تھی کہ ملک کو انگریزی سامراج سے نجات دلانے، ملک کی تعمیر و ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں کوئی مذہب اور عقیدہ رکاوٹ نہ بنے۔ ہندو ہندو رہ کر اور مسلمان مسلمان کی حیثیت میں ملک کی تحریک آزادی میں، ملک کی ترقی کے کاموں میں، عوام کے فلاح اور ملک کے دفاع کے مقصد

سے ایک نیشن اور ایک قوم بن جائیں۔ کانگریس آزادی کے بعد بھی اپنے اس نصب العین سے نہ ہٹی۔ ہندوستان کے دستور میں تمام مذاہب کا یکساں احترام اور سب کو یکساں آزادی اور ملک کے سیاسی نظام' ملک کی ترقی اور دفاع کے کاموں میں سیکولر اصول کا اختیار کرنا اس کے اسی نصب العین پر پختہ اعتقاد کا غماز ہے۔ کانگریس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنے تئیں اس نصب العین سے نہ ہٹی بلکہ کل ہند اقوام اور سیاسی تنظیمات کو بھی اسی اصول پر لا جمع کیا۔ آج اگر ہندوستان کی اقوام اور وہاں کی سیاسی پارٹیوں کے اختلافات و شکایات اور سوسائٹی کی بے شمار خرابیوں کو نظر انداز کر دیا جائے جو ہر معاشرے اور سوسائٹی میں ہوتی ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ''سیکولر اصول'' ہندوستان کی تمام اقوام' تمام سیاسی پارٹیوں کا اور تمام اہل مذاہب کا قومی سیاسی متفقہ اصول ہے۔

۸- اسی سلسلے کا ایک خطبہ صدارت ہے جو مولانا سندھی نے جمعیت علماے سندھ کے اجلاس (اپریل ۱۹۴۲ء) کے لیے لکھا تھا لیکن بعد میں مولانا کی صحت کی خرابی کی وجہ سے انھی کے ایما سے مولانا قاری محمد طیب دیوبندی کو اس کا صدر بنایا گیا تھا۔ یہ خطبہ ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔ مولانا نے اس میں ملک کے اجتماعی مفاد خصوصاً مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بہت اہم نکات اٹھائے ہیں اور ان پر بحث کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا سندھی کے فلسفہء نظام کو سمجھنے میں یہ خطبہ بہت مفید ہے۔

یہ تمام جماعتیں اور تنظیمیں ایک ہی نظامِ فکر سے تعلق رکھتی ہیں اور مولانا سندھی کی مہا بھارت سرور اجیہ پارٹی کے پروگرام اور ان کے پیش کردہ ''حکومت متوافق سرور اجیہ جمہوریات ہند'' یا ''انڈین فیڈرل سرور اجیہ ری پبلکن اسٹیٹس'' کے نظام کو سمجھنے کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی کسی انسانی جسم اور اس کی شکل کو سمجھنے کے لیے جسم کے اعضا و جوارح کے ادراک اور مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ملک کے اربابِ بصیرت اور اصحابِ فکر و تدبر کو مولانا عبید اللہ سندھی کی ان اسکیموں اور ان کے افکار و افاداتِ سیاسیہ پر غور کرنا چاہیے اور اگر ان سے موجودہ حالات میں کوئی رہنمائی ملتی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانے میں ہرگز دریغ نہ کرنی چاہیے۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا یہ منصوبہ سب سے پہلے ۱۹۲۴ء میں ترکی سے شائع ہوا تھا۔ پھر اسے تیس برس بعد ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے اپنے رسالے ''تاریخ وسیاسیات'' میں شائع کیا تھا اور اس کی اولین اشاعت کے پچھتر برس بعد ۱۹۹۸ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے اُسے شائع کیا ہے۔

منصوبے کی اس اشاعت میں اس سلسلے کی بعض توضیحات و تشریحات کے ساتھ کئی دوسری اہم مطبوعہ وغیر مطبوعہ اسکیمیں بھی شامل کردی گئی ہیں جو مولانا سندھی کے قلم سے یادگار تھیں اور منصوبے کے ہمہ جہت مطالعے میں ان کی اہمیت مسلم تھی۔ اس اہتمام نے سابقہ دونوں اشاعتوں کے مقابلے میں اس اشاعت کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس منصوبے اور اس کے ساتھ دیگر متعلقہ اسکیموں کی اشاعت سے برصغیر ہند پاکستان کی سیاسی تاریخ کے مطالعے کا ایک نیا باب کھلے گا جس کا کھلنا علمی سیاسی افادیت سے ہرگز خالی نہ ہوگا۔

نقد و تبصرہ:

مولانا عبیداللہ سندھی کے دورانِ قیام ترکی کا سب سے اہم واقعہ آزاد وطن کے بارے میں مولانا سندھی کا وہ یادگار منصوبہ ہے جو کانگریس کمیٹی کابل نے ''مہابھارت سرور اجیہ پارٹی کا پروگرام'' کے عنوان سے ستمبر ۱۹۲۴ء میں استنبول سے شائع کیا تھا۔

ہندوستان سے مولانا سندھی نکلے تھے تو ملک کی آزادی کے پروگرام کے ساتھ اتحاد عالم اسلامی اور احیائے اسلام کا نظریہ ان کے سامنے تھا لیکن کابل، ماسکو اور ترکی پہنچ کر انھیں تجربہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح کوئی اسلامی ملک بھی اپنے حالات و مفادات کو نظر انداز کر کے احیائے اسلام اور اتحاد عالم اسلامی کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ افغانستان، ترکی وغیرہ کے سامنے اول و آخر ان کے اپنے ملکی اور قومی مفادات ہیں۔

چناں چہ مولانا سندھی کے ذہن نے کابل میں اپنے قیام کے دوران ہی اتحاد عالم اسلامی کی تحریک سے مختلف انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ کابل میں ہندوستان کی عارضی حکومت میں مولانا کی شرکت، بلا تخصیص مذہب و ملت اہل ہند کو ہندوستان پر حملے کی صورت

میں انگریز حکومت سے عدم تعاون اور بغاوت کی دعوت اور کانگریس کمیٹی کابل کا قیام پھر روس، ترکی اور حجاز میں کانگریسی اور نیشنلسٹ کی حیثیت سے اپنا تعارف اور کانگریس کمیٹی کابل کی طرف سے ہندوستان کی آزادی کے لیے روسی حکومت سے معاہدہ وغیرہم مولانا سندھی کے اسی بدلے ہوئے اندازِ فکر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مولانا سندھی نے ترکی سے آزاد ہندوستان کے بارے میں دستور کے بارے میں جو مجمل اشارات اور نظامِ حکومت کے بارے میں جو پروگرام شائع کیا تھا، مولانا کے ذہن پر اس کا کوئی یکا یک نزول نہ ہوا تھا۔ وہ ہندوستان کے پیچیدہ سیاسی مسئلے کے حل، آزاد ہندوستان کے لیے دستوری خاکے اور نظامِ حکومت کے بارے میں پچھلے کئی برسوں سے سوچ رہے تھے۔ مولانا نے اقبال شیدائی کے نام ایک خط میں ۱۹۲۳ء کے اوائل میں جب وہ ماسکو میں تھے، ''ایشیا ٹک فیڈریشن'' پر ان سے اپنے تبادلہ خیال کو یاد دلایا ہے کہ ''ایشیاٹک فیڈریشن کے جس خاکے پر ماسکو میں آپ سے ذکر ہو چکا ہے۔ اسی خیال میں ترقی کرنا چاہتا ہوں۔'' (مولانا سندھی کے سیاسی مکتوبات ص ۲۳) اب مولانا ترکی آئے تو ماسکو کے مقابلے میں انھیں یہاں قدرے سکون میسر آیا تو مولانا نے زیادہ توجہ اور تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر سوچنا شروع کیا اور کچھ عرصے کے بعد جب کہ اگست میں ظفر حسن ایبک بھی استنبول آ گئے تو وہ باہم مشورہ و مباحثہ کے بعد ایک فیصلے پر پہنچ گئے اور انھوں نے اپنا پروگرام پہلے اردو میں پھر انگریزی میں شائع کر دیا۔ مولانا نے یہ پروگرام محمود بک کے مطبع استنبول میں طبع کروایا تھا اور بہ حیثیت صدر سرور اجیہ کمیٹی کابل اور سیکرٹری ظفر حسن ایبک کی جانب سے شائع کیا تھا۔ پروگرام کا اصل اردو مطبوعہ نسخہ یا اس کا انگریزی ترجمہ (مطبوعہ) ابھی تک دسترس سے باہر ہے۔ مولانا سندھی مرحوم کے قلم سے پروگرام کا مسودہ مولانا عزیز احمد مرحوم کے پاس تھا۔ سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اسے حاصل کر کے انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے سہ ماہی تاریخ و سیاسیات کراچی میں چھپوا دیا تھا۔ اس وقت یہی پیشِ نظر ہے۔ اس پروگرام کے چند خاص پہلو یہ ہیں:

۱- آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اندر سرور اجیہ پارٹی کا قیام۔ جس کی بنیاد

شاہ ولی اللہ دہلوی کے اصولوں پر ہوگی۔

۲- ہندوستان میں سرو راجیہ حکومت کا قیام

۳- سرو راجیہ حکومت کو چلانے والی اعلیٰ اختیارات کی کونسل کا قیام۔

۴- ایشیا کو برٹش استعمار کے استحصال سے بچانے کے لیے سرو راجیہ پروگرام کے مطابق ''سرو راجیہ ایشیاٹک فیڈریشن'' اور ایشیائی ممالک کی امداد کے لیے سرو راجیہ قومی بنکوں کی شاخوں کا قیام اور اگلے اقدام کے طور پر یورپ اور افریقہ میں سرو راجی قومی جماعت کی ایجنسیوں کا قیام۔

سرو راجیہ بنکوں کی بنیاد کے بارے میں مولانا سندھی نے وضاحت کر دی ہے۔ ان کا کاروبار غیر سودی اور نفع نقصان کی بنیاد پر ہوگا۔ قرضے غیر سودی ہوں گے وغیرہ۔

ہم یہاں مولانا کے اس منصوبے کی صرف چار دفعات نقل کرتے ہیں جو انھوں نے آزاد ہندوستان کی حکومت کے بارے میں مرتب کی ہیں:

حکومت متوافق سرو راجیہ جمہوریات ہند (انڈین فیڈرل سرو راجی ری پبلکن اسٹیٹس):

ہر ایک ''سرو راجیہ جمہوریہ'' اپنی اقتصادی، تمدنی اور سیاسی آزادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکومت متوافق سرو راجیہ جمہوریات ہند'' کا آزاد رکن رہے گا۔

(الف) حکومت متوافق سرو راجیہ جمہوریات ہند کا دارالصدر دہلی ہوگا۔ اولاً سرو راجیہ ہند میں اس حکومت کے دو ثانوی مراکز لاہور اور آگرہ بنائے جاتے ہیں تاکہ اس نمونے پر شمال مشرقی ہند اور دکن میں اس فیڈریشن کے ثانوی مراکز بنانے میں آسانی ہو۔

(ب) سرو راجیہ ہند کی جمہوریات، کشمیر، شمال مغربی پنجاب، شمال مشرقی پنجاب، جنوب مغربی پنجاب، پشتانیہ، بلوچستان اور سندھ جن کی آبادی تین کروڑ ہے لاہور (کے مراکز) سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی مشترک زبان ہندوستانی (اردو) ہوگی اور جمہوریات ''بھارت''

راجپوتانہ، گجرات، آگرہ کے حلقے میں داخل ہیں ان کی مشترک زبان ہندوستانی (اردو، ہندی) ہوگی۔

(ج) اس فیڈریشن کے مراکز مقامی جمہوریتوں سے علاحدہ رکھے جائیں گے۔ان کی حکومت کے لیے خاص قانون بنایا جائے گا۔اس فیڈریشن میں ہرایک سروراجیہ جمہوریہ کواس کے تناسب آبادی، اقتصادی، تمدنی اورفوجی اہمیت کے لحاظ سے حق نمایندگی دیا جائے گا۔حکومت متوافق جمہوریات ہند اور سروراجیہ جمہوریتوں کے باہمی تعلقات معین کرنے کے لیے مہابھارت سروراجیہ کانگریس ایک خاص قانون بنائے گی۔

''حکومت متوافق سروراجیہ جمہوریات ہند'' میں مذہب کوحکومت سے جدا کردیا جائے گا اوراس حکومت کو نہ تو کسی خاص مذہب سے تعلق ہوگا اور نہ اسے اپنے مشتملہ جمہوریتوں کے مذاہب میں دخل (دینے کا حق) ہوگا جوان شرائط کو پورا کرتی رہیں۔جن پران کو''مہابھارت سروراجیہ پارٹی'' نے تقسیم کیا ہے۔

ایک خاص وقت تک ہندوستانی ریاستیں بھی حکومت متوافق جمہوریات ہند میں شامل ہو سکتی ہیں۔اگران کے حکمران اپنی حکومت کے اختیارات اپنے ملک کی سرد راجیہ پارٹی کے ہاتھ میں دے دیں اوراپنے لیے فقط اتنے اختیارات پر اکتفا کریں جواس وقت ایک قانونی حکمراں کوکم ازکم درجہ پرحاصل ہیں۔

مولانا سندھی مرحوم کا یہ نہایت جامع پروگرام تھا جوکئی حصوں میں منقسم' چالیس دفعات اور بے شمار ذیلی شقوں پر مشتمل تھا۔اس میں فوجی تربیت کے ابتدائی پروگرام سے لے کر حکومت کی تمام شاخوں اوران کی کارگزاریوں تک کی تفصیلات موجود ہیں۔سید ہاشمی فرید آبادی کے الفاظ میں:

''یہ منصوبہ مولانا سندھی کی انقلاب پسندی اورسیاسی فراست کی دستاویز ہے۔بلکہ ہمارے افکار میں ارتقا کی ایک تاریخی شہادت بن گیا ہے۔''

مولانا سندھی کے پروگرام کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ہندوستان کوایک ملک نہیں بلکہ کئی

ملکوں کا مجموعہ اور کئی مذہبوں کا وطن مانتے ہیں۔ وہ اسے شمال مغربی، شمال مشرقی اور جنوبی تین منطقوں میں تقسیم کرتے ہیں اور تینوں منطقے کئی کئی ملکوں یا سرو راجیہ جمہوریتوں پر مشتمل ہیں۔ وہ ہر مستقل سرو راجیہ جمہوریت کو اپنا دستور بنانے اور اپنے جمہوریہ کا مذہب متعین کرنے کا حق دیتے ہیں، لیکن فیڈرل سرو راجیہ ری پبلکن اسٹیٹس (سرو راجیہ جمہوریات ہند) کے بارے میں انھوں نے صراحت کر دی ہے کہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ کسی سرو راجیہ کے مذہب میں وہ دخل بھی نہ دے سکے گی۔ اس اصول کے تحت مسلم اکثریت کی جمہوریتوں میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے مطابق دستور بنانے اور اسلامی اصولوں کے مطابق نظامِ حکومت چلانے کی کامل آزادی حاصل ہوتی اور مرکز کی مداخلت سے ہر طرح محفوظ رہتی۔

مولانا عبیداللہ سندھی ملک کی موجودہ صوبائی تقسیم کو درست تسلیم نہیں کرتے بلکہ لسانی، تہذیبی بنیادوں پر از سرِ نو تقسیم ناگزیر سمجھتے ہیں تاکہ ایک زبان اور تہذیب رکھنے والے یک جا ہو کر اپنی سرو راجیہ قائم کر سکیں۔ ہر سرو راجیہ جمہوریہ ایک مستقل ملک کی حیثیت کی مالک ہوگی۔

کل ہند نظام کو وہ انڈین فیڈرل ری پبلکس سے تعبیر کرتے ہیں جس میں سرو راجیہ جمہوریتیں (ممالک) بعض شرائط اور اختیارات کی وضاحت کے ساتھ شامل ہوں گی۔ پروگرام میں مولانا سندھی مرحوم کے الفاظ یہ ہیں:

> ''ہر ایک سرو راجیہ ملک مستقبل میں ایک ''سرو راجی جمہوریہ'' ہوگا جو اپنی اقتصادی، تمدنی آزادی محفوظ رکھتے ہوئے متوافق جمہوریات ہند (انڈین فیڈرل ری پبلکس) کے لیے اکائی بنے گا۔''

ہندوستان کی ریاستیں بھی اگر وہ ''مہابھارت سرو راجیہ کانگریس'' کے شرائط کو تسلیم کر لیں تو انڈین فیڈرل ری پبلکس کی رکن بن سکیں گی۔ مولانا نے یہ شرائط بھی پروگرام میں واضح کر دی ہیں۔

مولانا سندھی نے اپنے اس پروگرام میں اس حد تک تفصیل سے کام لیا ہے کہ جمہوریتوں اور مرکز کے لیے زبان، مذہبی تعلیم کے حق، اس کے انتظام، حلقہ انتخاب، رائے دہندگان اور امیدواروں کی صلاحیتوں اور سرو راجیہ جمہوریتوں کے مابین اور مرکز (انڈین فیڈرل ری

پبلکس) سے ان کے تعلقات اور اختیارات تک کی وضاحت کر دی ہے۔

ان کے پروگرام کا ایک اصول یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کو ملک کی آزادی کی جدوجہد، آزاد ملک اور جمہوریت کے قیام، ملک کی ترقی و استحکام کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ نے ملک کو ایک ایسے سماجی سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ انھیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستانی مسلمان اپنی تاریخ، اپنی زبان، اپنے سماجی اصولوں، اپنے ذوق و عادات غرض کہ ہر اعتبار سے ایک مستقل قومیت کے خصایص رکھتے ہیں لیکن ان کے یہ خصایص انھیں ہندوستان کی غیر مسلم قوموں ہی میں امتیاز نہیں بخشتے بلکہ یہ خصایص انھیں عرب و حجاز اور دنیا کے تمام ملکوں کے مسلمانوں سے بھی الگ رکھتے ہیں۔ تجربات نے مولانا سندھی مرحوم کے اس عقیدے کو اتنا پختہ کر دیا تھا کہ دنیا کا کوئی اسلامی ملک ہندوستان کے مسلمان کو مسلمان کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہندوستان کے مسلمان کو ''ہندوستانی'' کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اسی حیثیت میں اس سے معاملہ کرتا ہے۔

ظفر حسن ایبک کے الفاظ میں یہ پروگرام ذیل کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے تیار گیا تھا:

۱- ہندوستان کے لیے کامل آزادی حاصل کرنا اور آزاد ہندوستان میں ایک وفاقی (Federal) نظام حکومت قائم کرنا۔

۲- ہندوستان میں مسلمانوں، دوسری اقلیتوں اور اسلام کو محفوظ کرنا۔

۳- ہندوستان میں محنت کش طبقہ کی (یعنی کسان، مزدور اور دماغی کام کرنے والوں کی) اکثریت رکھنے والی حکومت قائم کرنا۔ زمینداری اور سرمایہ داری کو ملک سے ختم کر دینا تاکہ کمیونزم کے سبز باغ دیکھ کر لوگ دھوکا نہ کھائیں۔

۴- امپیریلزم (سامراج) کا توڑ کرنے کے لیے ایشیاٹک فیڈریشن بنانا۔

سرو راجیہ پارٹی:

ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے والی پارٹی کا نام قبلہ مولانا نے سرو راجیہ

پارٹی رکھا تھا۔ (سرو کے معنی ہندی میں "سب کے" ہیں) اس لیے پارٹی کے نام کے معنی "سب کا راج قائم کرنے والی پارٹی" ہے۔ جو سب لوگوں کی رنگ، مذہب، مال و دولت کے فرق کے بغیر حکومت قائم کرے گی۔

مولانا سندھی مرحوم کے اس پروگرام سے کمیونسٹوں کے پروگرام کا شروع ہی سے توڑ ہو جاتا ہے کیوں کہ کمیونسٹ صرف مزدوروں کے پروگرام (Prolitariats) کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں زمینداروں، سوداگروں اور کارخانہ داروں کو نمایندگی کا حق نہیں ہوتا۔

پارٹی ممبر شپ:

سروراجیہ پارٹی کے ممبروں کے لیے قبلہ مولانا صاحب نے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ اپنے طرز زندگی کو ملک کے کسانوں کے درجہء زندگی سے بلند نہ کریں گے یعنی اتنی ہی آمدنی پر گزارہ کریں گے جتنی کہ ایک اوسط درجے کے کسان کی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ جو ان کی آمدنی یا جائیداد ہو گی اسے وہ پارٹی کو دے دیں گے۔

نظام توافق:

پارٹی ہندوستان کو ایک ملک فرض نہ کرے گی اور نہ ہندوستان میں واحد قومیت کو پیدا کرنے کی کوشش کو اساس آزادی مانے گی بلکہ ملک میں نظام توافق (فیڈرل سسٹم) پر حکومت قائم کرے گی جس کے لیے مندرجہء ذیل طریقہ اختیار کیا جائے گا:

جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان شمال مغربی، شمال مشرقی اور جنوبی تین قدرتی حصوں سے متشکل ہونے کی وجہ سے ان حصوں کو ایسے صوبوں میں تقسیم کیا جائے گا جہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہو اور جہاں ایک ہی قسم کے رسم و رواج اور ایک ہی تمدن رکھنے والے لوگ آباد ہوں۔ ان صوبوں کو بعد میں ایک جمہوری ملک قرار دیا جائے گا جس کی جمہوری حکومت کو معاملات خارجہ، معاملات جنگ اور خارجی تجارت کے سوا اپنے تمام امور پر اختیار حاصل ہو گا (مثلاً اس طرح شمال مغربی ہندوستان (مشرقی پنجاب، مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر،

بلوچستان اور گجرات) جیسے جمہوری ملکوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ مشرقی اور جنوبی ہندوستان بھی اسی طرح کے جمہوری ملکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

یہ جمہوری ملک مرکزی وفاقی (فیڈرل) حکومت ہند میں شامل ہونے سے پہلے اگر چاہیں تو اپنے تمدن اور رسم ورواج کی وحدت کی بنا پر باہم مل کر خود ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان آپس میں مل کر اور ایک وفاقی نظام بنا کر مرکزی حکومت ہند میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی اور جنوبی ہند کی جمہوری حکومتیں اگر چاہیں تو باہم مل کر مرکزی حکومت میں داخل ہو سکتی ہیں۔

مجلس قانون ساز:

ان جمہوریتوں میں ہر عاقل بالغ مرد اور عورت کو حق انتخاب دیا جائے گا لیکن ہر اجتماعی طبقہ (Social Class) یعنی کسان، مزدور، دماغی کام کرنے والے لوگ تاجر اور کارخانہ دار مجلس قانون ساز میں اپنی آبادی کے تناسب سے اور اپنے ہی طبقے سے نمائندے چنے گا۔ اس طرح ان جمہوریتوں کی پارلیمنٹ میں کسان مزدور اور دماغی کام کرنے والے لوگوں کی اکثریت ہو گی اور یہ مجلس محنت کشوں کے مفاد کی حفاظت کر سکے گی۔

اقتصادی اور سماجی بنیادی اصول:

فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دے دیے جائیں گے۔ انفرادی اور ذاتی ملکیت (منقولہ اور غیر منقولہ) محدود کر دی جائے گی (یعنی معین حد سے زیادہ جائیداد اور مال قومی ملکیت ہو گا)۔

مالداروں پر متزائد ٹیکس لگایا جائے گا جس کی آخری حد (۵۰) فیصد ہو گی۔

ملک کی زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں گی اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا (ان جمہوریتوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی پارٹی فاروق اعظم کے فیصلے کے مطابق زمینداروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے پر اور امام ابو حنیفہ کے فیصلہ کے مطابق مزارعت چھوڑنے پر مجبور کرے گی)

ہر کاشتکار خاندان کو اس قدر زمین ضرور دی جائے گی جس قدر کہ وہ خود کاشت کر سکے۔
سودی لین دین بالکل ختم کر دیا جائے گا اور محنت کش طبقے کے پرانے قرض بے باق کر دیے جائیں گے۔

قومی ملکیت میں دیے ہوئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعے چلایا جائے گا اور مزدوروں کو نفع میں سے حصہ دیا جائے گا۔

محنت کش طبقہ کو مفت طبی امداد دی جائے گی اور اس کے لیے ستھرے گھر مہیا کیے جائیں گے۔

ابتدائی اور مڈل اسکولوں کی تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔

داخلی تجارت کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ہاتھوں میں ہوگی لیکن سوداگران کوآپریٹو سوسائٹیوں میں داخل ہو کر ان کے ممبر بن سکیں گے۔ خارجی تجارت مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوگی۔

ہر ایک جمہوریت اپنی اکثریت کے مذہب کو اپنا اسٹیٹ مذہب قرار دے سکتی ہے۔ بشرطے کہ وہ مذہب پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کا مخالف نہ ہو۔

مرکزی حکومت وفاقی جمہوریتِ ہند:

(Central Govt. of the Federated Republics of India.)

مرکزی حکومت ہند کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق ہوگا جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں۔

مرکزی حکومت خارجی اور جنگی معاملات اور خارجی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔

مختلف جمہوریتیں مرکزی حکومت میں اپنے تناسب آبادی، اقتصادی، تمدنی اور فوجی اہمیت کی بنا پر حق نمایندگی حاصل کریں گی۔

بین الممالک تعلقات:

امپیریلزم کو توڑنے اور ایشیا میں مندرجہ بالا اصولوں پر آزاد حکومتیں قائم کرنے کے لیے

''ایشیا ٹک فیڈ ریشن'' بنائی جائے گی جس میں روس کو بھی شامل کیا جائے گا۔

(اس زمانے میں روس نے اپنی موجودہ امپیریلسٹ سیاست قائم نہ کی تھی اگرچہ اس نے استبدادی حکومتوں کا قلع قمع کرنے کے بہانے سے بخارا اور خیوہ پر اپنے پٹھو مسلمان کمیونسٹوں کے ذریعے قبضہ کرلیا تھا لیکن ان کو اور آذربائیجان اور ترکستان کی جمہوریتوں کو خارجی ملکوں میں سفیر بھیجنے کا اختیار دے رکھا تھا)

روس کو ''ایشیا ٹک فیڈ ریشن'' میں شامل کرنے میں یہ مقصد مدنظر تھا کہ اس سے انگریزی امپیریلزم کے خلاف مدد لی جائے اور اس کو آزادی کے بعد ہندوستان کے معاملات میں محنت کشوں کی حمایت کے بہانے سے دخل اندازی کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

مندرجہ بالا خلاصے سے قارئین کو معلوم ہوسکتا ہے کہ اس پروگرام کے ذریعے مذہبی سوال کو درمیان میں لائے بغیر ہندوستان میں رہنے والی اقلیتوں کی ہستی کو محفوظ کرنا اور ہندوستان کے ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک جگہ جمع کرنا اور ان علاقوں میں اسلام کو سرکاری مذہب بنانا اور مسلمانوں کا ہندوستان کے اندر رہ کر اپنی ہستی اور اپنی تہذیب کو محفوظ رکھنا ممکن تھا۔

۱۹۲۴ء میں جب یہ پروگرام مرتب کیا گیا تھا ہندوستان کی فضا اور ہندو مسلم تعلقات اتنے خراب نہ تھے جیسا کہ ۱۹۳۰ء میں اور بعد میں نئی اصلاحات ملنے پر ۱۹۳۷ء میں ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو ہندوؤں سے بالکل جدا ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود قبلہ مولانا صاحب نے دوراندیشی سے ۱۹۲۴ء ہی میں ہندوستان کے لیے ایک ایسا وفاقی نظام (Federal System) تجویز کیا تھا جس میں مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والی جمہوریتوں کو باہم مل کر اور ایک وفاقی نظام میں منسلک ہوکر ہندوستان کی مرکزی حکومت میں شامل ہونے کا موقع ملتا اور اس طرح وہ اپنی ہستی اور اپنی تہذیب قائم رکھ سکتے۔ نیز ان کو مرکزی حکومت میں ان کی سیاسی اور فوجی اہمیت اور تناسب آبادی کے مطابق نمایندگی کا حق دینا تجویز کیا گیا تھا۔

مولانا سندھی مرحوم کا یہ بہت اہم اور جامع پروگرام تھا۔ اگر یہ پروگرام اس وقت ملک

کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا اور اس پر تبصرے اور تنقیدیں ہوتیں اور مولانا سندھی کو اس کی وضاحت کا موقع ملتا تو اس کی مزید خوبیاں ظاہر ہوتیں اور اگر کسی پہلو سے کوئی خامی تھی تو اسے دور کرنے کا موقع ملتا لیکن اس وقت اس کا کوئی موقع پیدا نہ ہو سکا اور ۱۹۳۹ء میں جب مولانا وطن واپس آئے تو وقت کا قافلہء برق رفتار کہیں سے کہیں پہنچ چکا تھا۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جب کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا اور دو مستقل آزاد ملک دنیا کے نقشے میں نمودار ہو چکے ہیں، مولانا سندھی کے منصوبے کا مہا بھارت اور سرور اجیہ نیشنل پروگرام کی حیثیت سے قبول کیا جانا قطعاً خارج از بحث ہو گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہاشمی فرید آبادی نے فرمایا کہ یہ ہمارے افکار میں ارتقا کی ایک تاریخی شہادت بھی ہے اور پاکستان میں زبان، تہذیب، سماجی روایات کے اختلاف، مذہبی فرق اور مذاہب کے نزاعات نے جو نفرت انگیز تحریکات اور مسائل پیدا کر دیے ہیں اور جن کا ابھی تک کوئی مستقل اور تمام مذاہب و فرق، تمام طبقات قوم اور تمام صوبوں کے لیے قابل قبول حل سامنے نہیں آیا ہے۔ ان میں مولانا سندھی کا یہ پروگرام مسائل کے تصفیے ان کے مستقل حل، باہمی شکایات کے رفع، کسی خاص علاقے کے استحصال کے انسداد، کسی خاص طبقے کے غلبے کے خوف، ملکی اتحاد، اعضائے قومی کے باہمی اشتراک، جمہوریت کے استحکام یا کسی نئے عادلانہ نظام سیاسی کی تلاش کے لیے غور و فکر کی ایک بہترین بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اب ہم اسے ''کل پاکستان سرور اجیہ نیشنل پروگرام'' کہتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں کہ ہمارے ملک میں نظام سیاسی کا مسئلہ از سرِ نو پیدا ہو گیا ہے اور اس وقت ملک کا جو دستور ہے اس کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب اس کے وفادار نہیں محض تابعدار ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے اسلامی آئین کو ۱۹۶۳ء کے بنیادی جمہوریت کے نظام نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ بنیادی جمہوریت کے فلسفے اور پورے نظام کو ۱۹۷۳ء کے پارلیمانی نظام نے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ ۱۹۷۳ء کے متفقہ اسلامی دستور کو ۱۹۷۷ء کے بعد شورائی اور غیر جماعتی پارلیمانی نظام نے کالعدم کر دیا اور پھر اس غیر جماعتی پارلیمانی نظام کو ۱۹۸۸ء کے جماعتی بنیادوں پر انتخابات نے رد کر دیا اور اس کی تمام اصلاحات و ترمیمات 'ما بہ النزاع' ٹھہریں اور دستور کے کئی تصفیہ و طے شدہ مسائل اخبارات و رسائل میں زیرِ بحث آ چکے

ہیں کہ کیا ہیں، وقت اور حالات کا تقاضا کیا ہے اور تجربات کی رہنمائی کیا ہے اس لیے کیا ہونا چاہیے اور آج کل ملک پھر ایک نئے ''سیاسی نظام'' سٹی گورنمنٹ کی تجربہ گاہ بنا ہوا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ کسی انقلاب کے بعد ملک میں یہی نظام قایم رہے گا یا کسی سابق تجربہ شدہ نظام کی طرف لوٹے گا یا کسی نئے نظام کی تجربہ گاہ بنے گا۔

پاکستان کی ستاون سالہ تاریخ میں کوئی نظام رہا ہو، مختلف صوبوں کے گنے چنے خاندان اور ان کے تین چار سو افراد ہیں جو برسر اقتدار رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک سیاسی، معاشی، اخلاقی ہر اعتبار سے تباہی کی طرف جا رہا ہے اور عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اصل خرابی کیا ہے۔ اس کا سر چشمہ کہاں ہے اور اس کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے؟ مولانا سندھی مرحوم کا یہ منصوبہ اس باب میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

نظریات کے تصادم اور ایک دوسرے پر کلی عدم اعتماد کے فقدان کے اس ماحول میں جمہوری نظام یا آمرانہ نظام' پارلیمانی نظام' شورائی نظام، اسلامی نظام، وفاقی نظام یا نیم وفاقی نظام کے داعیوں کی تسکین اور ان کے غور و فکر کے لیے مولانا سندھی کے اس سیاسی منصوبے میں بہترین سامان موجود ہے۔ اس بارے میں مفید اشارے ملتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ چار صوبوں کی جغرافیائی تقسیم ہی قطعی اور آخری رہنی چاہیے یا اس خطے کی قدیم تاریخ میں یا لسانی و تہذیبی دایروں میں اس کی علاقائی تقسیم کی حدیں تلاش کرنی چاہئیں یا کراچی صوبہ یا سرائیکی صوبہ یا ملک میں انیس یا کم و بیش صوبوں کے قیام میں ملک کے ہمہ قسم کے اور گمبھیر مسائل کے حل کی سعی مشکور ہوگی؟

یہ کام بہت ہی سنجیدگی اور نہایت غور و فکر کے ساتھ ایک قومی نقطہ نظر کو اپنا کر انجام دینے کا ہے۔ مولانا سندھی کے لائحہ عمل میں ملک کے چھوٹے سے چھوٹے طبقے یا لسانی، تہذیبی خصایص رکھنے والی مختصر جماعت کے ساتھ ناانصافی کی توقع نہیں ہے۔ اس لیے اس میں اس کے عدم اطمینان کی بھی کوئی معقول وجہ بہ ظاہر نظر نہیں آتی۔

جو حضرات غور و فکر اور تلاش حقیقت کے اس میدان میں آگے بڑھیں، انھیں اس طرح جانب دار ہونا چاہیے کہ وہ دوست سب کے ہوں، ہمدرد اور غم گسار سارے جہاں کے ہوں

لیکن دشمن کسی کے نہ ہوں، نقصان اور ضرر کسی کے لیے بھی پسند نہ کرنے والے ہوں۔ فرقہ وارانہ، خواہ مذہبی ہو یا لسانی اور محدود جماعتی نقطہ نظر اس سلسلے میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے اختلافات و نزاعات کا ایک نیا محاذ قائم ہو جانے کا خطرہ ہے۔

اس سلسلۂ بحث کی چند باتیں ابھی رہ گئی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱- پروگرام کی بہت سی کاپیاں ڈاک کے ذریعے ہندوستان کے ہندو مسلم زعما کو بھجوائی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض مرسل الیہ کو پہنچ گئی تھیں لیکن ہندوستان کی برٹش حکومت کو جوں ہی اس کا علم ہوا اسے ضبط کر لیا گیا اور ملک میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ اخبار زمیندار (لاہور) اور سیاست (لاہور) کی ۱۸ رمئی ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں اس کی ضبطی اور امتناعِ داخلہ کا حکم موجود ہے۔

۲- مولانا سندھی کے ایک خط (مورخہ ۲۸ رجنوری ۱۹۲۵ء) بہ نام اقبال شیدائی سے معلوم ہوتا ہے کہ کامریڈ ایم این رائے اور تو ارش نے اس پر تنقید کی تھی اور ان کے برعکس ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں وغیرہم نے اس کو پسند کیا تھا۔ اس وقت جمعیت علمائے ہند کے کسی بزرگ کا ردعمل مولانا سندھی کے علم میں نہیں آیا تھا لیکن انھیں یقین تھا کہ اس طبقے میں اسے ضرور پسند کیا جائے گا۔ مولانا لکھتے ہیں:

''کامریڈ (رائے) اور تو ارش کی بے رحمانہ تنقید سے جو تکدر پیدا ہوا تھا رفع ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ کچلو، ظفر علی اور حسرت اسے اچھی نگاہ سے دیکھیں گے۔ محمد علی اور شوکت علی ان تینوں کی تائید کے بعد مان جائیں گے۔ جمعیۃ العلما پورے طور پر قبول کرے گی۔ گذشتہ سال مختلف طور پر پروگرام کے اساسی نکتے لکھ چکا ہوں۔ وہ نہایت خوبی کے ساتھ مانے گئے۔ خلافت کانفرنس میں تنظیم کا پروگرام اسی کا عکس ہے۔ اگر آپ میرا خط اور ظفر علی خاں کا امرتسر خلافت کانفرنس کا خطبہ ملا کر پڑھیں تو آپ حیران ہوں گے۔''

مطالعے کے قدم آگے بڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن پشاوری (مقیم ترکی) سید سجاد حیدر یلدرم، اقبال شیدائی وغیرہم اس سے متفق تھے۔ ڈاکٹر انصاری بھی متفق معلوم

ہوتے ہیں۔ پنڈت نہرو کے بیان سے ان کا اتفاق ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا یہ کہنا اہمیت رکھتا ہے کہ ''انھوں نے ریاست ہائے متحدہ ہند یا ہندوستان کی متحدہ جمہوریت کی ایک سکیم تیار کی گئی تھی جس میں فرقہ وارانہ مسایل کو بڑی قابلیت سے حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔'' پنڈت جی اپنی خودنوشت ''میری کہانی'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہندوستانی جلاوطنوں میں ایک شخص مولوی عبیداللہ بھی تھے جن سے میں تھوڑی دیر کے لیے اٹلی میں ملا تھا۔ وہ مجھے بہت تیز آدمی معلوم ہوئے لیکن اس قسم کے جو پرانے طرز کے سیاسی جوڑتوڑ کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ جدید خیالات سے وہ باخبر نہیں تھے۔ انھوں نے ''ریاست ہائے متحدہ ہند'' یا ہندوستان کی متحدہ جمہوریت کی ایک اسکیم تیار کی تھی جس میں فرقہ وارانہ مسائل کو بڑی قابلیت سے حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے قیام استنبول کے (جو اس وقت قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا) بہت سے واقعات سنائے لیکن میں نے اس داستان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی اور مجھے اس کا خیال بھی نہ رہا۔ چند مہینے بعد وہ لالہ لاجپت رائے سے ملے اور غالباً ان کو بھی وہی قصہ سنایا۔ لالہ جی اس سے بہت متاثر ہوئے۔ چناں چہ اسی سال کونسلوں کے انتخاب کے سلسلے میں اس قصے کا بہت چرچا رہا اور اس سے طرح طرح کے بے جا اور حیرت انگیز نتائج اخذ کیے گئے۔ کچھ دن بعد مولوی عبیداللہ حجاز چلے گئے اور اب برسوں سے ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔''

پنڈت جی کے اس بیان کے بارے میں وضاحت ضروری ہے۔

(الف) لالہ لاجپت رائے کی مولانا سندھی سے ملاقات اگست ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے۔ یہ ملاقات استنبول میں ہوئی تھی۔

(ب) پنڈت جواہر لال نہرو کی مولانا سندھی سے ملاقات جولائی ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ جب کہ مولانا ترکی سے حجاز تشریف لے جا رہے تھے اور جہاز کے انتظار میں چند دن اٹلی میں

قیام کرنا پڑا تھا۔

(ج) لالہ لاجپت رائے سے مولانا سندھی کی گفتگو ہندوستان کی آزادی کے اس منصوبے پر ہوئی تھی جو مولانا نے روسی حکومت کے ساتھ مل کر بنایا تھا، جس کا اہم جزیہ تھا کہ افغانستان سے برٹش انڈیا پر حملہ کیا جائے گا اور اندرونِ ہند حکومت کے خلاف بغاوت کردی جائے گی۔ لالہ جی اُس کے سخت خلاف تھے کہ افغانستان کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔ لالہ جی سے مولانا کی گفتگو اس پروگرام کے بارے میں نہیں ہوئی تھی جس کا ذکر پنڈت جی نے اپنی مذکورہ بالا تحریر میں کیا ہے۔ یہ منصوبہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں تیار ہوا تھا اور اس میں ظفر حسن ایبک مولانا کے شریک تھے۔ ظفر حسن استنبول پہنچے تھے تو لالہ لاجپت رائے وہاں سے جا چکے تھے۔ اس پروگرام کے عام اثرات کے بارے میں مولانا سندھی نے لکھا ہے:

> ''ہمارے پروگرام کا جو اثر اس سال کانپور علی گڑھ میں ظاہر ہوا آپ تو کاہے کو پڑھتے ہوں گے۔ احمد حسن نے کسی قدر پڑھا ہے اور ہماری بات چیت بھی ہوئی ہے۔ ادھر مرکز میں اس کا اثر محسوس ہوتا ہے۔''

(خط بہ نام اقبال شیدائی)

۳- مولانا نے اس پروگرام کا انگریزی ترجمہ بھی چھاپا تھا اور ترکی ہی سے اُسے شائع کیا تھا۔ اس میں مولانا نے معمولی ردوبدل بھی کیا تھا اور بعض سخت الفاظ حذف کردیے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا خود لکھتے ہیں:

> ''اب ہمیں اس کا انگریزی ترجمہ چھپوانے کی تیاری کرنی ہے۔ بعض الفاظ بدل دیے ہیں۔ بعض فقرات چھوڑ دیے ہیں جن سے خواہ مخواہ دل آزاری کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں۔''

۴- مولانا سندھی نے صرف ہندوستان کے زعمائے قوم ہی کو یہ پروگرام نہ بھیجا تھا بلکہ افغانستان، ایران، روس، جاپان کے اربابِ سیاست کو بھی بھیجا تھا اور بعض ترک اکابر کو بھی مطلع کیا تھا۔ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ جو مدبرین وقت انٹرنیشنل سیاست سے یا خاص ہندوستان کے مسئلے سے دل چسپی رکھتے ہیں انھیں معلوم ہو کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ کیا ہے اور اس کے حل میں کیا پیچیدگیاں ہیں؟

حوالہ:

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا یہ پروگرام انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کے سہ ماہی مجلے ''تاریخ و سیاسیات'' کے شمارہ فروری ۱۹۵۴ء میں ''مولانا سندھی مرحوم کا منصوبہ'' کے عنوان سے چھپا تھا اور ہاشمی فرید آبادی مرحوم کے قلم سے اس پر یہ نوٹ تھا:

''ذیل میں ہم آزاد ہندوستان کے سیاسی آئین کا وہ خاکہ شائع کرتے ہیں جو مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے ۱۹۲۴ء میں مرتب کیا تھا۔ وہ اس وقت کابل سے روس ہوتے ہوئے ترکی پہنچے تھے اور عصمت پاشا وغیرہ کمالی اکابر کو بتانا چاہتے تھے کہ حصول آزادی اور انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان کے مسلمان آزاد اور فعال قوم کس طرح رہ سکیں گے۔ اسی غرض سے مرحوم کسی وحدانی یا مرکزی حکومت کی بجائے برعظیم کو مختلف آزاد ممالک میں تقسیم کرنا اور صرف سیاسی اتحاد کے ذریعے متحد رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کے ''سفرنامہ کابل'' اور ذاتی سوانح میں بھی جو علاحدہ چھپ کر شائع ہو چکی ہیں صاف صاف تحریر ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہندوستان میں محض ایک اقلیت رہ جانے پر قانع نہیں تھے اور تحریک خلافت سے بعد تک جو مسلم سیاسی اکابر کانگریس کے زیر اثر آ گئے تھے، ان کی مذمت کرتے ہیں۔ (دیکھو ذاتی ڈائری سفرنامہ کابل ص ۹۶)

مرحوم کا یہ منصوبہ قسطنطنیہ میں اردو اور انگریزی میں طبع ہوا تھا لیکن مدت سے نایاب ہے۔ ہمیں مولانا کے عزیز قریب اور رفیق طریق مولوی عزیز احمد صاحب نے جو آج کل کراچی میں مقیم ہیں، مہربانی سے یہ قلمی مسودہ دیا اور چوں کہ یہ نہ صرف مولانا مرحوم کی انقلاب پسندی اور سیاسی فراست کی دستاویز ہے، بلکہ ہمارے افکار میں ارتقا کی اب ایک تاریخی شہادت بن گیا ہے۔ ہم نے اسے رسالہ ''تاریخ و سیاسیات'' میں از سر نو چھاپ دینا مناسب سمجھا۔ یاد رہے کہ اس وقت تک خود اہل ہند کی طرف سے آزاد ہند کے آئین کا اور کوئی خاکہ یا مسودہ مرتب نہیں ہوا تھا۔''

حصہ سوم

چند تاریخی و تحقیقی مضامین

سر سید احمد خان

محمد ابراہیم خان تحصیل دار شاملی ضلع مظفر نگر

سر سید احمد خاں مرحوم نے بدخواہان ملک اور غدارانِ وطن پر بہ عنوان ''حالاتِ خیر خواہان مسلمانان'' جو تین رسائل تحریر فرمائے تھے' ان میں سے رسالہ سوم میں محمد ابراہیم خان تحصیل دار شاملی کے حالات و واقعات بھی ہیں۔ چوں کہ ان حالات سے واقعہ شاملی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے اس مضمون کا ابتدائی حصہ زیر نظر مضمون کا ضمیمے کے طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

سر سید مرحوم لکھتے ہیں: (ا-س-ش)

''یہ ایسا نامی افسر خیر خواہ سرکار ہے جس کی نیک نامی اور وفاداری اور جان نثاری کی شہرت تمام شمال مغربی اضلاع میں پھیل رہی ہے۔ ابتدائے غدر سے اس افسر نے گورنمنٹ کی خیر خواہی اور قیام عمل داری سرکار پر بہت چست کمر باندھی۔ چوتھے رسالے کے سواروں نے جب بغاوت کی اور تحصیل شاملی پر قبضہ کرنا چاہا تو یہ افسر کمال بہادری سے بمقابلہ پیش آیا اور اپنی تحصیل کو باغیوں کے ہاتھ سے بچایا۔ بہت ہی کم حاکم اضلاع متصلہ مظفر نگر کے باقی رہے ہوں گے جن سے ایام غدر میں اس افسر نے خط و کتابت نہیں رکھی۔ جہاں تک ممکن ہوا انتظام گورنمنٹ میں مدد کی اور جس قدر رلتا ہوا مال گورنمنٹ اور حکام یورپین کا دستیاب ہوا اس کو برآمد کیا اور پہنچایا۔ آخر کار جب مفسدہ زیادہ ہو گیا اور انتظام کے لیے معتمد آدمی زیادہ درکار ہوئے تو اس افسر نے رام پور سے تمام اپنے خاندان کو شاملی میں بلوایا اور سب کو کارِ سرکار میں مصروف کیا۔ پچاس آدمی اس افسر کے خاندان کے معہ اکبر خان اس افسر کے بھائی کے شاملی میں تھے جن میں سے اکثر بمقابلہ باغیانِ سرکار کی خیر

خواہی میں مارے گئے اور خود اس افسر نے بھی خیر خواہی سرکار میں اپنی جان نثار کی۔

زمانۂ غدر میں انتظام ڈاک کا جاتا رہا تھا اور پھر اس کا قائم کرنا اس زمانے میں کچھ آسان امر نہ تھا۔ اس افسر نے بموجب حکم کمانڈر انچیف صاحب بہادر کے کمالِ سعی وکوشش سے شاملی سے کرنال تک ڈاک قائم کی اور انتہا تک بہ خوبی جاری رکھی۔ جس سے نہایت فائدہ انتظام گورنمنٹ میں حاصل ہوا۔ چنانچہ اس کا حال پروانۂ کمانڈر انچیف صاحب بہادر مورخہ ۳/اگست سنہ ۱۸۵۷ء سے جس کی نقل آگے آوے گی واضح ہوگا۔

ستمبر سنہ ۱۸۵۷ء میں دفعتاً مسلمانانِ ساکنانِ تھانہ بھون نے جن کا افسر قاضی عنایت علی تھا۔ فساد برپا کیا اور ایک بڑے گروہ نے تحصیل شاملی پر حملہ کیا۔ اس وقت تحصیل شاملی میں تخمیناً دس سوار پنجابی رسالہ کے اور اٹھائیس سپاہی جیل خانہ کے اور پچاس سے زاید سپاہی متعینہ تھانہ وتحصیل کے اور باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے تھے۔ معہ اکبر خان اس کے بھائی کے جو رام پور سے گئے تھے اور وہاں موجود تھے۔ یہ افسر بکمال دلاوری و بہادری بمقابلہ پیش آیا اور تحصیل شاملی کو مستحکم کر کر اور اس میں محصور ہو کر بخوبی لڑا اور ہر دفعہ مفسدوں کے حملہ کو ہٹا دیا اور بہت سے آدمی ان میں سے مارے گئے۔ آخیر کو گولی و باروت تحصیل میں (ختم) ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کو قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آ گئے۔ یہاں تک کہ تحصیل میں گھس آئے۔ وہاں بھی مقابلہ ہوا اور یہ افسر نہایت بہادری سے معہ اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا اور شرط نمک حلالی کو پورا کر دیا۔ یہ قتل وخون ریزی شاملی میں ۱۴/ستمبر سنہ ۱۸۵۷ء کو واقع ہوئی جو دن کہ فتح دہلی کا تھا، مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مژدۂ فتح

دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔ اس ہنگامے میں ۱۱۳ آدمی جن میں سو سے زیادہ مسلمان تھے کام آئے اور ہر ایک تمغہء خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے ساتھ لے گیا۔

یہ ہنگامہ جو تحصیل شاملی میں تھانہ بھون کے مفسدوں کے ساتھ ہوا' وہ ہنگامہ بھی جس کو مفسدان تھانہ بھون نے جہاد نام رکھا تھا مگر اس تمام حالات کے دیکھنے سے واضح ہوگا کہ جو لوگ ان مفسدوں کے مقابلے میں آئے اور دوبدو ہو کر لڑے اور بہتوں کو جان سے مارا اور مرتے دم تک مقابلہ و مقاتلہ سے باز نہ رہے، وہ بھی مسلمان تھے اور نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا تھا۔ درحقیقت کوئی مسلمان ان بغاوتوں کو جہاد خیال نہیں کرتا تھا۔ کیوں کہ یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ جس حاکم کی عمل داری میں جو لوگ بطور رعیت ہو کر اس کے امن میں رہتے ہیں ان حاکموں سے مقابلہ کرنا بغاوت ہے نہ کہ جہاد!

میں نے سنا ہے کہ جب یہ مفسد تھانہ بھون کی تحصیل میں گھس آئے اور ابراہیم خان نے بہت بہادری سے ہتھیار (ڈالنے کی بجائے مقابلہ) کرنے میں جان دی تو باقی ماندہ آدمی پریشان ہوئے اور مسجد میں اور ایک درگاہ میں جو تحصیل (شاملی) میں ہے پناہ لی تاکہ مفسدان مقاموں کو مقدس سمجھ کر ان کی جان معاف کریں مگر ان کم بختوں نے وہاں بھی نہ چھوڑا اور سب کو جان سے مار ڈالا کہ مسجد اور درگاہ کی سب دیواریں خون سے بھر گئی تھیں۔

اکبر خان ابراہیم خان کا بھائی بھی کام آیا یہ شخص بہت دلاور تھا اور جب رام پور سے شاملی گیا ہے تو بجنور کے راستے سے گیا تھا اور جناب مسٹر الیگذینڈر شکسپیر صاحب بہادر سے ملازمت کی تھی' جب میں نے بھی اس بہادر کو دیکھا تھا اور شاملی پہنچ کر وہاں کے حالات کی عرضی بھی حضور

صاحب ممدوح میں بھیجی تھی۔''

اس کے بعد سرسید مرحوم نے وہ ''چٹھیات اور رپورٹ'' نقل کی ہیں جن سے ابراہیم خان اور اس کے بھائی اکبر خان کی خیر خواہی و وفاداری پر روشنی پڑتی ہے اور ان انعامات کی نشان دہی ہوتی ہے جو انگریز گورنمنٹ کی طرف سے ان کے پسماندگان کو مرحمت ہوا تھا۔ یہ اسناد اور رپورٹیں یہاں حذف کر دی ہیں۔ جو قارئین کرام ان کے مطالعے کے شائق ہوں وہ ''حالاتِ رسالہ خیر خواہانِ مسلمانان'' ملاحظہ فرمائیں اور اگر رسالہ دستیاب نہ ہو تو مقالات سرسید مرحوم (حصہ ہفتم) میں شائع کردہ مجلس ترقی ادب۔ لاہور ملاحظہ فرمائیں۔

معرکہء شاملی کے وقوع کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس کے بیان کرنے والے سرسید احمد خان ہیں۔ یہ کہنا کہ ''یوپی میں جنگ آزادی کی جدوجہد'' میں شاملی کا نام تک نہیں آیا۔ اول تو یہی بات درست نہیں۔ اس بارے میں اس عنوان کے تحت ذکر آ رہا ہے لیکن اگر اس کے صفحات اس واقع کے ذکر سے قطعی کورے ہوتے، تب بھی اس ذکر کا نہ ہونا معرکے کے عدم وقوع کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس کی یہ خوبی ہی نہیں کہ وہ کوئی تحقیقی کام ہے۔ وہ جمع و ترتیب کا ایک عام کام ہے جس میں بہت سی دستاویزات جو بہ آسانی دستیاب ہو گئیں انھیں مرتب کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بحث تو ہو سکتی ہے کہ کسی دستاویز کا درجہء استناد کیا ہے؟ یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اگر کسی واقعے کا ذکر نہیں ہے تو وہ واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔

اس میں تو شاہ جہان پور کے حالات میں بچوریا کے واقعے کا ذکر بھی نہیں۔ حال آں کہ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ میرے پردادا مجو خاں بچوریا کے معرکے ہی میں شہید ہوئے تھے۔ جنگ آزادی کے تمام تذکروں میں شاہ جہان پور کے واقعات میں بچوریا کے معرکے کا ذکر آیا ہے۔ اب خاکسار نے اس معرکے اور شاہ جہان پور کے شمال مغربی علاقوں میں پیش آنے والے واقعات پر مشتمل ایک سرکاری دستاویز تلاش کر لی ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی اسے مرتب کر کے شائع کر دینے کا ارادہ ہے۔

سرسید مرحوم کی تحریر کی اہمیت تاریخ کی کسی اہم دستاویز سے کم نہیں اور کوئی سرکاری رپورٹ اس کے درجہء استناد کو نہیں پہنچ سکتی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی

اعلیٰ حضرت حاجی امداداللہ رحمہ اللہ

اور تحریک آزادیٔ وطن

حضرت حاجی امداداللہ صاحب (المتوفی ۱۸۹۹ء) ۱۸۱۷ء میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد حجاز چلے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دل و دماغ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ انیسویں صدی کی تین عظیم الشان تحریکوں کا منبع و مخرج تھے۔

(۱) مسلمانوں کی دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جو تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی، جس نے بالآخر دیوبند کی شکل اختیار کی انھی کے خلفا و مریدین کی پرخلوص جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (المتوفی ۱۹۰۵ء) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (المتوفی ۱۸۸۰ء) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (المتوفی ۱۹۱۴ء) اور حاجی محمد عابد صاحب ان کے خلفاء تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن (المتوفی ۱۹۲۰ء) مولانا محمد قاسمؒ کے جانشین تھے۔ ان ہی بزرگوں کی کوششوں سے دینی تعلیم کا چرچا ہوا۔

(۲) باطنی اصلاح و تربیت کے لیے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں دو بزرگوں کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حاجی صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ نصف صدی سے زیادہ انھوں نے ایک پرانے قصبے کی ایک کہنہ مسجد کے گوشے میں بیٹھ کر مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کیا، لیکن مولانا تھانویؒ کی تحریک میں وہ وسعت اور گہرائی نہ پیدا ہو سکی جو مولانا محمد الیاسؒ کی دینی تحریک کو حاصل ہوئی۔

مولانا محمد الیاسؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور جذبہ اللہ نے انھیں عنایت فرمایا تھا۔ اس کی مثال اس عہد میں مشکل سے ملے گی۔ گذشتہ صدی میں کسی

بزرگ نے چشتیہ سلسلے کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا۔ جس طرح مولانا محمد الیاسؒ نے کیا تھا۔

(۳) انیسویں صدی عیسوی کی تیسری اہم تحریک' آزادی وطن کی تھی۔ اس سلسلے میں خود حاجی صاحب اور ان کے منسلکین نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ہندوستان کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ غدر کے زمانے میں تھانہ بھون کا انتظام حاجی صاحبؒ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور خود دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصل فرماتے تھے۔ آزادی وطن کے جس جذبے نے حاجی صاحبؒ کے قلب و جگر کو گرمایا تھا۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے پہلو میں ایک شعلہ بن گیا تھا۔ وہ اور ان کے رفقاء اور تلامذہ نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کا اقتدار ختم کرنے کے لیے جن مصائب کا سامنا کیا۔ تاریخ ہند کا کوئی دیانت دار مورخ ان کو بھلا نہ سکے گا۔'' (تاریخ مشائخ چشت: دہلی، ندوۃ المصنفین ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۴-۲۳۳)

مولانا غلام رسول مہر

بزرگانِ دیوبند

پہلا درجہ:

بزرگانِ دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اوّلین درجہء احترام واعزاز حاصل ہے، وہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی اس سرزمین کے آسمان پر اُن درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں، جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستے بتاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں علم وہدایت کے مشعل بردار تھے اور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے۔ جو دلوں اور روحوں میں برابر دین حقہ کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار —— ''دارالعلوم دیوبند'' ایسی ہے، جو تقریباً ایک صدی سے اس وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام وبقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سیکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی، جن کے کارنامے دین وسیاست دونوں کے دوائر میں قابل فخر ہیں۔

ان بزرگوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں حصہ لیا تھا۔ افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہوسکیں اور جن حضرات نے کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی وہ بعض وقتی مصالح سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جو کچھ کہا، اس سے صورتِ حالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔

مولانا عاشق الٰہی کا بیان:

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی واقعات کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ قاضیوں کے جس خاندان کو تھانہ بھون میں رئیس اعظم کی حیثیت حاصل تھی اس میں سے قاضی سعادت علی خاں پسر قاضی نجابت علی خاں کے دو فرزند تھے' ایک قاضی عنایت علی خاں اور دوسرے قاضی عبدالرحیم خاں۔ بڑے بھائی نے جاگیر کا پورا کام سنبھال لیا تھا۔ چھوٹا بھائی اطمینان سے

امیرانہ زندگی گزار رہا تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران ایک مرتبہ قاضی عبدالرحیم خان چند احباب کے ساتھ ہاتھی خریدنے کی غرض سے سہارن پور گیا اور کسی سرائے میں ٹھہر گیا۔ ایک بنیے کو بے چارے عبدالرحیم سے دشمنی تھی۔ اس نے اسپنکی صاحب (۱) کے پاس رپورٹ کر دی کہ دیکھیے تھانہ بھون کا رئیس بھی باغی ہو گیا ہے اور اس کا بھائی اس غرض سے ہاتھی خریدنے آیا ہے کہ دہلی بھیجے اور کئی روز سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

خونِ ناحق:

یہ افواہ گلی کوچوں میں بھی پھیل گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ذکی الحس انگریزوں نے ایک گارد عبدالرحیم خاں اور اس کے احباب کی گرفتاری کے لیے سرائے میں بھیج دی اور بے گناہوں کو گرفتار کر کے جیل میں پہنچا دیا۔ بغاوت کا مقدمہ چلا اور کوئی خاص ثبوت فراہم کیے بغیر عبدالرحیم خاں اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت تھی، جو اس غرض سے سات ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آئی تھی کہ حق و انصاف کی بخشش کا فرض انجام دے۔ (تذکرۃ الرشید: (حصہ اول)، ص ۷۴)

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

قاضی عنایت علی خاں:

قاضی عنایت علی خاں ان حالات سے بالکل بے خبر گھر میں بیٹھا تھا۔ حق ناشناس اور بے گناہ کش انگریزوں نے اسے اطلاع تک نہ دی ورنہ وہ بھائی کو موت کی سزا سے محفوظ رکھنے کے لیے تگ و دو ہی کر لیتا۔ اسے جب اس واقعہ الیمہ کا علم ہوا تو دنیا نظروں میں تیرہ و تار ہو گئی۔ بھائی کے جوشِ انتقام میں فوراً آدمی فراہم کیے۔ جب معلوم ہوا کہ چند سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی بہنگیاں رکھے ہوئے سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جا رہے ہیں تو قاضی عنایت علی خاں اپنے جانبازوں کو لے کر شیر علی کے باغ کے پاس گھات میں جا بیٹھا' اچانک سواروں

---

(۱) Spankie صحیح نام ہے۔ یہ ضلع سہارن پور کا سول افسر تھا۔ مولانا عاشق الٰہی نے اسے بنکھی لکھا ہے)

پر حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لیا اور انھیں زخمی کر کے بھگا دیا۔

سامان ہاتھ آیا تو جمعیت فراہم کی اور شاملی پر ہلہ بول دیا۔ وہاں خزانہ لوٹا اور بڑی تباہی پھیلائی۔ مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں:

> ''حاکم شاملی پہنچا اور چاروں طرف نعشوں اور سب کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصے سے تھرا اُٹھا۔'' آخر یہ کہہ کر کہ تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کرا کر چھوڑوں گا۔'' مظفر نگر واپس چلا گیا۔'' (تذکرۃ الرشید: (حصہ اول)،ص ۷۴ (حاشیہ)

نظم ونسق:

جب تسخیر دہلی کی افواہ پھیلی تو قاضی صاحب کو حفاظت کا خیال آیا۔ یہاں تک کہ تھانہ میں خبر گرم ہوئی' انگریزی فوج پہنچ رہی ہے۔ قاضی صاحب تھانہ بھون سے رخصت ہو کر نجیب آباد کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوئے؟ کچھ پتا نہ چلا۔ گویا ایک بھائی کو انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا۔ دوسرے نے اس کے انتقام کی پریشانی میں گھر بار اور زندگی تباہ کر لی۔

مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ اس بدامنی کے زمانے میں لوگ حضرت حاجی امداد اللہ مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے دینی سردار ہیں، دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر پر رکھیں۔ چناں چہ حضرت کو ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ چوں کہ حکومت کے فیصلوں اور شرعی قضا میں مولویوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم بھی تھانہ بھون ہی میں حضرت حاجی صاحب کے پاس ٹھہر گئے۔ (۲) (ایضاً)

ایک واقعہ

مولانا عاشق الٰہی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب مولانا رشید احمد' مولانا محمد قاسم اور حافظ ضامن کا مقابلہ بندوقچیوں سے ہو گیا:

''یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جواں مردی کہ جس ہول ناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چناں چہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناف میں گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔'' (ایضاً ص ۷۵)

مبادا ''سرکار کے مخالف باغیوں'' کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو، یہاں ''سرکار'' سے مراد خود حضرت حاجیؒ صاحب ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرف دار ہو کر آئے تھے لیکن ''سرکار'' کا لفظ ایسے طریق پر استعمال کیا کہ بہ ظاہر اس سے حکومت مراد لی جائے۔ کتاب ''تذکرۃ الرشید'' جس زمانے میں اور جن حالات میں مرتب ہوئی تھی انگریزوں کا اقتدار کمال پر پہنچا ہوا تھا اور نازک واقعات کی ترتیب میں مرموز طریق و اسلوب سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں، نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی؟

حافظ محمد ضامن:

حافظ محمد ضامن جو میرے انداز کے مطابق انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ تھانہ بھون کے باشندے اور حضرت حاجی صاحب کے خواجہ تاش یا پیر بھائی تھے۔ یعنی دونوں حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے مرید تھے۔ حافظ صاحب کے کمالات کا اندازہ بعض روایات سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

۱- جب کوئی شخص ان کے پاس آتا تو فرماتے بھائی اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو (مولوی شیخ محمد کی طرف اشارہ کر کے کہتے) مولوی صاحب سے پوچھ لے۔ اگر تجھے مرید ہونا ہے تو وہ بیٹھے ہیں حاجی صاحب ان سے مرید

ہو جا۔ اگر حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھا رہ۔ (ارواح ثلاثہ: ص ۱۵۶)

۲۔ اپنے مرشد طریقت حضرت میاں جیؒ صاحب کے ہمراہ ان کا جوتا بغل میں لے کر اور توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانہ جاتے' حافظ صاحب کے صاحبزادے کی سسرال وہیں تھی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس حالت میں جانا مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے سمدھیانے کے لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ توڑ ڈالیں۔ حافظ صاحب نے فرمایا ''رشتے کی پروا نہیں لیکن میں جس طرح جھنجھانہ جاتا ہوں اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔'' (ایضاً)

میلی سن کا پیش کردہ نقشہ:

اب آپ میلی سن کا پیش کردہ نقشہ سامنے رکھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ شاملی کے ایک ہندو زمیندار مہار سنگھ نے ہنگامہ بپا کیا تھا اور دربار دہلی سے تعلقات مکاتبت پیدا کر لیے تھے۔ انگریز اسے دبا نہ سکتے تھے۔ البتہ شاملی کو کھلم کھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ پھر اسپینکی صاحب نے گورکھوں کا ایک جیش بھیج دیا اور ایڈورڈز نے اس کمک سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر قبضہ کر لیا۔ اس پر قناعت نہ کی بلکہ اپنے ایک وفادار مسلمان ماتحت ابراہیم خاں کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ شاملی میں چھوڑا اور ایڈورڈز خود بڑھانا چلا گیا۔ یہ ۱۴ ستمبر کا واقعہ ہے۔

'اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قاضی عنایت علی خاں نے اپنے جانباز جوان ساتھ لیے اور شاملی پر بلہ بول دیا۔ ابراہیم خاں نے مقابلہ کیا لیکن آخر وہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا۔ میلی سن لکھتا ہے کہ ابراہیم خاں کے ساتھ عہد ہوا تھا کہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی عزت و جان کو کوئی گزند نہ پہنچے گا لیکن حوالگی کے بعد ایک سو تیرہ آدمیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ (جلد ششم ص ۱۲۴)

بعد کے حالات:

ایڈورڈز لوٹا تو اسے بڑا غصہ آیا لیکن مظفر نگر سے تشویش ناک خبریں ملیں تو ا[illegible]

بعد ازاں ایک جیش تھانہ بھون بھیجا گیا جو سکھوں اور گورکھوں پر مشتمل تھا۔ کپتان اسمتھ اور لیفٹنٹ کیولر اس کے کمان دار تھے۔ چوں کہ اس جیش کی تعداد کم تھی اس لیے مجاہدین نے اسے مار بھگایا۔ آخر مزید چند روز گزر گئے تو ڈنلاپ آیا تھانہ بھون پر قبضے کے بعد وہ شاملی پہنچا اور وہاں بھی انگریزی حکومت بحال کردی۔

میرا اندازہ ہے کہ حافظ محمد ضامن کپتان اسمتھ اور لیفٹنٹ کیولر کے مقابلے میں شہید ہوئے جس افسر کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے شاملی کی ویرانی دیکھ کر غصہ آیا وہ ایڈورڈز تھا۔ ڈنلاپ کے حملے کے بعد سب کو منتشر ہونا پڑا۔

حاجی صاحب اور مولانا قاسم:

انگریزی حکومت کی بحالی کے بعد حضرت حاجی صاحب نے چند مہینے انبالہ' تگڑمی پنجلاسہ وغیرہ مواضعات وقصبات میں چھپ چھپا کر گزارے۔ پھر سندھ اور کراچی کے راستے عرب تشریف لے گئے۔ روانگی سے پیشتر گنگوہ بھی پہنچے تھے تاکہ مولانا رشید احمد سے ملاقات کر لیں اور وہاں راؤ عبداللہ خاں رئیس کے اصطبل میں قیام کیا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد باقی عمر مبارک وہیں گزار دی۔ مولانا محمد قاسم کے بھی وارنٹ جاری ہوئے تھے۔ وہ کچھ مدت گرفتار نہ ہوئے پھر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

مولانا رشید احمد:

مولانا رشید احمد تھوڑی دیر چھپے رہے۔ گنگوہ میں پولیس پہنچی تو مولانا کے چچیرے بھائی مولوی ابوالنصر کو گرفتار کرلیا اور یہ سمجھ کر بہت تکلیفیں دیں کہ یہی مولانا رشید احمد ہیں۔ جب غلط فہمی آشکارا ہوئی تو ایک اور مخبر کی اطلاع پر پولیس رام پور گئی اور وہاں سے مولانا کو گرفتار کر کے سہارن پور لے گئی۔ یہ ۱۲۷۵ھ کے اواخر یا ۱۲۷۶ھ کے اوائل کا واقعہ ہے یعنی وسط ۱۸۵۹ء کا۔ مولانا کی اہلیہ نے یہ زمانہ بے مثال صبر سے گزارا۔ ان کے والد مولوی محمد تقی کچھ ہی دن پیشتر نواب جھجر کی ملازمت میں شہید ہو چکے تھے۔ پھر یکا یک یہ مصیبت نازل ہوگئی۔

مقدمہ

مولانا نے تین چار دن کال کوٹھڑی میں گزارے اور پندرہ دن حوالات میں رہے۔ مقدمہ پیش ہوا تو حکم ہو گیا کہ انھیں مظفر نگر لے جانا چاہیے۔ تقریباً چھ ماہ بعد انھیں رہائی ملی۔

میلی سن لکھتا ہے کہ تھانہ بھون کے واقعے کے بعد جو گرفتاریاں ہوئیں ان کے متعلق اسپنکی نے حکم دے دیا تھا کہ تمام مقدمے سول افسروں کے سامنے پیش ہوں اور سزا صرف انھیں لوگوں کو دی جائے جن کے خلاف ارتکابِ جرم قطعی طور پر ثابت ہو جائے۔ مولانا کے خلاف ایسے اثبات کا کوئی بھی امکان نہ تھا۔ لہٰذا وہ سزا سے محفوظ رہے۔

''تذکرۃ الرشید'' میں تین مخبروں کا ذکر جا بجا آیا ہے جنھوں نے مولانا کے متعلق مخبری کی یعنی قاضی محبوب علی خاں تھانوی، غلام علی ساکن قصبہ ملی پور اور حکیم احمد امیر بخش رام پوری۔

(۱۸۵۷ء کے مجاہد: لاہور، ص ۶۸-۱۶۳)

مولانا غلام رسول مہر

شیخ الہند کی تحریکِ آزادی

جماعتِ مجاہدین اور تحریکِ شیخ الہند:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نے آزادی کی جو تحریک منظم کی تھی اگرچہ اسے براہِ راست جماعت مجاہدین سے ربط و تعلق نہ تھا لہٰذا اس کے تفصیلی تذکرے کا یہ موزوں مقام نہیں تاہم دونوں تحریکوں میں اشتراک کے کئی پہلو موجود تھے۔ دونوں کا سلسلہء ارادت شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید پر منتہی ہوتا تھا۔ دونوں کے مقاصد میں خاصی یکسانی تھی۔ دونوں مسلمانوں کی سربلندی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشاں تھیں۔ دونوں نے ابتدائی سرگرمیوں کے لیے یاغستان کو منتخب کیا اور ہندوستان کے حواشی میں یہی ایک موزوں خطہ تھا، جہاں بین الملی پیچیدگیوں سے محفوظ رہ کر تہیہ ساز و سامان، فراہمی افراد اور استعدادِ عمل کے مطابق حصولِ مقاصد کے لیے جدوجہد کی جا سکتی تھی۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الہند کے مقرر فرمائے ہوئے کارکن بہ وقت ضرورت جماعت مجاہدین سے مدد لیتے رہے۔ دونوں جماعتوں کے کارکنوں کو جہاں ایک دایرے میں کام کا موقع ملا، وہ اشتراک پر کاربند رہے۔ لہٰذا اس تحریک کا مجمل ساذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

ابتدائی طریقہ کار:

افسوس کہ اس تحریک کے پورے حالات اب تک روشنی میں نہ آسکے۔ میں جانتا ہوں کہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عبیداللہ مرحوم سندھی نے اپنے اپنے حلقہ ہائے عمل کے متعلق خاصی گراں قدر معلومات فراہم کر دی ہیں لیکن جس حد تک مجھے علم ہے تحریک کے ابتدائی طریق کار کا سراغ لگانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ میرے مطالعے اور غور و فکر کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک نقشۂ عمل تیار کر چکے تھے اور اسے لباسِ عمل

پہنانے کی کوششیں انھوں نے اس وقت سے شروع کر دی تھیں جب ہندوستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔ ملک کے حالات کسی تیز تحریک کے لیے ہرگز سازگار نہ تھے۔ مسلمانوں پر حیرانی اور افسردگی طاری تھی۔ وہ ثریا سے تحت الثریٰ میں جا گرے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں اور کس طریق عمل پر گامزن ہوں۔ ایسے اصحاب بہت کم نظر آتے تھے، جن کے خلوص پر اعتماد کیا جا سکے اور جو پیش نظر مقاصد کے لیے بے تکلف ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہوں۔ پھر حضرت شیخ الہند کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب کا ہدف بننے سے حتی الامکان محفوظ رکھیں۔

اسلامی درس گاہوں کی تحریک:

میرے اندازے کے مطابق انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ جن جن اصحاب میں عملی صلاحیت پائیں انھیں جا بہ جا خصوصاً یاغستان کے مختلف حصوں میں دینی اور اسلامی درس گاہیں قائم کرنے کی ترغیب دیں۔ ملا صاحب سنڈاکے نے بھی حضرت شیخ الہند سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے جب کام شروع کیا تو ابتدا میں ایک اہم اسلامی درس گاہ ہی قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ حاجی صاحب ترنگ زئی شیخ الہند سے استفادہ کر چکے تھے۔ ان کے پیش نظر بھی درس گاہیں قایم کرنے ہی کا سلسلہ تھا۔

سید عبدالجبار شاہ ستھانوی لکھتے ہیں:

> ''جب مجھے نمایندگانِ سوات نے بتایا کہ ملا صاحب سنڈاکے اسلامیہ کالج پشاور کے بالمقابل ایک عالی شان اسلامی درس گاہ کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں تو میں نے ان پر صاف صاف واضح کر دیا کہ یہ اصطلاح ایک خاص جماعت کا شعار ہے جس میں مولوی صاحبان اور علماء شامل ہیں۔ اسلامی درس گاہوں کو حکومت برطانیہ کے خلاف تنظیمات کا پردہ بنا لیا گیا ہے اور حاجی صاحب ترنگ زئی جو اپنے ضلع میں ایسی درس گاہیں قائم کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اس حلقے کے ایک رکن ہیں۔''

سید صاحب کہتے ہیں کہ:

''مجھے یہ تو علم نہ تھا یہ اصطلاح کس نے ایجاد کی اور اس کا مرکز کہاں تھا لیکن جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے واضح کر دیا تھا کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ترکوں کے دشمن حملہ آوروں کی پشتیبانی کر کے خلافِ اسلامیہ کو برباد کر دینے کے در پے ہیں۔ اس پر مسلمانوں میں ہمہ گیر بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ علمائے حق خلافتِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ اس سلسلے میں تبلیغ و اشاعت کے لیے بہترین طریقہ یہ سمجھا گیا کہ گاؤں گاؤں اور بستی بستی میں اسلامی درس گاہیں قائم کر دی جائیں۔'' (شہادت الثقلین: حصہ دوم (قلمی نسخہ)، ص ۷۳)

صحیح تربیت:

غرض شیخ الہند کا ابتدائی منصوبہ یہی تھا اور اسے حضرت کے تعلیمی مشاغل سے خاص مناسبت تھی۔ یاد رہے کہ سید احمد شہید نے جب مسلمانوں کو بہ غرضِ جہاد منظم کرنے کا قصد فرمایا تھا تو پیروں کے شیوے کے مطابق مختلف علاقوں کے دورے شروع کر دیے تھے۔ جگہ جگہ وعظ بھی ہوتے، بیعت بھی لی جاتی ''توجہ'' بھی دی جاتی۔ اس طریقے کو سید شہید کے مشاغل سے خاص مناسبت تھی۔ میرے نزدیک مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی بانیانِ دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد و نصب العین بھی وہی تھا جس کے لیے کارفرمایانِ دیوبند میں سے صرف حضرت شیخ الہند سرگرم عمل ہوئے۔ اس طریقے اور شیوے کے مطابق جلد حسب مراد نتیجے برآمد ہونے کی توقع نہ رکھی جا سکتی تھی تاہم ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ انقلابی مساعی کے ساتھ ساتھ عوام کی صحیح تربیت کا کام بھی انجام پاتا جاتا، جس طرح سید شہید کی دعوتِ اصلاح میں انجام پاتا تھا۔ اس انقلاب سے بڑھ کر مصیبت خیز اور تباہ کن شے کوئی نہیں ہو سکتی جس کے عوام پیش نظر مقاصد کی تربیت سے کاملاً بے بہرہ ہوں۔ دریاؤں کا پانی نہروں کے ذریعے سے کھیتوں میں پہنچتا ہے تو زمین کی اندرونی صلاحیتیں پیداوار کے انبار فراہم کر دیتی ہیں لیکن اگر وہ پانی بے پناہ سیل کی شکل اختیار کرے تو بستیوں کی ویرانی اور فصلوں کی بربادی کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا؟

حوادث کا ہجوم وتواتر:

مجھے یقین ہے کہ حضرت شیخ الہند مرحوم ومغفور اپنے اسی منصوبے کے مطابق کار بند رہنا چاہتے تھے، لیکن حالات کی خوفناک مخالفانہ رفتار اور حوادث کا ہجوم وتواتر ان کے صبر وشکیب کے لیے شدید آزمائشوں کا موجب بن گیا۔ مولانا حسین احمد فرماتے ہیں کہ:

> ''حضرت کی گہری نظر واقعاتِ عالم، بالخصوص ہندوستان اور ترکی پر مرکوز رہتی تھی۔ طرابلس اور بلقان کے زہرہ گداز مظالم اور اندرونِ ہند میں انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ آرام اور چین تقریباً حرام ہوگیا۔ گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔ نتائج وعواقب سے بے پروا ہوکر انھیں سر بہ کف اور کفن بردوش میدانِ انقلاب میں نکلنا پڑا۔ زمانے کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں، اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ اسی غور وخوض میں گزرا، مگر پانی سر سے گزر چکا تھا، اس لیے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادرِ مطلق پر اعتماد اور بھروسا کر کے کام شروع کردیا۔'' (نقشِ حیات: ص ۳۶-۱۳۵)

ابھی وہ کوئی فیصلہ کن قدم نہ اٹھا سکے تھے کہ پہلی جنگ یورپ شروع ہوگئی۔ دو تین ماہ بعد ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔ گویا اطمینان ودل جمعی سے آہستہ آہستہ کام جاری رکھنے اور نتائج کا انتظار کرنے کی مہلت ختم ہوگئی اور اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ جو کچھ بھی ممکن ہو، فی الفور کیا جائے تاکہ انگریزوں کی مشکلات میں اضافہ ہو، ترکوں کو تقویت پہنچے اور ہندوستان کی آزادی کا خواب اپنی صحیح تعبیر سے ہم آغوش ہوجائے۔

فوری کام کی ضرورت:

حضرت شیخ الہند ان تمام اصحاب کی طبیعتوں اور صلاحیتِ استقامت کا انداز فرماتے رہتے تھے جو ان کے پاس تعلیم واستفادہ کی غرض سے آتے۔ ان میں سے بعض موزوں

اصحاب کو انھوں نے اپنے کام کے لیے چن لیا تھا۔ انھیں حکم دے دیا کہ جلد سے جلد یاغستان پہنچ جائیں اور آزاد قبائل کو ہندوستان پر حملے کے لیے اٹھائیں۔ مولانا عبیداللہ مرحوم کو انھوں نے افغانستان بھیج دیا کہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان کو اس نازک وقت میں خدمت اسلامیت کے لیے جاں بازانہ اقدام پر آمادہ کریں۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور ملا صاحب سنڈاکے کے متعلق ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ حضرت شیخ الہند کی تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا سیف الرحمٰن، مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود، مولانا محمد اکبر حضرت شیخ کے خاص کارکن تھے۔ خود ہندوستان میں ان کے مخلص کارکنوں کا شمار مشکل ہے، مثلاً مولانا عبدالرحیم رائے پوری، مولانا خلیل احمد، مولانا محمد احمد چکوالی، مولانا محمد صادق (کراچی)، شیخ عبدالرحیم سندھی، مولانا محمد ابراہیم راندیری، مولانا غلام محمد دین پوری، مولانا تاج محمود (امروٹ، ضلع سکھر)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری وغیرہ سیکڑوں ایسے اصحاب ہیں جن کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں۔ مولانا ابو الکلام، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، نواب وقار الملک اور وقت کے اکثر بڑے بڑے رہنما حضرت شیخ الہند کے مشیر و معاون تھے۔

مولانا عبیداللہ سندھی:

مولانا عبیداللہ سندھی کابل جانے کے لیے تیار ہو گئے تو اس سلسلے میں پہلا اہم مسئلہ روپے کا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مقصد کے لیے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم سے ملاقات کی۔ انھوں نے بے تامل پانچ ہزار روپے پیش کر دیے جو مولانا عبیداللہ کو دے دیے گئے۔ [1] معلوم نہیں اس کے سوا بھی کوئی رقم ملی یا نہ ملی۔ دوسرا مسئلہ اخفا کا تھا، خفیہ پولیس مولانائے مرحوم پر متعین تھی اور ان کی ہر نقل وحرکت کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس مصیبت سے بچنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ مولانا بہاول پور اور سندھ چلے جائیں۔ وہاں دیہات میں اس طرح رہنے لگیں، گویا کوئی کام ان کے پیش نظر نہیں۔ چناں چہ وہ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں دہلی چھوڑ کر پہلے بہاول پور بعد ازاں سندھ پہنچ گئے۔ اس اثنا میں راستے کے انتظامات بھی کرتے رہے۔ پھر یکا یک نکلے اور ۱۵ اگست کو سورا ایک کے علاقے میں داخل افغانستان ہوئے۔ شیخ عبدالرحیم

سندھی (۲) بلوچستان کی آخری حد تک ساتھ رہے۔ قیامِ افغانستان کے حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ قندھار ہوتے ہوئے ۱۵/ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ سردار نصر اللہ خاں، امیر حبیب اللہ خاں اور ان کے فرزند اکبر سردار عنایت اللہ خاں سے ملاقاتیں کیں۔ ترکی اور جرمن مشن آیا اور ہندوستانیوں نے حکومت موقتہ قائم کی تو مولانا کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ کانگرس کے بجاے ہندو مہا سبھا کے کارندے ہیں اور انھوں نے خود حکومت موقتہ کی اسکیم لالہ لاجپت رائے کو دے دی تھی۔ غالبًا اسی سکیم کی بنا پر لالہ لاجپت راے نے یہاں افغانوں کے حملے کا افسانہ تیار کیا تھا۔ حکومت موقتہ کی طرف سے روس، جاپان اور ترکی مشن بھیجے گئے۔ مولانا ان کی تجویز و ترتیب میں شریک رہے۔ افغانستان میں خدامِ خلق کی ایک جماعت بنائی جس کا نام ''جنود اللہ'' رکھا۔ امیر امان اللہ خاں کے عہد میں ایک ہندوستانی تعلیم گاہ قائم کرنے کی اجازت لی لیکن برطانوی سفیر نے زور دے کر یہ اجازت مسترد کرا دی۔ ۱۹۲۳ء میں افغانستان سے نکل کر ماسکو اور استنبول ہوتے ہوئے (۱۹۲۶ء میں) مکہ معظمہ پہنچ گئے (۳)۔ ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آئے۔

ریشمی خطوط:

مولانا نے کابل سے ایک خط ریشمی پارچے پر لکھ کر شیخ عبدالحق نومسلم کے ہاتھ شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس بھیجا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ شیخ صاحب فوراً حجاز چلے جائیں یا کسی معتمد علیہ حاجی کے ذریعے سے خط حضرت شیخ الہند کو پہنچا دیں۔ شیخ عبدالحق طلبا کے ساتھ ہجرت کر کے کابل پہنچا تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ نواز خاں کا ملازم تھا۔ وہ شخص ہر لحاظ سے قابل اعتماد تھا لیکن خدا جانے کیا حالات پیش آئے کہ اس نے خط شیخ عبدالرحیم کے حوالے کرنے کے بجائے اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر رب نواز خاں کو دے دیا۔ ان کے ذریعے سے پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائیر کے پاس پہنچا۔ اس طرح حکومت کو حضرت شیخ الہند مولانا عبیداللہ اور دوسرے کارکنوں کی تحریک کے کچھ راز معلوم ہو گئے۔ اسی وقت سے شیخ عبدالریم کا تعاقب شروع ہو گیا اور حضرت شیخ الہند کو بھی مکہ معظمہ میں گوناگوں حوادث سے گزرتے ہوئے بالآخر گرفتاری و نظر بندی قبول کرنی پڑی۔ اصل خط کا مضمون غالبًا یہ تھا کہ حکومت موقتہ نے افغانستان سے عہد نامہ کر لیا ہے۔ باقی حکومتوں کے پاس بھی سفارتیں بھیجی جا رہی ہیں۔ اس

سلسلے میں حکومت ترکیہ سے بھی ربط وضبط پیدا کرنا منظور ہے۔ آخر میں حضرت موصوف سے درخواست کی گئی تھی کہ ربط وضبط پیدا کرنے اور معاہدہ کرانے میں امداد دیں۔ اس ریشمی خط کے ساتھ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری کی طرف سے بھی ایک خط تھا۔ رولٹ رپورٹ میں ریشمی خط کے متعلق جو کچھ مرقوم ہے وہ غلط اور ناقص معلومات پر مبنی ہے (۴)۔

حضرت شیخ الہند:

ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ حضرت شیخ الہند بہت پریشان ہوگئے تھے کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہوجائیں اور اس طرح ضروری جدوجہد کے اوقات تعطل میں بسر نہ ہوں لہٰذا وہ باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے دوسرے مشیروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی مشورہ کیا۔ مولانا آزاد کی رائے قطعی طور پر یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیے اور یہیں بیٹھ کر کام کرنا چاہیے اگر اس اثنا میں گرفتاری ہوجائے تو اسے قبول کیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ باہر جاکر کوئی کام نہ ہوسکتا تھا اور باہر رہ کر معطل بیٹھنے سے اندر رہ کر معطل ہو جانا بہر حال بہتر تھا۔

حضرت شیخ الہند نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے حجاز پہنچیں، وہاں سے ذمہ دار ترک وزیروں اور ماموروں سے ربط وضبط پیدا کرکے ایران وافغانستان کے راستے یاغستان جائیں چناں چہ وہ چند رفقا کے ساتھ حجاز چلے گئے۔

حج کیا، اس وقت ترکوں کی طرف سے غالب پاشا حجاز کا گورنر تھا۔ مکہ معظمہ کے مشہور تاجر حافظ عبدالجبار دہلوی کے ذریعے سے غالب پاشا کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور ان سے تین تحریریں حاصل کیں:

۱- پہلی تحریر مسلمانانِ ہند کے نام تھی۔

۲- دوسری تحریر مدینۂ منورہ کے گورنر بصری پاشا کے نام تھی جس میں مرقوم تھا کہ حضرت شیخ الہند معتمد علیہ شخص ہیں ان کا احترام کیا جائے اور انھیں استنبول پہنچا دیا جائے۔

۳- تیسری تحریر غازی انور پاشا کے نام تھی کہ ان کے مطالبات پورے کیے جائیں۔

غالب پاشا نے خود حضرتِ موصوف کو تاکید کی کہ آپ تمام ہندوستانیوں کو آزادی کامل پر آمادہ کریں، ہم ہر ممکن امداد دیں گے اور صلح کی کانفرنس منعقد ہوگی تو اس میں ہندوستان کے لیے آزادیِ کامل کی حمایت کریں گے۔ ان میں سے پہلی تحریر ہندوستان کی تاریخ سیاسیات میں ''غالب نامہ'' کے نام سے معروف ہوئی۔

انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات:

حضرت شیخ الہند حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ چلے گئے اور ابھی وہ استنبول جانے کے لیے تیار نہ ہوئے تھے کہ انور پاشا، وزیرِ حربیہ ترکیہ اور جمال پاشا گورنر شام کے مدینہ منورہ پہنچنے کا تار آ گیا۔ چناں چہ ان سے بھی تخلیہ میں ملاقاتیں ہوئیں۔ جمال پاشا نے وہی مطالب دہرائے جو غالب پاشا حضرت شیخ الہند کے سامنے پیش کر چکا تھا۔ نیز وعدہ کیا کہ وہ شام پہنچ کر حضرت کے حسب خواہش ترکی، عربی اور فارسی میں ایسی تحریرات بھیج دے گا جنھیں جا بہ جا شایع کیا جا سکے۔ حضرت نے یہ بھی کہا کہ مجھے محفوظ طریق پر حدودِ افغانستان تک پہنچا دیا جائے تاکہ میں یاغستان چلا جاؤں۔ ہندوستان کے راستے گیا تو انگریز مجھے گرفتار کر لیں گے۔ جمال پاشا نے اس بنا پر معذوری ظاہر کی کہ روسی فوجیں ایران میں سلطان آباد تک پہنچ گئی ہیں گویا افغانستان کا راستہ کٹ گیا ہے۔ فی الحال آپ کو افغانستان پہنچانا غیر ممکن ہے۔ واپس میں گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی عمل داری کے کسی دوسرے مقام پر ٹھہر جائیں۔

''غالب نامہ'' کا ارسال:

حضرت خود تو حجاز ہی میں ٹھہر گئے لیکن ''غالب نامہ'' اور دوسرے ضروری کاغذات بہ طریق محفوظ ہندوستان پہنچانے کی تدبیر یہ سوچی کہ کپڑے رکھنے کے لیے لکڑی کا ایک صندق بنوایا، اس کے تختے اندر سے کھود کر کاغذات رکھ دیے۔ پھر انھیں اس طرح ملا دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو پتا نہ لگا سکے بلکہ شبہ بھی نہ ہو سکے۔ یہ صندق مولانا ہادی حسن رئیس خان جہاں پور (مظفر گڑھ) اور حاجی شاہ بخش سندھی کے حوالے کر دیا گیا۔ بمبئی میں جہاز پر سی آئی ڈی بھی موجود تھی اور اہل شہر بھی بہ کثرت آئے ہوئے تھے۔ انھیں میں سے مولانا محمد

نبی نام ایک شخص نے مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو ابھی مجھے دے دیجیے، چناں چہ صندوق انھیں دے دیا گیا۔ وہ اسے محفوظ نکالی لائے اور توڑ کر تحریریں نکال لیں۔ دہلی میں حاجی احمد میرزا فوٹو گرافر نے ان کے فوٹو لیے اور مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری کے ہاتھ یہ تحریریں سرحد بھیج دی گئیں۔ بعد ازاں حضرت نے اپنے ایک عزیز کو اس خیال سے تحریروں کا راز بتا دیا کہ وہ ہندوستان واپس جا کر ان کے فوٹو لینے اور جا بہ جا پہنچانے کا پیغام اربابِ کار تک پہنچائے۔ اسے گرفتار کرلیا گیا اور اس نے سب کچھ بتا دیا جس کی بنا پر مختلف اصحاب کی تلاشیاں ہوئیں اور انھیں گونا گوں مصائب سے سابقہ پڑا۔

حضرت شیخ الہند کی اسیری اور رہائی:

شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ خفیہ عہد و پیمان کر کے ترکوں سے غداری کی اور حجاز میں جتنے ترک موجود تھے وہ سخت و شدید ظلم و جور کا ہدف بنے۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفیقوں کو اسیر کر کے شریف نے جدہ پہنچا دیا جہاں سے انگریز انھیں پہلے مصر لے گئے پھر مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ تین برس سات مہینے کے بعد ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ (۸ جون ۱۹۲۰ء) کو بمبئی پہنچا کر انھیں رہا کیا۔

زمانۂ قیامِ حجاز میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری، مولانا محمد ابراہیم راندیری وغیرہ نے حضرت کی جو خدمت کی وہ ان کے حسناتِ عالیہ کا گراں بہا حصہ ہے۔

چند گزارشیں:

حضرت مرحوم نے جس جذبے، خلوص، ہمت اور والہیت سے کام کیا، اس کے بارے میں یہ عاجز کیا کہہ سکتا ہے جو ان اوصاف و خصائص کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتا لیکن صاف ظاہر ہے کہ اصل منصوبہ جن حالات میں تیار کیا گیا وہ حد درجہ ناساز گار تھے۔ چھان بین اور غور و فکر کی مہلت قطعاً میسر نہ تھی۔ جدھر روشنی کی کوئی کرن نظر آئی اس سے استفادے میں تامل نہ کیا گیا۔ چوں کہ پورا منصوبہ عالمِ اضطرار میں تیار ہوا تھا اس لیے اس کا کوئی پہلو بھی پائیدار ثابت نہ ہوا لیکن میدانِ عمل کی ہر شے کا حسن صرف جذبۂ عشق اور وارفتگی حبِ مقاصد پر موقوف

ہے۔ یہاں تدبیروں کی پختگی، منصوبوں کی پائیداری اور عقل وخرد کی دور بینی و مصلحت اندیشی کو کون پوچھتا ہے؟

در عجائب ہائے طور عشق حکمت ہا کم است
عقل را با مصلحت اندیشی مجنوں چہ کار

حضرت کے تمام کارکن علم و فضل، زہد و تقویٰ، بے غرضی و بے نفسی اور جرأت و ایثار میں اپنی مثال آپ تھے۔ مولانا عبید اللہ مرحوم نے کم و بیش پچیس سال غربت میں گزارے، گویا اصل زندگی اسی کام کی نذر کر دی۔ مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا منصور انصاری نے جلاوطنی کی حالت میں وفات پائی۔ ان میں سے کسی کی حرارت اسلامیت و آزادی آخری سانس تک ایک لمحہ کے لیے بھی افسردہ نہ ہوئی لیکن مجھے بہ صد ادب یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ وہ حضرات جن کاموں پر مامور ہوئے، ان کے لیے ہر لحاظ سے موزوں نہ تھے جو جرنیل خطرناک مقامات پر فوجوں کے علم بردار بننے کی ہمت رکھتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ سیاسی مجالس میں بھی ویسے ہی اہم کارنامے انجام دے سکیں۔ (سرگزشت مجاہدین، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور، ص ۳۸-۵۲۹)

حواشی:

(۱) حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم نے پچیس روپے ماہنامہ کی ملازمت سے زندگی شروع کی تھی پھر وہ بہت بڑے تاجر بن گئے اور ان کی آمدنی لاکھوں روپے سالانہ تھی وہ ہر دور اور ہر عہد میں قومی کاموں کے لیے متعد بہ رقمیں نکالتے تھے۔ موجودہ صدی کے اوایل میں سندھ کے اندر تبلیغ اسلام کے لیے جو کام جاری ہوا تھا اس میں بھی بے شمار روپیہ خرچ کیا۔ خلافت، لیگ اور مسلم کانفرنس کی تنظیمات میں بھی وہ چپ چاپ گراں قدر امداد دیتے رہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ اجرائے کار کے سوا ان کے سامنے کوئی غرض نہ تھی۔ دوسرے اداروں کو جو روپیہ دیا اس کا حساب مشکل ہے۔ خود کراچی میں دو اداروں کا پورا خرچ ان کے ذمے تھا۔ (مہر)

(۲) یہ اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد پوری زندگی تبلیغ اسلام میں بسر کر دی۔ سیاسی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ سرہند میں وفات پائی۔ میرے عزیز و مکرم دوست شیخ عبدالمجید سندھی بھی ان کے عزیزوں میں ہیں۔ وہ بھی اسلام لانے کے وقت سے برابر قید و بند کی تکلیفیں اٹھاتے رہے ہیں۔ (مہر)

(۳) ظفر حسن صاحب ایبک نے لکھا ہے کہ مولانا ۱۰؍اکتوبر ۱۹۲۳ء کو کابل سے نکلے تھے ڈاکٹر خوشی محمد کے علاوہ خود ظفر حسن ایبک، ڈاکٹر نور محمد سندھی، اقبال شیدائی، ظفر عمر مسعود، عبدالعزیز، عبدالرشید اور بینر جی بنگالی ان کے ساتھ تھے۔ محمد نادر شاہ مرحوم اس زمانے میں سپہ سالار کے عہدے پر مامور تھے لیکن امان اللہ خاں نے انھیں قطغن و بدخشاں میں رئیس ہیئت تنظیمیہ کی حیثیت میں مقرر کر دیا تھا۔ امان اللہ خاں کی خواہش یہ تھی کہ مولانا اور دوسرے اصحاب محمد نادر شاہ سے نہ مل سکیں، لہٰذا سفر روس کے لیے درہ پنج شیر کا راستہ تجویز کیا جو بدخشاں سے دور اور بے حد دشوار گذار تھا۔ (ملاحظہ ہو "چٹان" ہفتہ وار بابت ۲۴؍ستمبر ۱۹۵۶ء)

(۴) (رولٹ کمیٹی کی تحقیقات کی رپورٹ (لاہور، کاشی رام پریس، ۱۹۱۸ء) میں پیراگراف نمبر ۱۶۴ و ۱۶۵ (ص ۵۶-۲۵۲) حضرت شیخ الہند کی تحریک سیاسی کے تذکرے پر خصوصاً ۱۹۱۵، ۱۹۱۶ء کے اس واقعے کے بیان پر مشتمل ہے جسے عام طور پر تحریک ریشمی رومال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا عبیداللہ سندھی نے ریشمی کپڑے پر کچھ خطوط اور

معلومات لکھ کر شیخ عبدالرحیم (حیدرآباد، سندھ) کو بھیجے تھے کہ وہ انھیں کسی معتبر شخص کے ذریعہ مولانا محمود حسن کو حجاز بھجوا دیں۔ یہ خطوط کسی طرح بھی حکومت کے ہاتھ لگ گئے۔ سی آئی ڈی نے اس کا نام ''سلکن لیٹرز کنسپا ریسی'' (ریشمی خطوط سازش) رکھا اور ان کی بنیاد پر بہت سے لوگوں کے خلاف کیس (مقدمہ) بھی بنایا گیا تھا۔ (ا-س-ش)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

بزرگانِ دیوبند اور ان کی خدماتِ ملی

تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں

ہم یہاں ڈاکٹر قریشی مرحوم کی کتاب ''علماء — میدان سیاست میں'' سے چند اقتباس ''بزرگانِ دیوبند کی تاریخ خدمات ملی'' کے متعلق پیش کرتے ہیں لیکن ایک وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر قریشی مرحوم علی گڑھ مکتبۂ فکر کے مؤرخ ہیں۔ ان کا ایک نقطۂ نظر ہے۔ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے تاریخ کو دیکھا اور رائے قائم کی ہے۔ لیکن کئی باتوں میں مرحوم کی رائے سے اختلاف کے باوجود ہم ان کی عالمانہ اور مورخانہ حیثیت سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ انھوں نے معرکۂ شاملی کے وقوع' بزرگانِ دیوبند کے بروقت اقدام' مجاہدانہ کردار اور ناکامی کے بعد نئی حکمت عملی اور دار العلوم دیوبند کے مقصد قیام کے بارے میں راست اندازِ فکر اختیار کیا ہے لیکن بعض مسائل میں ان کے رویے اور بہت بعد کے حالات میں بزرگانِ دیوبند کے سیاسی مسلک پر (جو ان اقتباسات میں زیر بحث نہیں آیا ہے) شدید اعتراضات بھی کیے ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر صاحب کی ان آرا کو ہم درست نہیں سمجھتے لیکن ان پر نقد و نظر کا یہ موقع نہیں۔ اس کے لیے ہمیں کسی دوسری صحبت کا انتظار کرنا چاہیے۔ (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

(۱)

شاملی اور اس کا قائد

''بغاوت روہیل کھنڈ اور دوآب کے مختلف علاقوں میں پھیل گئی۔ مسلم تعلیم کا ایک مرکز موجودہ اتر پردیش کے ضلع مظفرنگر میں تھانہ بھون تھا۔ یہاں کے رہ نما عالم حاجی امداد اللہ تھے' جن کی عظمت ایک عالم، فاضل الٰہیات اور صوفی کی حیثیت سے برعظیم کے تمام تعلیمی اور دینی حلقوں میں تسلیم کی جاتی تھی۔ ان کے شاگردوں' مریدوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ وہ مولانا نصیرالدین دہلوی کے مرید تھے' جنھوں نے سندھ میں تحریک جہاد کی تنظیم کی تھی اور پھر قبائلی علاقے میں جا کر مجاہدین کی چھاؤنی میں داخل ہو گئے تھے۔ حاجی امداد اللہ کا تعلق تحریک جہاد سے اس وقت کے بعد برابر رہا تھا جب وہ تحریک ان کے مرشد کے ماتحت دوبارہ جاری کی گئی تھی۔ وہ اس وقت شاہ اسحاق سے جو خاندان شاہ ولی اللہ کے نمایندے تھے مشورہ کرنے کے لیے مکہ گئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین میں مشغول ہو گئے اور یہ کہا کہ بغاوت کے لیے کھڑے ہو جانے کا وقت اب پختہ ہو گیا ہے۔ جب اس ضلع میں بغاوت ہو گئی تو حاجی امداد اللہ نے تھانہ بھون میں سربرآوردہ علما کا ایک جلسہ منعقد کیا اور جہاد کی تنظیم کی۔ انھیں قائد منتخب کیا گیا۔ یہاں بھی اختلاف رائے کا اظہار ابتداءً اس بنیاد پر کیا گیا کہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے کافی وسائل دستیاب نہیں تھے۔ مگر یہ اعتراض مسترد کر دیا گیا۔ رہنماؤں نے عاجلانہ تیاریاں کیں اور شاملی کے خلاف کوچ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ مجاہد فوج کی کمان مولانا ضامن علی نے کی اور ان کی مدد مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کی۔ ان کی مہم یہیں ختم ہو گئی۔ کیوں کہ اب جنگ کا رخ انگریزوں کی موافقت میں پلٹ گیا تھا۔ سقوط دہلی نے باغیوں' ان کے حامیوں اور دوسرے لوگوں میں ایک عظیم نفسیاتی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ شاملی پر مجاہدین کے قبضے کے بعد جلد ہی وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس کے بعد انگریزی فوج نے خود تھانہ بھون کی طرف کوچ کیا جس کے دفاع کی تیاریاں بہ عجلت تمام کی گئیں۔ انگریزوں کی طرف سے پہلا محاصرہ ناکام ہو گیا اور وہ پسپا

ہوئے۔ اگلی مرتبہ وہ زیادہ بڑی فوج اور زیادہ اسلحہ لے کر آئے۔ دفاع کرنے والوں کے پاس صرف ایک توپ، چند توڑے دار بندوقیں اور تلواریں تھیں۔ پر جوش دفاع کے باوجود دیواریں توڑ دی گئیں۔ دروازے اڑا دیے گئے اور مکانات لوٹ لیے گئے۔ بعض بڑے مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ رہنما بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ نے مکہ جانے کی راہ بڑی مشکل سے نکالی۔ کیوں کہ انگریزی حکام انھیں گرفتار کرنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ دوسرے دو راہنما مولانا عبدالغنی اور مولانا رحمت اللہ بھی مکہ پہنچ گئے۔ مؤخر الذکر کو پہلے دہلی بھیجا گیا تھا کہ وہ وہاں کی صورتِ حال کا اندازہ لگائیں اور ان کی روداد پر تھانہ بھون میں جہاد کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کو ایک منصوبے کے مطابق پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس بیان میں یہ اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ نے ایک بغاوت کیرانہ میں منظم کی تھی جسے کچل دیا گیا اور وہ دہلی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں سے انھوں نے سورت کا سفر براہ راجپوتانہ کیا اور اس کے بعد مکہ روانہ ہو گئے۔

(علماء...... میدانِ سیاست میں: ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۵-۲۴۳)

(۲)

شاملی میں ناکامی اور نئی حکمت علی

دارالعلوم دیوبند کا قیام:

شاہ محمد اسحاق ۱۸۲۴ء میں شاہ عبدالعزیز کے جانشین ہوئے اور ۱۸۴۱ء میں حجاز ہجرت کر گئے جہاں ۱۸۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے کام کی ذمہ داری ان کے بھائی مولانا محمد یعقوب نے سنبھالی۔ مگر یہ واضح نہیں ہے کہ ہندوستان میں مولانا امداد اللہ نے مولانا مملوک علی کی جگہ کب لی۔ یہ تبدیلی ۱۸۴۶ء کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ کیونکہ یہ دونوں تقرر شاہ محمد اسحاق نے کیے تھے اور وہ ان تبدیلیوں کو اپنی روانگی سے بہت زیادہ قبل عمل میں نہیں لا سکتے تھے۔ اس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں بغاوت شروع ہوئی تو مولانا امداد اللہ تھانہ بھون میں تھے اور یہ کہ شاملی کی مہم ان ہی کی قیادت میں بروئے کار آئی۔ جب انگریز فاتح کی حیثیت سے ابھرے تو مولانا امداد اللہ مکہ کی طرف گریز کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں آیندہ طریق کار کے متعلق مشورے پھر شروع ہوئے۔

مدرسہء رحیمیہ کی نشاۃ ثانیہ اور روحِ حریت کا احیاء:

یہ امر بالکل واضح تھا کہ برعظیم میں سیاسی حالات کسی تحریک کے لیے بالکل مساعد نہیں ہیں۔ اس لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا کہ آزادی کی روح زندہ رکھی جائے۔ اس مقصد کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مدرسہء رحیمیہ کے اس انداز پر ایک مدرسہ قائم کیا جائے جو اس نے شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے زیر ہدایت پیدا کیا تھا۔ اس نے اپنے اساتذہ کے علم وفضل اور اپنی تعلیم کی عمدگی کے لیے تمام دنیائے اسلام میں شہرت حاصل کی تھی۔ اس نے ایک ایسے معاشرے میں دین داری اور سوزِ روحانی کی مشعل بلند رکھی تھی جو بے کار عیش وعشرت اور اخلاقی انحطاط کے مضعف اثرات سے مغلوب ہو گیا تھا اور اسلام کی سابقہ عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی دلی آرزو پیدا کی تھی۔ ۱۸۵۸ء میں، دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے

کے بعد جب انگریزوں نے اس مدرسے کی عمارتیں مسمار کردی تھیں تو اس کا وجود ختم ہو گیا تھا۔ اس نئے مدرسے کو دہلی یا اس اعتبار سے کسی بھی بڑے شہر میں قائم کرنا اس لیے خلافِ مصلحت سمجھا گیا کہ اس صورت میں اس کی سرگرمیاں اجنبی حکومت کی ناپسندیدہ توجہ جذب کریں گی۔

قیامِ مدرسہ کے لیے دیوبند کا انتخاب:

اس کے محل وقوع کے لیے دیوبند کو منتخب کیا گیا جو گاؤں سے بہ مشکل بڑا اور مواصلات کی شاہراہوں سے دور ایک پرسکون قصبہ تھا۔ چوں کہ قصبے میں رہایش کی آسانیاں میسر نہیں تھیں، اس لیے مدرسے کو لامحالہ اقامتی ہونا تھا، جس میں اساتذہ اور طلبہ کی برادری کے لیے سکونت کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے منصوبہ مرتب کیا اور بعد میں یہ ادارہ بغیر کسی دھوم دھڑکے کے اور نہایت ادنیٰ شروعات سے قائم کر دیا۔ بہت جلد عطیات آنے شروع ہو گئے اور یہ ادارہ روز بہ روز زیادہ قوت حاصل کرنے لگا۔ مولانا محمد قاسم کو یہ مدرسہ ۱۸۶۶ء میں قائم کرنے کے لیے سات سال کام کرنا پڑا اور اس کے بعد انھوں نے اپنی تمام زندگی اس کی تعمیر کے لیے وقف کر دی۔

منصوبے کا لازمی حصہ:

یہ ادارہ اسلامی علوم کی تعلیم حنفی مذہب کے مطابق دیتا تھا اور اس کی کوشش یہ تھی کہ اس کے فارغ التحصیل طلبہ کو اتنا ضروری علم حاصل ہو جائے کہ وہ مساجد کے ائمہ اور مکاتب و مدارس کے اساتذہ کی خدمات انجام دے سکیں۔ یہ اس منصوبے کا ایک لازمی حصہ تھا کیوں کہ اسی طریقے سے دیوبند کا پیغام برعظیم کے مختلف حصوں تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ علمی درس گاہ اس مقصد میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئی اور اس کا اثر نہ صرف برعظیم کے بعید ترین گوشوں تک پہنچا بلکہ قبائلی علاقوں اور افغانستان میں بھی پھیل گیا۔ اعلیٰ تعلیمات اور تخصص کی آسانیاں وہاں ہمیشہ موجود رہی ہیں مگر ان کے لیے نصاب تعلیم کبھی مقرر نہیں کیا گیا اور ممتاز طلبہ اپنی ہدایت ایسے اساتذہ سے حاصل کرتے ہیں جو متعلقہ مضمون میں اختصاصی تبحر رکھتے ہیں۔ پہلے نصاب تعلیم سات سال پر پھیلے ہوئے تھے۔ اب فارغ التحصیل ہونے میں آٹھ سال لگتے ہیں اور یہی واحد

سند ہے جو حاصل کی جا سکتی ہے۔ تخصص کے ذریعے کوئی اور برتر سند نہیں ملتی۔ دنیائے اسلام کے اندر دیوبند نے خود اپنے میدان میں بلند شہرت قائم کر لی ہے۔

سرکاری امداد اور مدرسے کی حکمت عملی:

اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ حکومت کی طرف سے کوئی مستقل امداد یا خاص رقم قبول کر کے اپنی آزادی کا سودا نہ کرے۔ کان پور کی مسجد کے سلسلے میں جس کا ذکر آیندہ آئے گا سر جیمس مسٹن گورنر صوبہ متحدہ (جہاں دیوبند واقع ہے) کو اس کی حکمت عملی نے مسلمانوں میں غیر مقبول بنا دیا تھا۔ اس لیے وہ مضطرب تھا کہ کسی قسم کی تلافی کرے۔ چناں چہ معائنے کی غرض سے اس کے دیوبند آنے کا انتظام کیا گیا اور سر جیمس چاہتا تھا کہ کسی متوالی یا غیر متوالی امداد کا اعلان کرے، مگر اس پیش کش کو اس توجیہ کے ساتھ شریفانہ طور پر رد کر دیا گیا کہ حکومت سے کوئی مالی امداد لینا اس ادارے کی حکمت عملی کے خلاف ہے۔ جب مہتمم کو گورنر کی دعوت موصول ہوئی اور انھوں نے شمس العلما کا خطاب قبول کیا تو اس پر بھی ادارے کے اندر اور باہر نکتہ چینی کی گئی۔

مدرسہ دیوبند اور مذہبی نزاعات:

اس درس گاہ کا منصوبہ بنانے والوں کی ابتدائی حکمت عملی یہ بھی تھی کہ اس کے اساتذہ سنی علما کے دوسرے مکاتب فکر سے فرقہ وارانہ نزاعات میں نہیں الجھیں گے۔ مگر بد قسمتی سے اس کی پابندی نہیں کی گئی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے ساتھ جو اختلافات شروع ہوئے انھوں نے حنفیوں کو مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اب ان کے درمیان ذرا سی بھی مودت باقی نہیں ہے۔ (۱)

چوں کہ اس مدرسے کو اپنے فرائض برطانوی ہند میں انجام دینے تھے، اس لیے حکومت کو اسے بند کرنے کا کوئی بہانہ مہیا کرنا خلاف مصلحت ہوتا۔ اس کے وجود کی حفاظت بڑے اہتمام کے ساتھ کی جاتی تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے اساتذہ اور طلبہ اپنے سیاسی تعلقات کے انتخاب میں آزاد ہوں گے اور سیاسی تحریکات میں عملاً حصہ بھی لیں گے لیکن اگر اس قسم کی سرگرمیاں اس ادارے کے وجود کو کسی خطرے میں ڈالیں گی تو وہ اس سے اپنے رسمی تعلقات

منقطع کرلیں گے۔ بالکل یہی صورت اس وقت پیش آئی جب مولانا عبیداللہ سندھی کی سیاسی سرگرمیوں نے ایسا رخ اختیار کیا کہ برطانیہ سے تصادم کا فوری خطرہ پیدا ہوگیا۔ انھیں دیوبند چھوڑنا اور دہلی میں کام کرنا پڑا۔ (۲) اس صورت حال پر اس کے مناسب سیاق میں بحث کی جائے گی۔ مگر مذکورہ بالا نکتے کی وضاحت کے لیے اس واقعے کا ذکر یہاں بھی کرنا پڑا ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر کہ دیوبند کا اثر افغانستان اور قبائلی علاقے میں پھیلایا جائے۔ حنفی مکتب فکر سے مضبوط وابستگی اور نزاع پیدا کرنے سے احتراز کی حکمت عملی بہت معقول تھی، مگر بدقسمتی سے اس دارالعلوم کی بعض راہنما ہستیوں نے بھی ایسی آرا کے اظہار کی شدید خواہش کو نہیں دبایا جنھیں خاموشی کے ساتھ بغیر اعتراض وتردید کے نہیں سنا جاسکتا تھا۔

مولانا رشید احمد گنگوہی ایک عظیم المرتبت عالم اور عمیق معارف روحانی سے بہرہ ور صوفی تھے۔ ان کی یاد گہری تعظیم وتکریم کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ وہ علما کے اس سب سے زیادہ اندرونی حلقے کے ایک رکن تھے جن کی رہنمائی میں دیوبند کی حکمت عملیاں تشکیل پاتی تھیں۔ انھوں نے یہ فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کے لیے کووں کا گوشت کھانا حلال ہے جو اس زمانے میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے جذبے اور روایت کے خلاف تھا اور اب بھی ہے۔ انھوں نے یہ استدلال بھی کیا کہ خدا کی قدرت میں یہ داخل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ایک اور نبی پیدا کر دے۔ انھوں نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ اگر خدا چاہے تو وہ جھوٹ بول سکتا ہے اگرچہ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا اور بے شک انھوں نے بزرگان دین کے مزارات پر سالانہ عرس کے اجتماعات اور فاتحہ اور میلاد کے مروجہ مراسم کی مذمت کی۔ اس کا ایک جواب بغیر کسی نام کے دیا گیا جس کا جواب الجواب مولانا خلیل احمد امبیٹھوی نے دیا۔ اس کا ذکر ضرور کرنا چاہیے کہ یہ جواب غیر ضروری طور پر سخت ناپسندیدہ زبان میں پیش کیا گیا۔ دونوں مکاتب فکر کے پیرووں کے جذبات مشتعل ہوئے اور اس سے قدرتاً تشویش پیدا ہوئی۔ چناں چہ حاجی شاہ امداد اللہ نے ایک مصالحانہ بیان شائع کیا۔ (۳) اس نزاع نے کم وبیش ویسا ہی افتراق پیدا کیا جیسا سید احمد شہید کے پیرووں کی بعض آرا نے ایسے مراسم عبادت کی پابندی کے ذریعے پیدا کیا تھا جنھیں قبائلی علاقے کی مقامی آبادی پسند نہیں کرتی تھی۔ (۴) دیوبند کے مکتب فقہ کی مخالفت خاصی

عام ہو گئی تھی اور اب بھی موجود ہے۔ اس دوران میں مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ظہور دیو بندیوں کے خاص مخالف کی حیثیت سے ہوا۔(۵) حنفی جو برعظیم کے مسلمانوں میں زبردست اکثریت رکھتے تھے دیو بندیوں اور بریلویوں کے دو متخاصم گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کا یہ نزاع ختم ہونے کے آثار اب بھی نظر نہیں آتے۔ درحقیقت ان دونوں گروہوں کے درمیان اختلاف نے موجودہ صورتِ حال کو اور زیادہ خراب بنا دیا ہے۔ جاہل عوام کے ذہن میں دیو بندی خیالات وہابیت کی ایک ایسی شکل کے مماثل ہو گئے جو کسی قدر زیادہ نرم ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جس سے تحریک دیو بند کے بانی' حنفی مکتب فکر کی تعلیمات سے مکمل مطابقت پر اصرار کر کے بچنا چاہتے تھے۔

دارالعلوم دیو بند کا قیام:

یہ دارالعلوم ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں نمایاں طور پر لڑنے والوں کی ایک خاصی تعداد کے لیے جائے پناہ تھا۔ مثلاً مولانا محمد منیر نانوتوی' جو مشہور مولانا مملوک العلی، مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا عبدالغنی کے شاگرد تھے اور ان لوگوں میں نمایاں تھے جو انگریزوں کے خلاف بڑی جرأت کے ساتھ لڑے' کئی سال تک اس ادارے کے مہتمم رہے۔ اس قسم کے تقررات اس ادارے کی حکمت عملی کے مطابق تھے۔ کیوں کہ انگریزوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں انتہائی احتیاط برتنے کے باوجود تا کہ انھیں کارروائی کرنے کی کوئی وجہ نہ مل سکے۔ خاص مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو بالکل مطمئن اور اپنی غلامی پر راضی برضا نہ ہونے دیا جائے۔

دارالعلوم کے برادر ادارے:

ایسے برادر اداروں کے قیام کی ہمت افزائی کی جاتی تھی جو اسی قسم کے اعلیٰ مقاصد کے تحت جاری کیے جائیں۔ پہلے دو مدرسے سہارن پور اور مراد آباد میں قائم کیے گئے۔ بعد میں ایسے اداروں کی تعداد قریباً چالیس ہو گئی۔ باضابطہ الحاق کا کوئی نظام نہیں تھا مگر اساتذہ زیادہ تر ایک ہی مکتب فکر کے لوگ ہوتے تھے۔ بعد میں تقرر کے لیے دیو بند کے فارغ التحصیل طلبہ اور بعض اوقات اساتذہ کی سفارش کی جاتی تھی۔

مظاہر العلوم سہارن پور:

سہارن پور کا مدرسہ مولانا سعادت علی سہارن پوری کے زیرِ نگرانی قائم کیا گیا۔ تین مہینے بعد ۱۸۶۶ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی استادِ حدیث اور صدرِ مدرس مقرر کیے گئے۔ وہ بھی مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے اور انھوں نے حدیث کا درس مولانا محمد اسحاق کے قدموں میں لیا تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں لڑے تھے اور سقوطِ شاملی کے بعد پوشیدہ ہو گئے تھے۔ مدرسے کو ان کی نگرانی میں فروغ حاصل ہوا۔ وہ بہت جلد ایک اچھی عمارت تعمیر کرنے کے قابل ہو گیا اور اس میں منتقل ہونے کے بعد اس کا نام ''مظاہر العلوم'' رکھا گیا اور اس نے اسلامی علوم وفنون کے ایک مرکز کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

ان اداروں کی خصوصیات:

ان اداروں کو اسلام کی بہترین علمی روایات کے مطابق چلایا جاتا تھا۔ وہ اساتذہ اور طلبہ کی ایسی بستیاں تھیں جن کا انتظام خود ارکان مجلس علمی کرتے تھے۔ اساتذہ ان قدرے قلیل وظائف پر قناعت کرتے تھے جو انھیں بہ طور تنخواہ وصول ہوتے تھے اور ادارے کو ایسی متوالی امدادیں قبول کرنے پر جو کسی کی طرف سے کوئی پابندی عائد کرتی ہوں مجبور کر کے اپنی آزادی کا سودا نہیں کرتے تھے۔ کسی معطی کو مدرسے کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اساتذہ کی ہر نسل مختلف میدانوں میں بلند مرتبت علما پیدا کرتی تھی۔ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے ان اداروں نے محض کتابی کیڑے پیدا نہیں کیے۔ ان کے اساتذہ اور طلبہ اپنے اردگرد کی دنیا سے دل چسپی لیتے تھے اور جب کبھی انھیں افق پر کوئی خطرہ نظر آتا تھا تو وہ اس کے مقابلے کی تیاریاں کرتے تھے۔

ایک تنقیدی نظر:

مگر اپنی قدامت پسندی اور علمی میدان میں غیر مسلموں کی ترقیوں کے تباہ کن اثرات سے بدگمانی کی بنا پر وہ مسلم عوام کے لیے قیادت مہیا کرنے کے اوّلین مقصد میں ناکام ہو گئے اور مسلم عوام اس احترام کے باوجود جو علما کے لیے ان کے دلوں میں تھا' اپنی قسمت آیندہ کے لیے ان کے سپرد نہیں کر سکتے تھے لیکن اس صورتِ حال کو محسوس کرنے میں خاصا عرصہ لگا۔ (۶)

(ایضاً: ص ۲۷۳-۲۷۸)

(۳)

ریشمی رومال تحریک اور اس کا پس منظر

۷۸-۱۸۷۶ء کی روس ترکی جنگ کے بعد مسلم دنیا میں یہ احساس کہ اسلامی آزادی برابر سکڑ رہی ہے، تقریباً عام ہو گیا۔ اس عمل کو کس طرح روکا جا سکتا تھا؟ اگر مسلم ممالک اپنے آپ کو مسلح کرتے اور انھوں نے اپنے جنگی ساز و سامان اور افواج کو نئے طور پر لانے کا کام پہلے ہی شروع کر رکھا تھا تو کیا وہ اس دوڑ میں مغرب کو پکڑ لیتے؟ وہ ایسا کر سکتے تھے جیسا کہ جاپان نے کر دکھایا مگر پھر یہ بھی تو ہے کہ جاپان اس طرح مسلسل دباؤ میں نہیں رہا تھا جیسے کہ مسلم دنیا رہی تھی۔ برعظیم میں سلطنت مغلیہ کے خاتمے نے برطانیہ عظمیٰ کو ایشیا کے مرکز میں بٹھا دیا تھا۔ مسلم دنیا کا مغربی حصہ گھر گیا تھا۔ شمالی افریقہ اور ایشیائے کوچک میں یورپ توسیع کی ایک طویل روایت کے ساتھ موجود تھا اور اسے صرف اسی وقت آگے بڑھنے سے روکا جا سکتا تھا جب مسلمان طاقت ور تھے۔ جنوبی اور وسطی افریقہ نے یورپی نو آبادکاری کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ چوں کہ بحر ہند میں مسلمانوں کی بالادستی ختم ہو چکی تھی اس لیے مسلم دنیا کا مشرقی حصے پر جو جزیرہ نمائے ملایا سے لے کر فلپائن اور شرق الہندی مجمع الجزائر کے انتہائی کناروں تک تھا' قبضہ ہو گیا تھا۔ اب یورپ کی تقریباً مجموعی طاقت اس پر تلی ہوئی تھی کہ عثمانیوں کو یکے بعد دیگرے مسلسل حملوں سے جان بر ہونے کا کوئی موقع نہ دے۔

اسی زمانے میں جب ۷۸-۱۸۷۶ء کی روس ترکی جنگ ہو رہی تھی، بعض تخیل پسند مسلمانوں نے جو نہ جغرافیہ سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور نہ انھیں بین الاقوامی صورتِ حال کے حقائق کا علم تھا۔ سلطان کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ سوڈان کے مہدی اور ایران سے اتحاد کر کے ہندوستان پر حملہ کر دے۔ سلطان نے اس قسم کی غیر ممکن العمل تجویز پر کوئی توجہ نہیں کی مگر اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کی کچھ حمایت حاصل کرنی چاہیے۔ برعظیم کے مسلمانوں نے ان سپاہیوں کے خاندانوں کی امداد کے لیے جو شہید یا معذور ہو گئے تھے چندہ جمع کیا۔ وہ جنگ یونان و ترکی کے واقعات کو بھی بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ جب

۱۸۹۷ء میں ترکوں نے تھیسلی میں یونانیوں کو شکست فاش دی تو بمبئی اور شملہ جیسے طویل فاصلوں پر واقع شہروں میں جشن منائے گئے۔ ایک مسلم وفد ترکی قونصل جنرل سے ملا اور اس سے درخواست کی کہ وہ برعظیم کے مسلمانوں کی طرف سے خلیفہ کو ہدیہ تہنیت پہنچا دے۔ خطبہ جمعہ میں سلطان ترکی کے نام کا ذکر اس کے خطابات کے ساتھ کرنے کا رواج اسی وقت پڑا۔ ایسی حالت میں کہ عیسائی طاقتیں اس کی عیسائی رعایا کی وفاداری کو تباہ کر رہی تھیں کیا وہ بھی عیسائی طاقتوں کی مسلم رعایا کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کوشش کر سکتا تھا؟ وہ خلیفہ تھا اور اس حیثیت سے تمام مسلمانوں کے لیے خواہ وہ کہیں رہتے ہوں امیر المومنین تھا۔ اس لیے اس نے بہ طور خلیفہ کے اپنی حیثیت پر زور دینا شروع کیا اور چوں کہ اس کی کوششیں اس اعتبار سے بار آور ہو رہی تھیں کہ اس کی حیثیت اس کی سلطنت سے باہر' بالخصوص ان علاقوں میں جہاں مسلمان آزاد نہیں تھے' تسلیم کی جا رہی تھیں۔ اس لیے اس کی ہمت افزائی ہوئی۔ وہ ہر سال حج کے دوران بڑے اجتماعات کے ذریعے دنیا کی مسلم آبادی کے نہایت دین دار طبقوں تک رسائی رکھتا تھا۔ یہ بات چاروں طرف پھیل گئی کہ مسلمان پر خلیفہ کی اطاعت واجب ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سلطان کو یہ خیال بہم پہنچانے میں انگریزوں کا بھی ہاتھ تھا۔ انھوں نے سلطان کو یہ ترغیب دی تھی کہ وہ ٹیپو سلطان کو ایک خط لکھے اور اس میں انگریزوں سے وفاداری کی طرف اشارہ کرے۔ انھوں نے پھر دوبارہ اسے یہ ترغیب دی تھی کہ وہ باج گزار مسلم والیان ریاست کو یہ لکھے کہ وہ ۱۸۵۷ء میں باغیوں کا ساتھ نہ دیں۔ اگر سلطان کا اثر کسی بغاوت میں شرکت سے مسلمانوں کو روک سکتا تھا تو کیا وہ بغاوت برپا نہیں کرا سکتا تھا؟

اس لیے جب یہ واضح ہو گیا کہ ترکی کو پہلی عالمی جنگ میں شریک ہونا پڑے گا تو سلطان نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ چون کہ برعظیم کے مسلمانوں نے ان جنگوں کے دوران جو ۱۳-۱۹۱۱ء کے زمانے میں ہوئی تھیں ترکوں کے لیے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا اس لیے ان کی طرف مخصوص کوششیں منعطف کی گئیں۔ متعدد ترک مختلف بہانوں سے برعظیم آئے۔ کمال عمر بے اور عدنان بے کو جنگ بلقان کے دوران مدد کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ترکی انجمن ہلال احمر کی طرف سے بھیجا گیا۔ وہ بمبئی' دہلی' لاہور' پٹنہ اور کلکتہ گئے اور سربرآوردہ مسلمانوں سے

روابط قائم کیے۔ تھوڑے عرصے کے بعد قسطنطنیہ کے ایک اخبار کے ایڈیٹر ایس ایم توفیق بھی ان میں شامل ہو گئے۔ برعظیم کے حامیان اتحاد اسلامی کے ساتھ ان کا رابطہ رہا تھا۔ ان کے بعد ترکی فوج کے محمد سمیع بے اور لیفٹیننٹ مصطفیٰ صادق آئے جو کراچی میں جہاز سے اترے اور اتحاد اسلامی کے حامیوں سے تعلقات استوار کرنے کے لیے بمبئی، دہلی اور لاہور گئے۔ پھر تین ترک اور دو ان کے ملازم کاشغر جانے کے ارادے سے بمبئی میں اترے۔ انھیں ایشیاے وسطیٰ کے مسلمانوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ تاکہ وہ اتحادِ اسلامی اور اتحادِ تورانی کے جذبات کی بنیاد پر حمایت حاصل کرنے کی کوششیں کریں۔ ہندوستانی محکمہ خبر رسانی نے یہ دریافت کیا کہ محمد سمیع بے حقیقتاً حاجی سمیع بے تھے اور مجلس اتحاد و ترقی کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ جو نوجوان ترکوں کی سیاسی تنظیم تھی۔ سمیع بے کا بھائی اشرف بے ترکوں کے لیے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے مصر بھی گیا تھا اور وہاں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ایک ہندوستانی مسلمان قسطنطنیہ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''جہان اسلام'' نکالتا تھا جس میں ترکی، عربی اور اردو کے مضامین شائع ہوتے تھے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایشیاے وسطیٰ، عربی بولنے والے ممالک اور برعظیم کی راے عامہ کو متاثر کرے۔ وہ برعظیم کے مسلم اخبارات کے ایڈیٹروں اور اتحاد اسلامی کے حامیوں کے پاس برابر آتا تھا۔ انھیں کمال عمر بے اور عدنان بے کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ بھی موصول ہوا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ترکی جرمنی کے اتحادی کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو جائے گا۔ ترکی نے حصولِ حمایت کے لیے اپنی کوششیں افغانستان میں بھی جاری کر دیں۔ ان علاقوں سے راست روابط کے علاوہ حج سے واپس آنے والے حاجی بھی اپنے ساتھ ایسے دستی اشتہارات لاتے تھے جن میں ترکی کے لیے امداد و حمایت کی درخواست کی جاتی تھی۔ اس کے جواب میں کابل کے ''سراج الاخبار'' نے ترکی کے لیے گہری ہمدردی کا اظہار کیا اور اس پر بھی زور دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ برعظیم میں اس اشاعت کے نسخے بڑی تعداد میں موصول ہوئے اور شوق سے پڑھے گئے۔ مولانا محمد علی نے اپنا مشہور مضمون ''ترکوں کا انتخاب'' اپنے ہفتہ وار اخبار ''کامریڈ'' میں لکھا جس کا نتیجہ بعد میں یہ ہوا کہ انھیں نظر بند کر دیا گیا اور ان کا پریس ضبط کر لیا گیا۔

آخرِ کار برعظیم میں یہ خبر پہنچی کہ سلطان نے اعلان جنگ کر دیا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ یہ جنگ جہاد ہے۔ انجمن خدام کعبہ کے دو ارکان کی قیادت میں سات سو حاجیوں کی ایک جماعت ترکوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہونے کے لیے حجاز ہی میں رہ گئی۔ مشہور مصری حامی اتحاد اسلامی عبدالعزیز شاویش کو مجلس اتحاد و ترقی نے اتحادیوں کے خلاف کام کرنے کے لیے مقرر کیا۔ ان کا رابطہ مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان اور کلکتہ کے امام الدین سے قائم تھا۔ چند سر برآوردہ مسلمانوں کا ایک جلسہ بڑی رازداری کے ساتھ دفتر ''ہمدرد'' دہلی میں اس لیے منعقد ہوا کہ جہاد کے امکانات پر بحث کی جائے۔ اب حکومت نے کارروائی کی۔ مولانا ظفر علی خان کو ترکوں کی حمایت میں ایک تقریر کرنے پر نظر بند کیا گیا۔ مولانا محمد علی اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی نظر بند کر دیے گئے اور ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' ضبط کر لیے گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی نظر بند کیے گئے اور ''الہلال'' کی اشاعت بند ہوگئی۔

لاہور کے مہاجر طلبہ:

سلطان نے خلیفہ کی حیثیت سے جو فتوائے جہاد جاری کیا تھا اس کے نسخے سرحد کے مرکز مجاہدین میں موصول ہوئے تھے۔ اس تنظیم کے نمائندے مولوی فضل الٰہی تھے اور ان کے گماشتے لاہور میں مولوی عبدالرحیم تھے جو عام طور پر مولوی بشیر کے نام سے مشہور ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پر جوش مسلم طلبہ کا ایک گروہ تھا جنھیں مولوی عبدالرحیم نے یہ ترغیب دی کہ وہ ترکی فوج میں شریک ہو کر جہاد میں حصہ لیں۔ گورنمنٹ کالج کے آٹھ طلبہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے چار طلبہ اور ایچنسن چیفس کالج اور اسلامیہ کالج کے ایک ایک طالب علم نے رازداری کا حلف اٹھایا اور ۵ فروری ۱۹۱۵ء کو معتدبہ تکالیف کے بعد مرکز مجاہدین میں پہنچے اور وہاں سے کابل آ گئے۔ کوہاٹ اور پشاور کے چند طلبہ بھی ان سے جا ملے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن:

یہ نوجوان ہی وہ مسلمان نہیں تھے جن کا ذہن اس سمت میں کام کر رہا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک استاد مولانا محمود حسن بھی (جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوئے)

ترکوں کی مدد کرنے کے لیے برعظیم میں ایک بغاوت منظم کرنے کے امکانات پر غور کر رہے تھے۔ ان کے ایک شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی اس کام کے لیے نہایت موزوں شخصیت رکھتے تھے۔ وہ ایک پیدائشی انقلابی تھے۔ ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور ابھی طفل مکتب ہی تھے کہ مسلمان ہو گئے تھے۔ استاد اور شاگرد نے ایک دوسرے پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ مولانا عبیداللہ کا منصوبہ یہ تھا کہ جہاد کے عقیدے کو دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کے ذریعے تمام برعظیم میں پھیلایا جائے۔ دارالعلوم کی انتظامیہ کو یہ فکر تھی کہ حکومت کو کوئی ایسا بہانہ فراہم نہ کیا جائے کہ وہ اس ادارے کو تباہ کر دے۔ اس لیے اس نے انھیں (مولانا سندھی کو) استاد کے عہدے سے سبک دوش کر دیا۔

نظارۃ المعارف القرآنیہ:

مولانا عبیداللہ بغیر کسی خوف وخطر کے، دہلی چلے گئے۔ وہاں انھوں نے حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک کی مدد سے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جو مسلم نوجوان برطانوی ہندی لادینی تعلیم کے زیر اثر آ رہے ہیں، ان میں تعلیمات اسلامی کو مقبول بنایا جائے۔ یہاں بھی انھوں نے دو مختصر رسالے لکھے، جن میں اتحاد عالم اسلامی کی اہمیت پر زور دیا۔ ان رسائل میں انھوں نے اس منصوبے کی حمایت بھی کی کہ برعظیم پر باہر سے ایک حملہ ہونا چاہیے اور اس کے بعد ہی انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت اندرون ملک برپا ہونی چاہیے۔

استاد شاگرد کے بیرونِ ہند کے سفر:

وہ مولانا محمود حسن کے پورے تعاون سے کام کر رہے تھے جنھوں نے اب یہ سوچا کہ بہترین کام کسی مسلم ملک ہی میں جا کر ہو سکتا ہے اور اس لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ حجاز جائیں گے اور مولانا عبیداللہ سندھی سے کہا کہ وہ افغانستان جائیں جو جرمن، ترکی اور ہندوستانی باغیانہ سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ مولانا محمود حسن ہندوستان سے عین وقت پر روانہ ہو گئے۔ کیوں کہ حکومت ہند انھیں گرفتار کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ مگر یہ خبر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو بعض

ہمدردوں کے ذریعے مل گئی تھی اور انھوں نے مولانا کے سفر کا انتظام کر دیا تھا۔ مولانا محمود حسن اپنی روانگی سے قبل انگریزوں کے خلاف خفیہ کام کر رہے تھے۔ ہندو اور سکھ انقلابیوں سے ان کا رابطہ قائم تھا اور وہ اکثر خفیہ طور پر ان سے ملنے دیوبند آیا کرتے تھے۔ جہاں انھوں نے ایک مکان خاص طور پر ان کے ٹھیرنے کے لیے کرایے پر لے رکھا تھا۔

قبائلی علاقے میں جہادی سرگرمیاں:

اس کے علاوہ انھوں نے سرحد پر لشکر مجاہدین کو سرگرم عمل کرنے کی بھی کوششیں کیں اور اپنے معتمد ایلچی اس علاقے میں بھیجے تاکہ قبائل میں اتحاد پیدا کریں اور مجاہدین کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور کریں۔ اس مقصد میں انھیں متعد بہ درجے تک کامیابی حاصل ہوئی۔ کیوں کہ ان کے بہت سے شاگرد اس علاقے میں تھے جن پر مقامی آبادی کا اعتماد قائم تھا۔ حاجی ترنگ زئی کو بھی اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ برطانوی علاقے چھوڑ کر قبائلی علاقے میں منتقل ہو جائیں۔ ابتدا میں قبائل اور مجاہدین کو کامیابی ہوئی مگر بعد میں انھیں مشکلات درپیش آئیں جن کی ایک وجہ تو اسلحہ کی کمی تھی اور دوسری وجہ انگریزوں کا یہ پروپیگنڈا تھا کہ سرحدی علاقے کو قریب ترین مسلم فرمانروا امیر افغانستان کی رہنمائی کا انتظام کرنا چاہیے اور جہاد سے پہلے جہاد کی بیعت ضروری ہے۔ یہ چال کام کر گئی' کیوں کہ انگریز جانتے تھے کہ امیر حبیب اللہ خان انگریزوں سے نہیں لڑیں گے۔ یہی وہ واقعات تھے جن کے پیش نظر مولانا محمود حسن نے مولانا عبیداللہ سندھی کو افغانستان بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اگر یہ خبر نہ آتی کہ انگریزوں کا ارادہ انھیں گرفتار کرنے کا ہے تو بھی وہ حجاز روانہ ہو جاتے۔ اس خبر نے ان کی روانگی میں صرف تعجیل کر دی۔ وہ اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ صوبائی حکومت کے نام احکام بہ ذریعہ تار اس وقت بمبئی پہنچے جب جہاز بندرگاہ سے روانہ ہو گیا تھا اور یہی صورت عدن میں پیش آئی۔

کابل میں انقلابی سرگرمیاں:

مولانا عبیداللہ سندھی پہلے سندھ گئے اور وہاں سے بلوچستان ہوتے ہوئے مقامی لوگوں کی مدد سے قندھار پہنچے۔ پھر انھیں کابل بھیجا گیا جہاں خفیہ طور پر ان کی باریابی امیر حبیب اللہ

خان کی خدمت میں ہوئی۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے انقلابی ہندوستانی جماعت سے رابطہ پیدا کیا۔ جنگ کے آغاز پر بہت سے ہندوستانی برلن گئے تھے، جہاں انھوں نے ہردیال کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف سرگرمیاں منظم کیں۔ برلن کے اس گروہ نے سوچا کہ افغانستان میں اس کی بھی نمایندگی ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ ہندوستان سے روابط قائم کر سکے۔ کابل میں اس گروہ کے رہنما راجہ مہندر پرتاب اور مولوی برکت اللہ (بھوپالی) تھے۔ موخرالذکر ہندوستانی غدر پارٹی کے ارکان تھے، جسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رہنے والے متعدد ہندوستانیوں نے منظم کیا تھا۔ وہ ٹوکیو میں اردو کے پروفیسر رہ چکے تھے اور ایک متشدد مخالف برطانیہ جریدے کے ایڈیٹر تھے۔ انھیں جاپانی حکام نے برخاست کر دیا اور ان کا اخبار (اسلامک فرٹیرنیٹی جو انگریزی، جاپانی اور اردو تین زبانوں میں بہ یک وقت شائع ہوتا تھا) بند کر دیا گیا۔ وہ ٹوکیو سے برلن گئے تھے اور وہاں سے انھیں کابل بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح راجہ مہندر پرتاب جنیوا گئے تھے جہاں وہ ہردیال سے ملے تھے۔ اس کے بعد وہ برلن گئے جہاں سے انھیں کابل روانہ کر دیا گیا۔ جرمن مشن اپنے ہندوستانی مشنے کے متعلق جس وہم کا شکار تھا اس کا ازالہ بہت جلد ہو گیا کیوں کہ ہندوستانیوں نے برعظیم کے اندر بغاوت برپا کرنے میں کامیابی کی بڑی امیدیں دلائی تھیں مگر انھوں نے دیکھا کہ نہ امیر افغانستان کے جنگ میں شریک ہونے کا امکان تھا اور نہ ہندوستان میں ہندوستانی کچھ کر سکتے تھے۔

ہندوستانی جماعت (راجہ بھوپالی) کے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی کی فریفتگی بھی دور ہو گئی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ راجا مہندر پرتاب ایک ہندو فرقہ پرست ہے اور پنڈت مدن موہن مالویہ سے اس کا ساز باز ہے جنھیں وہ افغانستان میں ترکی جرمن جدوجہد کے تمام راز بھیج دیتا ہے۔ انھوں نے یہی رائے پنجابی آریہ سماجی رہنما لالہ لاجپت رائے کے متعلق قائم کی۔ ان کی رائے برلن گروہ کے متعلق بھی یہ تھی کہ وہ ہندوستانی قوم پرستی کے پردے میں ہندو فرقہ پرستوں کی ایک جماعت ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ برعظیم پر کسی ترکی جرمن حملے کو ٹلائے اور اگر ایسا حملہ ناگزیر ہو جائے اور امیر افغانستان کی مدد سے کامیاب ہوتا معلوم ہو تو ہندو مفادات کے تحفظ کے لیے اس میں نیپال کے بھی اسی طرح شامل ہونے کا بندوبست کیا جائے۔ برکت اللہ

کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے۔ درحقیقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں صرف اس لیے شامل کر لیا گیا تھا کہ ایک ہندو تنظیم کو پوری طرح ہندوستانی تنظیم کے رنگ میں پیش کیا جائے۔

مولانا محمد میاں کی سرگرمیاں:

مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ مولانا محمد میاں انصاری بھی جا ملے، جو دیوبند میں ان کے رفیق کار رہ چکے تھے۔ انھوں نے مولانا محمود حسن کے ساتھ حجاز تک سفر کیا تھا اور وہاں سے انھیں ترکی جنرل غالب پاشا کی طرف سے ایک دعوت جہاد کے ساتھ ہندوستان واپس بھیجا گیا تھا۔ مولانا محمد میاں انصاری نے اس دعوت جہاد کے نسخے اپنے سفر کے دوران مختلف مقامات پر اور ہندوستان میں تقسیم کیے۔ جو لوگ شریک راز تھے وہ اس دستاویز کو ''غالب نامہ'' کہتے تھے۔ حکومت ہند کی سخت نگرانی کے باعث صرف چند نسخے تقسیم کیے جا سکے۔ مولانا محمد میاں انصاری کو گرفتار کرنے کے احکام جاری ہو چکے تھے مگر وہ قبائلی علاقے کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں انھوں نے کچھ عرصے لشکر مجاہدین میں قیام کیا اور اس کے بعد کابل چلے گئے۔

کابل کی عارضی حکومتِ ہند اور اس کے مشن:

کابل میں جو عارضی حکومت قائم کی گئی تھی اس کے صدر راجا مہندر پرتاب اور وزیر اعظم برکت اللہ تھے۔ جب اس میں مولانا عبید اللہ کو شامل کیا گیا تو انھیں وزیر (داخلہ) مقرر کیا گیا۔ جرمن مشن ۱۹۱۶ء کے آغاز میں واپس چلا گیا۔ عارضی حکومت نے ایک مشن روس بھیجا اور زار سے یہ درخواست کی کہ وہ برطانیہ عظمی سے اپنے اتحاد کو ختم کر دے اور ہندوستان پر حملہ کرے۔ یہ خط ایک طلائی تختی پر کندہ کیا گیا تھا۔ ترکی اور جاپان کو بھی مقصدی وفود بھیجے گئے۔ مولانا عبید اللہ نے ان وفود میں اپنے اعتماد کے نوجوانوں کو شامل کرنے پر اصرار کیا تا کہ اس کا اطمینان حاصل ہو سکے کہ مسلم نقطۂ نگاہ کی نمائندگی ضرور ہوگی اور مذاکرات کے دوران جو کچھ ظاہر ہوگا وہ ضرور ان کے علم میں آئے گا۔

ریشمی خطوط اور جنود ربانیہ کا قیام:

مولانا محمد میاں انصاری نے ایک خط مولانا محمود حسن کو لکھا جس میں تمام پیش آمدہ واقعات و حالات کی تفصیلات تھیں اور ''حزب اللہ'' کے نام سے (۷) ایک ایسی فوج کی تنظیم کے متعلق تجاویز بھی تھیں جس کا مرکز مدینہ میں اور مقامی مراکز قسطنطنیہ' تہران اور کابل میں رکھنے کا منصوبہ تھا۔ یہ ساری تنظیم مولانا محمود حسن کے ماتحت تھی۔ کابل کا مرکز مولانا عبید اللہ سندھی کے ماتحت ہونا تھا۔ ایک اور خط بھی مولانا محمد میاں انصاری کی طرف سے شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی (سندھ) کے نام تھا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ مولانا محمود حسن کے نام کا خط کسی معتمد حاجی کے ذریعے ان کے پاس بھجوا دیں اور اگر کوئی کافی معتمد شخص دستیاب نہ ہو تو اسے خود لے جائیں۔ یہ خطوط زرد ریشمی کپڑے پر بالکل صاف لکھے ہوئے تھے۔ اس لیے انھیں ''ریشمی خطوط'' کہا جانے لگا۔ یہ ریشمی کپڑا پیغام بر کی صدری اور اس کے استر کے درمیان سی دیا گیا تھا اور اسے بڑی احتیاط کے ساتھ ہدایات دے دی گئی تھیں۔

افشائے راز:

اس کا ظاہری مقصد سفر یہ تھا کہ جو طلبہ افغانستان گئے ہوئے تھے ان میں سے ایک طالب علم کے باپ کو اس کے بیٹے کی خیریت سے مطلع کر دے۔ وہ باپ سر مائیکل اوڈوائیر' لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کا دوست تھا۔ اس نے رازِ سر بستہ کا سراغ لگا لیا اور ان خطوط پر قبضہ کر کے انھیں [بہ واسطہ کمشنر ملتان ڈویژن] سر مائیکل کے حوالے کر دیا۔ اس پر متعدد گرفتاریاں کی گئیں۔ حکومت ہند نے افغانستان سے احتجاج کیا اور مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے دوستوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا محمد میاں انصاری پہلے ہی مجاہدین کے مرکز چلے گئے تھے۔ ریشمی خطوط کے لکھنے والے بین الاقوامی صورتِ حال سے پوری طرح واقف نہیں تھے کیوں کہ اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی شریف مکہ ترکوں کے خلاف بغاوت کر چکا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے رفقا کو جلال آباد منتقل کر دیا گیا۔ امیر حبیب اللہ خان قتل کر دیے گئے اور امان اللہ خان ان کے جانشین ہوئے۔ وہ برطانیہ کے اس قدر زیادہ حامی نہیں تھے اور انھوں نے

عبیداللہ سندھی کو کابل طلب کرلیا۔انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کردینے کا فیصلہ کیا گیا۔ انگریز افغان جنگ میں تھل کے مقام پر لاہور کے ایک طالب علم ظفر حسن نے قابل تعریف خدمات انجام دیں۔نومبر۱۹۲۲ء میں مولانا عبیداللہ سندھی سرحد پار کر کے سوویت یونین چلے گئے۔

حجاز میں مولانا محمود حسن کی سرگرمیاں:

اب ہم حجاز میں مولانا محمود حسن کی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔وہاں انھوں نے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی درخواست کی۔ان کے گذشتہ حالات کے متعلق تحقیقات کرنے کے بعد غالب پاشا نے انھیں راز دار بنالیا اور یہ مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں کام کریں مگر مولانا نے بتایا کہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی انھیں گرفتار کرلیا جائے گا۔غالب پاشا نے اس پر اصرار کیا کہ ہندوستان کے مسلمان بہ ذات خود کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں کرسکیں گے۔اس لیے انہیں ہندوؤں سے تعاون کرنا چاہیے۔ بالکل یہ وہی مشورہ تھا جو افغان ہم دردوں (حبیب اللہ خان) نے مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقا کو دیا تھا۔یہ مشورہ برعظیم کی مسلم قیادت تک پہنچا دیا گیا اور تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں پر اور دیوبندی مکتب فکر کے علما کی اکثریت پر ان کے بعد کی پوری سیاسی فکر میں اس کا زبردست اثر رونما ہوا۔(۸) مولانا محمود حسن قسطنطنیہ جا کر انور پاشا سے ملنا بھی چاہتے تھے جس کے لیے انتظامات کردیے گئے تھے مگر انور پاشا اور جمال پاشا خود مدینہ آئے اور مولانا محمود حسن کو ان سے خفیہ ملاقات کرنے اور اپنے منصوبوں پر بحث کرنے کا موقع مل سکا۔انھوں نے ہندوستانیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کسی طاقت کا انتداب یا سرپرستی کی شکل میں قبول کر کے اپنی مکمل آزادی کے سوال پر کوئی سمجھوتا نہ کریں۔وہ پر امید تھے کہ مستقبل قریب میں ایک امن کانفرنس بلائی جائے گی جس میں ترکی اور اس کے اتحادی ہندوستان کی آزادی کا سوال اٹھائیں گے۔مولانا محمود حسن نے درخواست کی کہ انھیں برعظیم کی سرحد پر لشکر مجاہدین میں پہنچانے کے انتظامات کردیے جائیں مگر بتایا گیا کہ چوں کہ ایران کے بعض حصوں پر اتحادیوں کا قبضہ ہے اس لیے اس ملک میں سے راہ داری کا انتظام ممکن نہیں ہے۔

انھوں نے مولانا محمود حسن سے وعدہ کیا کہ وہ ایک خط عربی اور فارسی میں انھیں بھیجیں گے جسے مقصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط موعودہ بہت جلد شام سے موصول ہو گئے جہاں وہ دونوں ترکی وزیر انور پاشا اور جمال پاشا مدینے سے گئے تھے۔ یہ خط ایک صندوق کی تہ میں ایک خلا کے اندر بڑی احتیاط سے چھپائے گئے تھے اور اس کے اوپر کچھ کپڑے ترتیب سے رکھ دیے گئے تھے۔ یہ صندوق مولانا محمود حسن کے بعض معتمد اشخاص کے ساتھ ہندوستان بھیج دیا گیا اور انھیں یہ ہدایت کی گئی کہ یہ خطوط ضلع مظفر نگر میں حاجی نور الحسن کے حوالے کیے جائیں جو دہلی کے فوٹو گرافر احمد مرزا سے ان کے فوٹو گراف نکلوا کر انھیں ان اشخاص میں تقسیم کرائیں گے جن کے نام ظاہر کیے گئے ہیں۔ یہ پورا مشن کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ اگرچہ ہندوستانی پولیس کو صحیح اطلاع کئی مرتبہ ملی مگر پوری طرح تحقیقات کرانے کے باوجود ان خطوں پر قبضہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔

شریف مکہ کی بغاوت:

یہ حکایت ایک دلچسپ جاسوسی افسانہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت تھی۔ اگرچہ اس تمام مہم کا خالص نتیجہ محض صفر تھا۔ کیوں کہ جنگ نے دول وسطیٰ کے خلاف رخ اختیار کر لیا اور یہ امر یقینی ہو گیا کہ ان کی شکست ناگزیر ہے۔ مولانا محمود حسن اپنے آیندہ لائحہ عمل پر گفتگو کرنے کی غرض سے غالب پاشا کی ملاقات کے لیے مدینہ سے طائف گئے۔ وہ ابھی وہیں تھے کہ شریف مکہ نے ترکی کے خلاف بغاوت کر دی اور طائف مدینہ سے منقطع ہو گیا۔

شیخ الہند اور ان کے رفقا کی گرفتاری:

چھ ہفتوں کے بعد مواصلات بحال ہوئے اور مولانا طائف سے مکہ آ سکے۔ یہاں شریف کے ایک عامل نے ان سے ایک بیان پر دستخط کرنے کے لیے کہا، جس میں ترکی کے خلاف اس کی بغاوت کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ ان کے انکار پر وہ اور ان کے رفقا گرفتار کر لیے گئے اور انھیں جدہ بھیج دیا گیا اور وہاں سے قاہرہ پہنچایا گیا تھا جہاں ایک برطانوی عہدے دار نے جو ہندوستان سے اسی خدمت کے لیے مامور کر کے بھیجا گیا تھا۔ ان پر سخت جرح کی۔ اس

کے بعد انھیں مالٹا لے جایا گیا اور وہاں جنگی قیدی کی حیثیت سے (تقریباً تین سال تک) رکھا گیا۔

افغانستان اور حجاز میں جو واقعات پیش آئے ان سے عوام کو اس وقت تک کوئی واقفیت نہیں ہوئی جب تک کہ ۱۹۱۸ء میں ''سڈیشن کمیٹی'' کی روداد شائع نہیں ہوئی۔ اس وقت تک جو کچھ وقتاً فوقتاً حکومت کے علم میں آتا رہا اسے بھی اخبارات میں جانے کی راہ نہیں ملی۔ کیوں کہ اسے شائع کرنا خلاف مصلحت ہوتا۔

رازداروں کی کمزوری:

ان مشکل مہمات پر جن لوگوں کو لگایا گیا تھا انھوں نے بہ حیثیت مجموعی رازوں کی پردہ داری اچھی طرح کی۔ صرف دو مستثنیات تھے۔ ایک وہ آدمی (عبدالحق) جسے ریشمی خطوط کی ترسیل کا کام سپرد کیا گیا تھا اور دوسرا (محمد مسعود) مولانا محمود حسن کا ایک رشتہ دار (بھانجا)۔ موخر الذکر کو ڈاکٹر انصاری نے اس لیے عرب بھیجا تھا کہ ایک ہزار روپیہ مولانا کو دینے تھے اور ان کے متعلق حکومت ہند کے عام رویے کا جو پتا چلانا تھا اس سے انھیں مطلع کرنا تھا۔ مولانا محمود حسن نے اس شخص کو انور پاشا اور جمال پاشا کے خط کے متعلق تفصیلات بتا کر راز دار بنالیا۔ کیوں کہ وہ لوگ جو اس صندوق کو لے گئے تھے بمبئی پر جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا یہ چاہتے تھے کہ ان اشخاص تک پیغام پہنچ جائے جنھیں اس خط کی نقول متعدد لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کرنے تھے۔ یہ رشتے دار پولیس کے ایک تجربہ کار عہدہ دار کی جرح میں اپنی ناتجربہ کاری کے باعث بول گیا اور سب کچھ اُگل دیا۔

علماء کا غیر معمولی کارنامہ:

دو علماء دین کے لیے جنھوں نے تعلیم گاہوں کی خانقاہی عزلت میں پرورش پائی ہو اور جو نہ صرف خفیہ تنظیموں کا بلکہ حسب معمول سیاسی سرگرمیوں کا بھی کوئی سابقہ تجربہ نہ رکھتے ہوں کسی بین الاقوامی نوعیت کی سازش میں جوڑ توڑ کرنا اور ایک وسیع پیمانے پر خفیہ کام کی تنظیم کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔'' (ایضاً: ص ۳۱۰-۲۹۹)

حواشی:

(۱) اختلافات ہوئے لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی کا کتنا حصہ ہے اور وہ ان اختلافات کے کس حد تک ذمہ دار تھے؟ حضرت گنگوہی محدث تھے، فقیہ تھے، مفتی تھے، مرشدِ راہ طریقت تھے، مصلح عواید و رسوم تھے۔ درس و تدریسِ حدیث و فقہ، افتاء و تعلیم و ارشاد ان کا شب و روز کا معمول تھا اور اسی کے لیے ان کی زندگی وقف تھی۔ اگر انھوں نے تعلیم و تلقین اور اصلاح و ارشاد اور تزکیہ و تہذیب کے لیے کسی طالب علم یا کسی مرید و مرشد سے کوئی بات کہی تھی یا شریعت کا کوئی مسئلہ بیان کیا تھا اور لوگ اسے لے اُڑے تھے اور کوچہ و بازار کی چیز بنا دیا تھا تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اختلاف و نزاع کا الزام ان کے سر تھوپ دیا جائے؟ کیا وہ سیرت و سنت اور حدیث نہ پڑھاتے، فقہ کے مسائل نہ بتاتے، فتویٰ نہ دیتے، تعلیم و ارشاد سے ہاتھ اٹھا لیتے؟ ان کا تو کام ہی یہ تھا یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ یہ باتیں ان کے فرایض میں شامل تھیں، وہ انھیں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ آیا انھوں نے اپنی مسند درس و تدریس حدیث و فقہ سے اٹھ کر، منصب افتاء و تعلیم و ارشاد کو ترک کر کے کوئی اختلافی مسئلہ چھیڑا تھا، کسی دوسرے مسلک و مکتب کے خلاف کوئی رسالہ لکھا تھا اور کسی معاصر یا متقدم کے خلاف کوئی مجلس اختلاف و نزاع سجائی تھی؟ اگر ایسا نہیں ہوا تھا اور فی الواقع یہ نہیں ہوا تو وہ اس کے ذمہ دار کیسے ہو سکتے تھے؟

ڈاکٹر صاحب نے آگے بھی یہ الزام بزرگانِ دیوبند اور بانیان دارالعلوم پر لگایا ہے۔ شاید وہاں بھی کچھ عرض کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

(۲) اگر معاملہ صرف دارالعلوم کے مفاد اور حکومت کی نظر بد سے اسے بچانے کا ہوتا تو اس سے کون انکار کر سکتا تھا؟ جو روش اختیار کی گئی تھی اس سے بہ آسانی بچا جا سکتا تھا۔ نہایت مناسب طریقہ یہ تھا کہ مہتمم، نائب مہتمم جو جمعیۃ الانصار کے صدر بھی تھے حضرت صدر المدرسین کو اعتماد میں لیتے اور وہ عبیداللہ سندھی کو بلا کر سمجھا دیتے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو اس حد تک بڑھائیں۔ کیا مولانا سندھی ان بزرگوں کی نصیحت کو ٹھکرا دیتے اور کیا اپنے استاد حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے روگردانی کر سکتے تھے؟ لیکن یہ حضرات تو حضرت شیخ الہند کو بھی اپنے راستے

کا کانٹا سمجھتے تھے چنانچہ حضرت نے مولانا محمد میاں انصاری کو ترجمہ قرآن اور تصنیف و تالیف کے کام میں مدد کے لیے جو رکھا تھا تو انھیں بھی حضرت کی اجازت بلکہ علم کے بغیر نکال دیا تھا اور اس تاک میں رہے کہ حضرت دیوبند سے باہر ہوں تو مولانا سندھی کے خلاف کارروائی کی جائے۔ چنانچہ جیسے ہی ایک موقع ہاتھ آیا کارروائی عمل میں لے آئی گئی اور نہ صرف دیوبند میں قدم رکھنے سے روک دیا گیا بلکہ یوپی اور دہلی سے نکال دیے جانے کی سفارش کی گئی۔ القاسم میں ان کے خلاف مضمون شائع کیا گیا۔ خود حضرت شیخ الہند کے خلاف سازشیں کی گئیں۔ ان بزرگوں کی اس جارحانہ روش نے ثابت کر دیا کہ معاملہ دارالعلوم کے مفاد سے زیادہ کسی خوشنودی کے حصول اور کسی کی نظروں میں مقام حاصل کرنے کا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے چند معاصر'' مولفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔

(۳) ڈاکٹر صاحب نے یہاں کوے کی حلت، تمام دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کے خلاف فتویٰ، امکان کذب، امتناع نظیر حضرت خاتم النبیین، مزارات پر عرس کے اجتماع، فاتحہ و میلاد کے مروجہ طریقوں کے مسائل میں بزرگان دیوبند کے فتوے اور رویے کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب یہ نہیں کہتے کہ ان کی رائے یا فتویٰ غلط تھا۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی اسی رائے کے تھے کہ خواہ دنیا کے جذبات کچھ ہوں لیکن اگر فتویٰ کتاب و سنت کی روشنی میں یا کسی مسلک فقہ کے مطابق پوچھا جائے تو مفتی کا فرض ہے کہ کتاب و سنت یا اسی دایرۂ عقاید یا اسی خاص مسلک کے مطابق دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب اور تمام مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ علی کل شی قدیر'' ہے اور اس کی قدرت کاملہ کے منافی ہے کہ وہ ''کچھ'' کرنے سے عاجز ہو۔ سلسلۂ نبوت اتمام کو پہنچا، دین مکمل ہو گیا۔ سنت الٰہیہ قائم ہو چکی۔ اس کا قیام و دوام ہی اس کی مشیت ہے اور یہ اس کی مشیت سے بعید ہے کہ وہ اپنی ٹھہرائی ہوئی سنت کے خلاف کرے لیکن اس کی ''قدرت'' اس سے ماوراء اور سب سے ماوراء ہے۔

یہ بات فکر و اعتقاد و عمل کے کسی ایک دایرے تک ہی محدود نہیں پورے عالم انسانیت، عالم حیوانات، عالم نباتات و جمادات اور کل کاینات ارض و سما پر محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل، نشو و نما، حیات و موت، لیل و نہار کی گردش، موسموں کا تغیر و تحول، شمس و قمر اور ثوابت و

سیارگان کے سیر و قیام کا ایک نظام ٹھہرادیا ہے۔ یہ اس کی غیر متبدل اور دائمی سنت ہے۔ وہ اس کے خلاف نہیں کرتا اور کرے گا بھی نہیں۔ یہی سنت اس کی مشیت ہے لیکن اگر کوئی محترم قاری یہ فرمائیں کہ وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی نفی کے مترادف اور ایک صحیح العقیدہ مسلمان کے ایمان کے خلاف ہے۔

حالات و واقعات کے مطابق اچھے کام ہوتے رہیں گے' خدمت دین' تبلیغ اسلام' اصلاح مسلمین و نوع انسانی کے نئے نئے پہلو اور نئے نئے میدان سامنے آئیں گے اور ان میں حصہ لے کر مسلمان سعادتِ دارین حاصل کریں گے لیکن اتمام نعمت الٰہی (دین) کے بعد ہمارا کوئی عمل اور ہمارا ٹھہرایا ہوا کوئی طریقہ دین کا حصہ نہیں بن سکتا اور اسلام کے نظامِ عقاید و عبادات میں اس کے کسی جز کی حیثیت سے کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔

خلاف اسلام اور کسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے لیے مضرت رساں اور نقصان دہ رسموں کے ڈاکٹر صاحب اور ہر معقول شخص اتنا ہی خلاف ہوگا جتنا کہ کوئی عالم دین، کوے کی اقسام کی شرائط کے ساتھ اس کی حلت و حرمت کا فقہ کی کتب میں ایک مسئلہ ضرور ہے لیکن یہ ہماری زندگی کا مسئلہ نہیں۔ جن علما نے کسی خاص قسم کے کوے کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے کوا کھایا انہوں نے بھی نہ ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اگر کسی نے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں یا کسی خاص فقہی مذہب کے مطابق مسئلہ پوچھا تھا اور بتانے والے نے انھیں شرایط کے دایرے میں بیان کردیا۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ کوا حلال ہے اور اس کا کھانا شرائط ایمان میں سے ہے۔ نہ انھوں نے اس کے لزوم طعام کے لیے کوئی تحریک چلائی۔ یہ جواب بھی تذکرۃ الرشید کی چھ سات سطروں سے زیادہ طویل نہیں۔ اس تذکرے سے اگر ڈاکٹر صاحب کا یہ مقصد ہو کہ یہ جواب دیا ہی نہیں جانا چاہیے تھا اور یہ توقع حضرت گنگوہی سے تھی تو یہ شکوہ مستفسر اور مستفتی سے کیوں نہ کیا جائے کہ اس نے ایسا سوال ہی کیوں پوچھا تھا کہ جو سوسائٹی کا مسئلہ ہی نہ تھا اس کی وجہ سے دین و دنیا کا کون سا کام اٹکا ہوا تھا؟ محض سفر ہو جب کہ مستفتی کے جواب میں خاموشی خلافِ اخلاق ہو' اعراض معیوب' انکار دلیل عجز ہو اور نص کتاب و سنت کے خلاف جواب دینا معصیت۔ یہ مسئلہ ان بزرگوں نے نہ اٹھایا تھا اور نہ اس پر بحث و مناظرہ کیا تھا۔ استفتاء کا

ضروری حد تک جواب دیا تھا اور یہ ان کا شرعی فرض تھا۔

وہ تمام اعمال جو آیہء تکمیل دین اور خیر القرون عہد نبوی کے بعد احداث ہوئے اور نص کتاب وسنت میں ان کے عمل و ترک کا کوئی حکم موجود نہیں' بدعت ہیں اور بدعت جلی و خفی اور درجات کے کم وبیش کے باوجود ضلالت ہے اور ضلالت میں حسنہ وسیہ کی کوئی تقسیم نہیں۔ اس میں ساری دنیا کے مسلمان مبتلا ہو جائیں تب بھی ''بدعت'' ضلالت ہی رہے گی۔ حق اور صواب نہیں بن جائے گی۔ معیار حق کتاب وسنت ہے نہ کہ عوام کا تعامل اور ان کی پسند' ناپسند یا کسی عالم دین کا فتویٰ۔ ان بزرگوں نے عرس و میلاد کے اجتماعات اور مروجہ فاتحہ و نیاز کو تواریخ وایام متعینہ اور شرایط خاص کے لزوم اور خلاف شریعت اعمال کے بغیر موجب خیر و برکت لکھا ہے اور ایصال ثواب کے تو وہ قایل ہیں اور اس پر ان کا عمل ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے حضرت حاجی صاحب امداد اللہ علیہ الرحمہ کے فیصلہ ہفت مسائل کے اختصار و جامعیت' زبان کی صحت' اسلوب کی شائستگی' جواب کی قاطعیت' مصنف کے مزاج کی نرمی' رویے کے اعتدال و شرافت پر غور نہیں فرمایا۔ یہی تمام خوبیاں مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاویٰ کی ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان پر سرسری نظر بھی ڈال لیتے تو ناممکن تھا کہ وہ ان کے دلایل کی محکمی' تحریر کی معقولیت' اسلوب کی شایستگی اور ان کے رویے کے اعتدال سے متاثر نہ ہوتے' لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان کے فتوے کے جواب میں ایک بے نام ناقد کا حوالہ دیا ہے لیکن اس تحریر کی صحت و ثواب اور اس کی زبان و اسلوب بیان کی شرافت و معقولیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا البتہ اس بے نام شخص کی تنقید کے جواب میں مولانا خلیل احمد کے جواب الجواب کو ''غیر ضروری طور پر سخت ناپسندیدہ زبان میں'' قرار دیا ہے۔ اگر چہ اس مقام پر کلام کی بہت گنجایش ہے لیکن اس سے صرف نظر کرتے ہیں اور یہ عرض کرتے ہیں کہ سب سے پہلے تو ڈاکٹر صاحب کو جواب الجواب کتاب وسنت کے خلاف اور غلط ثابت کرنا چاہیے تھا۔ اگر ایک بات لوگوں کے ذوق و مزاج اور عادت کے خلاف ہے تو خواہ وہ کتاب وسنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اس کے ترک کی دعوت انھیں گراں تو گزرے گی لوگوں کی پسند اور ان کی عادت کو معیار تو نہیں بنالیا جا سکتا۔ ہم یہاں غیر ضروری' بے موقع' ناپسندیدہ' اشتعال انگیز' تمسخر آمیز

اور مذموم اور شرم ناک انداز بیان کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ تحریر ڈاکٹر صاحب کے بزرگ اور انھی کے مکتب فکر کے بانی سر سید احمد کی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳ و بشر الذین آمنوا و عملوا الصلحت ان لهم جنت...... هم فيها خلدون ‘‘ کی تفسیر میں جنت کی تشریح و تعارف میں فرماتے ہیں:

’’یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے۔ اس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں‘ باغ میں سرسبز و شاداب درخت ہیں۔ دودھ و شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے۔ ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت‘ چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں‘ شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ‘ ایسا بے ہودہ پن ہے‘ جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔‘‘ (تفسیر القرآن جلد اول: لاہور‘ مطبع گلزار محمدی‘ ۱۸۹۱ء‘ ص ۴۴)

کوئی آئے اور تفسیر کے مقدس فن کی اس تحریر کے مطالب کی صحت‘ زبان کی متانت‘ بیان کی معقولیت‘ مفسر کے لہجے کی شرافت ثابت کر دے اور ڈاکٹر صاحب نے اخلاق و تعلیم و تہذیب‘ تاریخ و سیاست میں ہزاروں صفحے جو سیاہ کیے ہیں ایک سطر ہی ان کے قلم سے اس تفسیر کی معقولیت یا غیر معقولیت میں دکھلا دے۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب بعض علمائے حق کے رویے کو اس بنا پر نشانۂ تنقید بناتے ہیں کہ وہ بعض اہل دنیا کے نزدیک پسند نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اپنے پیر و مرشد کی تحریر کی تہذیب و شرافت ہی کو ثابت کر دیتے۔

مفتی کا کام صرف فتویٰ دینا ہوتا ہے۔ وہ اس پر عمل کرانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ مستفتی ایک فتویٰ پوچھتا ہے۔ مفتی اسے شریعت کا حکم بتا دیتا ہے۔ مستفتی اس پر عمل کرے نہ کرے‘

مفتی کو اس سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس مفسر صرف بیان کر دینے کے بعد بے نیاز نہیں ہو جا سکتا۔ تفسیر بیان کر دینے پر اس کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ مفسر بیان کردہ احکام و مسائل پر عمل کا داعی اور محرک بھی ہوتا ہے۔ وہ تفسیر اسی لیے لکھتا ہے۔ اگر یہ مقصد اور مطلوب نہ ہو تو تفسیر کی تالیف و اشاعت کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۴) ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہاں بھی وہی طرزِ فکر اختیار کیا ہے کہ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے بعض شرعی فیصلے کچھ مقامی لوگوں کو پسند نہیں تھے۔ حضرات شہیدین نے اسلامی حکومت کے قیام کا عزم کیا تھا گویا انھیں عوام سے پوچھ پوچھ کر ان کے جذبات کی روشنی میں فیصلے کرنا لازم تھے اور چوں کہ اسلام کا یہ بنیادی رکن انھوں نے نظر انداز کر دیا تھا اس لیے جو کچھ علاقے کی مقامی آبادی نے دشمنوں کی سازش اور انگیخت پر کیا' وہ صحیح تھا۔ یا للعجب!

(۵) ڈاکٹر صاحب نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ظہور کے واقعے کا ذکر اسی طرح فرمایا ہے جیسے یہ بھی کسی دیو بندی بزرگ کی غلطی کا نتیجہ تھا۔ اعلیٰ حضرت کی عمر تقریباً دس برس کی تھی تو دارالعلوم دیو بند قائم ہوا تھا۔ وہ درحقیقت دارالعلوم کے بانیوں کے نہیں' ان کے شاگردوں اور خردوں کے معاصر تھے۔ اس لیے ان کی ولادت وظہور کو بانیوں کے افعال کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ان کا تعلق اور سابقہ اپنے معاصرین سے رہا تھا اور ناممکن تھا کہ ان کے منفی یا مثبت اثرات انھوں نے قبول نہ کیے ہوں۔ پچیس تیس برس کے بعد کی تحریرات میں ان اثرات کا پتا چلتا ہے۔ ان کے ذہن پر یہ اثرات کب اور کیسے مرتب ہوئے ہمارا یہ مسئلہ نہیں۔ ہمیں اس سے غرض ہے کہ وہ اثرات کیا تھے۔ ان کے اثرات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک نہ صرف دیو بندی' تھانوی وغیرہ کافر تھے بلکہ وہ بھی جو اعلیٰ حضرت کے فتوے کی صحت میں شبہ کریں اور دیو بندیوں اور تھانویوں کا کافر نہ سمجھیں دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی بہ ایں سبب کہ پیر مےخانۂ علی گڑھ کے پیرو ہیں۔ ان کے نزدیک کافر ہی مرے۔ الا یہ کہ انھوں نے سرسید کے عقاید سے توبہ کر لی ہو اور دیو بندیوں کے کفر پر بالاعلان ایمان لائے ہوں۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کے مقابلے میں کسی دیو بندی' تھانوی عالم نے ان کے فتاویٰ تحقیقات کے رد میں خواہ کچھ ہی لکھا ہو

ان کے کفر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا کسی نے فتویٰ نہیں دیا۔ کیا دیوبندیوں کے اعتدال وتوازن اور شرافت کے ثبوت کے طور پر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ بات کافی اور لائق تحسین نہیں؟

اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب دیوبندی عالم کی احکام الٰہی اور شریعت حق کے بیان میں صاف گوئی اور اصابت کو غیر ضروری طور پر سخت ناپسندیدہ زبان قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہی طرزِ فکر ہے تو ہم اپنی قسمت پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟

(۶) مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے نیازمندی کا تعلق ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ ان کے دامن کو حریفانہ کھینچا جائے۔ اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آ رہی ہے۔ ایک شیر اور آدمی میں دوستی ہوگئی۔ ایک روز ایک دیوار کے پاس سے دونوں گزر رہے تھے۔ دیکھا دیوار پر ایک تصویر میں آدمی شیر کا گلا گھونٹ رہا ہے اور شیر بے بس ہے۔ آدمی نے اپنے دوست شیر سے پوچھا دیکھا آپ نے؟ شیر نے جواب دیا ہاں! برش آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ میں بھی اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ قلم ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے چند ادارے تھے جو تاریخ کے شدید بحرانی دور میں حالات اور وقت کے ناگزیر تقاضوں اور مسلمانوں کی اہم ضرورتوں کے تحت قائم ہوئے تھے۔

۱- دارالعلوم دیوبند اور اس مسلک کے دوسرے ادارے —— قدیم تعلیم کے مراکز

۲- مدرسۃ العلوم علی گڑھ (کالج بعدہ یونیورسٹی) —— جدید تعلیم کا مرکز

۳- دارالعلوم ندوۃ العلماء جسے دردمندانِ قوم نے قدیم وجدید کی خلیج پاٹنے اور تعلیم و تربیت کے بہترین سانچوں میں ڈھلی ہوئی بلند اخلاق، اعلیٰ افکار، روشن خیال اور پختہ سیرت کی نئی نسل تیار کرنے کے لیے قائم کیا تھا اسے گویا دیوبند اور علی گڑھ کی تعلیم کے بہترین نتائج کا مجمع البحرین ہونا تھا۔

۴- جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور اس قسم کے دوسرے ادارے جو ۲۱-۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے نتیجے میں ترک موالات کے پروگرام کے تحت آزاد قومی نظام تعلیم کے مراکز کے طور پر قائم کیے گئے تھے اور کہیں کہیں اب بھی یہ تاریخی قومی یادگاریں باقی ہیں۔

ان میں سے دارالعلوم دیوبند اور اس کے برادر اداروں سے ڈاکٹر صاحب کی دوری' بے تعلقی اور مایوسی کا حال معلوم ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی پیداوار اور اس کے نتائج سے اپنی بےزاری اور برأت کا اظہار بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی اسی تالیف (علماء — میدانِ سیاست میں) کر دیا ہے اور چوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے علی گڑھ کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور اس کی حریف بن گئی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب اس سے بھی ناراض ہیں۔ اب لے دے کے علی گڑھ کالج رہ جاتا ہے اس کے بارے میں خاکسار نے محترم ضیاء الدین لاہوری کے مجموعہ مقالات نقش سرسید پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کالج کی تعلیم و تربیت کے ثمرات و نتائج پر جو کچھ لکھا تھا آپ بھی اس پر ایک نظر ڈال لیں اور فیصلہ کریں کہ رہ کیا جاتا ہے جس کی یاد کا جشن منایا جائے؟ خاکسار نے لکھا تھا:

''سرسید کی شخصیت صرف فراز کی شخصیت نہ تھی' وہ زندگی اور سیرت کے نشیب سے بھی آشنا ہوئی تھی۔ انھوں نے قومی اصلاح و ترقی کے بڑے بڑے کام انجام دیے تھے' بلکہ ادب' تاریخ' صحافت وغیرہ میں بعض اولیات ان سے منسوب ہیں۔ لیکن مذہب و سیاست میں ان کے خیالات' افکار اور اقدامات نے مسلمانوں میں پستی' بے اعتمادی اور بے دینی پیدا کی۔ تعلیم میں ان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہ تھا اور نہ اس کا کوئی متوقع نتیجہ نکلا۔ شبلی و ابوالکلام تو دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے نتائج سے حالی بھی مطمئن نہ تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا شاہکار ان کا بیٹا وقت کا سب سے بڑا شرابی تھا۔ جس نے اپنے باپ کو بڑھاپے میں گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ پھر کبھی اپنے گھر میں آنا انھیں نصیب نہ ہوا۔ پرانی تعلیم و تہذیب کے پروردہ ایک دوست نے اپنے گھر کا دروازہ ان پر کھولا اور پھر اس کے صحن سے سرسید کا جنازہ ہی نکلا۔ مذہب میں آزاد خیالی اور ذوقِ تجدد و توسع کو اتنا دخیل کیا کہ پورا نظامِ عقاید و عبادات تہ و بالا ہو گیا۔ سیاست میں ان مرحوم نے وہ سبق

دیا کہ مسلمان ملکی اور قومی دھارے سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ انگریزی حکومت پر اس اعتماد کی تعلیم دی کہ تحریک آزادی کے انتہائی عروج کے دور میں بھی مسلمانوں کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا تھا۔ ان مرحوم کو زور شور کے ساتھ پاکستان کے مفکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حال آں کہ حقیقت یہ ہے کہ اگر برصغیر کی سیاسی تحریک کو انھیں کے افکار کی روشنی میں چلایا جاتا تو نہ ہندوستان آزاد ہوتا نہ پاکستان ہی کا وجود نقش پذیر ہو سکتا تھا۔ جو دل کی گہرائیوں سے انگریزوں کی حکومت کے دائمی وابدی ہونے کی دعا کرتا ہو، مسلمانوں کے لیے اسے خدا کی سب سے بڑی رحمت گردانتا ہو۔ ان کے افکار میں ہندوستان کی آزادی یا پاکستان کے تصور کی بھلا کہاں گنجایش نکل سکتی تھی۔ سرسید کی شخصیت اور ان کی سیرت وخدمات کا کچھ اس طرح ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا مسلمانوں کے ذہنوں پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔''
(نقش سرسید: ضیاء الدین لاہوری، کراچی، مکتبہ رشیدیہ ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۱)

(۷) صحیح نام ''جنود ربانیہ'' یا ''لشکر نجات'' ہے اور انگریزی میں ''مسلم سالویشن آرمی'' نام رکھا تھا۔

(۸) اولاً مسلمانوں کے سامنے یہی مقصد رہا تھا کہ وہ تنہا اپنی قوت بازو سے ملک کو آزاد کرا دیں گے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تک اس اندازِ فکر کا پتا چلتا ہے لیکن بعد میں ان کے غور وفکر نے ثابت کر دیا کہ ملک کی آزادی حاصل کرنا اور انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنا تنہا مسلمانوں کے بس کی بات نہیں رہی۔ اس لیے سب کا رویہ بدلا اور سب نے برادرانِ وطن سے اشتراک و تعاون کی راہیں استوار کیں۔ جماعتوں کے طریقہ کار میں بھی یہ بات شامل کی گئی۔ حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، اقبال، محمد علی جناح، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد سب کا یہی مسلک تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبیداللہ سندھی کا رویہ غالب پاشا اور امیر حبیب

اللہ خان کے مشوروں سے نہ بدلا تھا لیکن ان کے مشوروں سے خیال ضرور پختہ ہو گیا تھا۔
حضرت شیخ الہند کے تعلقات ہندو انقلابیوں سے سفر حجاز سے پہلے سے تھے۔ خود ڈاکٹر صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ دیوبند میں ہندو انقلابیوں کو ٹھہرانے کے لیے حضرت نے ایک الگ مکان لے رکھا تھا یہ کوئی عام مہمان خانہ نہ تھا بلکہ سیاسی ملاقاتوں اور صلاح و مشورے کے لیے ایک خفیہ جگہ تھی۔

بانی پاکستان محمد علی جناح تو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے اور آزادی کی جدوجہد میں دونوں قوموں کے اشتراک واتحاد کی جدوجہد کے نظریے میں بہت پر جوش تھے اور اس دور میں بھی جب کہ وہ ملک کی سیاست میں ہندو مسلم اختلاف ومنافرت کی علامت بن گئے تھے اور تقسیم ملک ہی کو ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا واحد حل سمجھتے تھے اتحاد کی ضرورت اور اہمیت کے منکر نہ تھے۔ مشترکہ جدوجہد کے نظریے میں دیوبندی مکتبہء فکر کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے نظریے اور اس کے تقاضوں کا لحاظ کرنے میں سب سے زیادہ صادق و مخلص تھے۔ جب انھوں نے سوچ سمجھ کر ایک نظریہ قائم کرلیا اور اسے اپنا سیاسی مسلک بنالیا تو منافقت کی آلودگی سے اسے بہ ہر طور بچائے رکھا۔

اقبال شیدائی

ہندوستان کی جلاوطن حکومت اور ایک خفیہ معاہدہ

۱۹۳۳ء میں سیال کوٹ کے محمد اقبال نامی ایک نوجوان نے جو بعد میں ''اقبال شیدائی'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ قومی اور ملی خدمت کے میدان میں قدم رکھا تھا اور ۱۹۷۳ء میں اپنی وفات تک تقریباً ساٹھ برس نہایت جوش اور سرگرمی کے ساتھ ملک میں اور ملک سے باہر افغانستان، روس، ترکی، اٹلی، جرمنی فرانس وغیرہ میں خفیہ کاموں میں مصروف رہے۔ اقبال شیدائی نے خدام کعبہ، نظمِ جماعت، حمایت اسلام، خلافت، ہجرت، استقلالِ افغانستان، تعمیر واستحکام ترکی، پاکستان اور کئی اسلامی ممالک کے حفظ و دفاع اور مسلمانانِ عالم کی خدمات انجام دیں۔ ان کی زندگی دلچسپ واقعات اور ایڈونچرز سے بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے ۷۳-۱۹۶۹ء میں ایک روزنامے میں ''انقلابی کی سرگزشت'' کے عنوان سے اپنی آپ بیتی لکھی تھی۔ خاکسار نے یہ آپ بیتی جمع کرلی تھی اور اب اسے مدوّن کردیا ہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں ''کابل میں ہندوستان کی عارضی حکومت'' پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں چوں کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک مایہ ناز فرزند مولانا عبیداللہ سندھی اور پنجاب کے دوسرے انقلابی نوجوانوں کا خاص حصہ تھا۔ اس لیے اس کا یہ باب اس کتاب میں شامل کرلیا ہے۔ اس سے تالیف (سرگذشت) کی تاریخی اہمیت، مطالب کی دل چسپی اور تدوین کی نوعیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے (ا-س-ش)۔

جرمن ترک مشن:

''اس داستان کا آغاز پہلی جنگ عظیم سے ہوتا ہے۔

جرمنی اور ترکیہ نے جو جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف تھے' اپنا ایک مشترکہ وفد افغانستان بھیجا جس کے قائد نامور جرمن مدبر ''ڈاکٹر فان ہیٹنگ تھے (ڈاکٹر ہیٹنگ انڈونیشیا میں بھی جرمنی کے سفیر رہ چکے تھے) اس وفد میں ڈاکٹر موصوف کے علاوہ دو ہندوستانی انقلابی مولوی برکت اللہ بھوپالی اور راجہ مہندر پرتاب (آف ہاتھرس)، ایک آسٹروی کیپٹن نیڈر مائر اور ایک ترک کاظم بے بھی شامل تھے۔ اگرچہ اس وفد میں اور حضرات بھی شامل تھے لیکن ان کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ وفد کے ارکان ایران کے راستے ۱۹۱۵ء کے موسم خزاں میں کابل پہنچے (۱)۔ روسیوں کو بھی اس وفد کے پروگرام کی اطلاع مل چکی تھی۔ چناں چہ انھوں نے روس کیولری کے کرنل رنز کو ایران ہی میں وفد کے تمام ارکان کو گرفتار کر کے اغوا کرنے پر مامور کیا۔ لیکن وفد کے ارکان کرنل رنز کو غچا دے کر کابل پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں کرنل سے میری کابل میں ملاقات ہوئی۔ ان دنوں یہ روسی سفارت خانے کے عملہ میں اہم خدمات انجام دے رہا تھا۔ اسے فارسی زباں پر عبور حاصل تھا۔ اس نے مجھے خود بتایا کہ وہ ڈاکٹر فان ہیٹنگ کے وفد پر قابو پانے میں ناکام رہا۔

ڈاکٹر موصوف کے وفد نے کابل میں شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان سے ملاقات کی اور انھیں ترغیب دی کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر دیں۔ امیر حبیب اللہ خان نے وفد کو جواب دیا کہ ترکیہ اور جرمن ہم سے بہت دور ہیں۔ جب کہ روس اور انگریز دونوں افغانستان کی سرحدوں کے ساتھ ہی واقع ہیں۔ ان حالات میں ہم (افغانستان) ہندوستان پر حملہ کرنے کی ''عیاشی'' نہیں کر سکتے۔ اس طرح ڈاکٹر فان ہیٹنگ کا ''عشق'' ناکام رہا۔

ہندوستان کی جلاوطن حکومت:

اب اس وفد کے ہندوستانی ارکان نے کابل میں موجودہ ہندوستانی انقلابیوں سے تبادلہء خیال کے بعد ہندوستان کی جلاوطن حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس حکومت کے

صدر راجہ مہندر پرتاب اور وزیرِ اعظم مولوی برکت اللہ قرار پائے۔ کابینہ کے دوسرے ارکان میں مولانا عبیداللہ سندھی (وزیر داخلہ)، مولوی محمد بشیر (وزیر جنگ)، ڈاکٹر رحمت علی (وزیر مواصلات)، مسٹر پلائی (وزیر خارجہ) کی حیثیت سے شامل تھے (۲)۔ مسٹر پلائی برلن ہی میں مقیم تھے اور انھیں نازیوں نے اس طرح زدوکوب کیا کہ یہ زخموں کی تاب نہ لا کر ہسپتال میں فوت ہو گئے۔ مولوی بشیر صاحب کا اصلی نام مولوی عبدالرحیم تھا اور یہ مجاہدین کے ہیڈ کوارٹر واقع چمرقند کے رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ مولوی محمد علی قصوری پہلے وزیر خارجہ تھے۔ انھیں برطرف کر دیا گیا تھا۔ کیوں کہ یہ بعد میں برطانیہ سے مل گئے تھے۔ (۳)

ایک خفیہ معاہدہ:

اس عبوری حکومت نے افغان قوم پرستوں کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کیا۔ قوم پرستوں کی قیادت امیر حبیب اللہ خان کے چھوٹے بھائی سردار نصر اللہ خان کر رہے تھے اور ان میں دوسروں کے علاوہ محمود بیگ طرزی اور جنرل نادر خاں بھی شامل تھے۔ امیر حبیب اللہ کو اس معاہدے کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔ اس خفیہ معاہدے کے تحت جلاوطن حکومت (مہندر پرتاب، عبیداللہ سندھی اور مولوی برکت اللہ) نے افغان قوم پرستوں سے معاہدہ کیا کہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع تمام علاقہ افغانستان میں شامل کر دیا جائے اور دہلی کے تخت پر کوئی افغان شہزادہ حکمران ہوگا۔ (یہ بادشاہت دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر آگرہ تک کے علاقے پر مشتمل ہوگی اور اس میں یوپی کے چند اضلاع بھی شامل ہوں گے) یوپی کا کچھ علاقہ نیپال کے حوالے کر دیا جائے گا۔ جب کہ افغان قوم پرستوں نے وعدہ کیا کہ ہندوستانی انقلابیوں کو نقد رقم سے اور اگر ممکن ہوا تو اسلحہ سے بھی مدد دی جائے گی۔

اس ناپاک معاہدے پر دستخط کرنے والوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ البتہ مہندر پرتاب شاید بقید حیات ہیں (۴)۔ مولوی برکت اللہ کا کیلی فورنیا میں ۱۹۲۶ء میں انتقال ہو گیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۱۹۴۴ء میں ہندوستان ہی میں فوت ہو گئے۔ محمود بیگ طرزی نے استنبول میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ جنرل نادر خان ۱۹۳۲ء میں قتل کر دیے گئے (۵) اور یہی حال سردار نصر اللہ خان کا ہوا۔ میری اطلاعات کے مطابق ڈاکٹر رحمت علی اور مسٹر پلائی بھی اس معاہدے

کے دستخط کنندگان میں شامل تھے۔ افغان قوم پرستوں نے اس معاہدے کو بہت زیادہ اہمیت دی اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ دریاے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع تمام علاقے بہ شمول صوبہ سرحد، بلوچستان، آزاد قبائلی سرزمین اور سندھ افغانستان کی ملکیت ہیں۔

میں نے افغان قوم پرستوں کو صاف صاف کہہ دیا کہ ہندوستانی قوم پرستوں کے نزدیک اس معاہدے کی رتی بھر بھی اہمیت نہیں اور پھر امان اللہ خان سے ملاقات کے دوران بھی میں نے یہ بات ان پر واضح کر دی۔ میں نے امان اللہ خان سے یہ بھی کہا کہ اگر افغانستان نے جدوجہد آزادی میں ہماری مدد کی تو ہم کامیاب ہونے کے بعد افغانستان کو کروڑ ہا روپے کی امداد دیں گے۔

اگرچہ اس معاہدے کے متعلق تھوڑی سی بھنک مجھے ہندوستان ہی میں مل گئی تھی لیکن کابل آنے کے بعد مجھے اس کی تفصیل کا علم ہوا اور یہ سب کچھ مجھے خود مولانا برکت اللہ، مولانا عبیداللہ سندھی، مولوی محمد بشیر، ڈاکٹر رحمت علی نے بتایا۔ چوں کہ مجھے بھی کابل میں قائم شدہ جلاوطن ہندوستانی حکومت میں دو وزارتوں (جنگ اور مواصلات) کا نائب وزیر مقرر کیا گیا تھا (۶)۔ اس لیے اس ناپاک معاہدے کی تمام تفصیلات اور پس منظر سے آگاہی ہوئی۔

جب حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد امان اللہ خان تخت نشین ہوئے تو انھوں نے راجہ مہندر پرتاب کو چالیس ہزار روپے بہ طور سفر خرچ دیے تاکہ وہ نیپال جائیں اور نیپال کے بادشاہ کو یہ پیش کش کریں کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر دیں اور کامیابی کی صورت میں معاہدے کے مطابق یو پی کے چند اضلاع نیپالی مملکت میں شامل کر دیے جائیں۔ راجہ مہندر پرتاب کو نیپال جانے کے لیے چینی ترکستان سے گزرنا تھا لیکن چینی حکومت نے انھیں گزرنے کی اجازت نہیں دی۔ چند ماہ کے بعد انھیں چین افغان سرحد پر پکڑ لیا گیا۔ یہاں سے وہ تاشقند چلے گئے اور وہاں سے ایک قاصد کی معرفت مولانا عبیداللہ کے نام ایک خط بھیجا (۷)، جس میں اپنے مشن کی ناکامی کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ (۸)

نیپال مشن کی ناکامی:

تاشقند سے راجہ صاحب سائبیریا کے راستے چین چلے گئے۔ کئی سال تک لوگوں کو ان کی

کوئی خبر نہ ملی۔ چین سے یہ امریکہ چلے گئے جہاں ہندوستانی غدر پارٹی نے انھیں نیپال لانے کے لیے مالی امداد دی۔ ان کے ہم راہ غدر پارٹی کے چھ ارکان بھی تھے لیکن وہ انھیں نانکنگ سے آگے نہیں لے گئے اور انھیں یہ کہہ کر چھوڑ گئے کہ ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ وہ ان کے سفر کے اخراجات پورے کرسکیں۔ یہ کہانی مجھے کامریڈ رتن سنگھ عرف ایشر سنگھ عرف مٹھا سنگھ عرف لابو سنگھ نے سنائی۔ وہ غدر پارٹی کے اہم رہنماؤں میں شامل تھے۔ ان کا اٹلی کے ہسپتال میں ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوگیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ راجہ صاحب کو غدر پارٹی نے بیس ہزار ڈالر دیے تھے۔

نیپال کے مشن میں ناکامی کے بعد راجہ مہندر پرتاب نے ''عالمی فیڈریشن'' کے نام سے ایک نئی تحریک شروع کی جس کا عارضی مرکز نانکنگ تھا۔ (۹)

شیدائی اور مولانا سندھی کے مابین چشمک:

کابل میں مولانا عبیداللہ سندھی نام نہاد ''ہندوستانی حکومت'' چلاتے رہے اور ''خفیہ معاہدے پر عمل پیرا رہنے کے عزم کا اظہار کرتے رہے۔ جب میں نے شاہ امان اللہ خان سے کھلی کھلی باتیں کہیں تو مولانا نے اس کا سخت برا منایا لیکن وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ کیوں کہ افغان قوم پرستوں کو معلوم تھا کہ مجھے تقدس مآب جناب (مولانا) ابوالکلام آزاد نے کابل بھیجا ہے۔ جو اس عہد کے (بڑے) رہنما تھے۔ (۱۰)

مولانا عبیداللہ کو معلوم تھا کہ مجھے کابل کس نے بھیجا ہے۔ اس لیے وہ میرے بھی مخالف ہوگئے۔ مولانا عبیداللہ کو وہم تھا کہ میں خود کو کابل میں ہندوستان کا نمائندہ سمجھتا ہوں اور اس لیے میں ان کا حریف ہوں۔ حال آں کہ میں نے انھیں کئی بار کہا کہ میں خود کو ایسا نہیں سمجھتا، لیکن مولانا نے میری اس بات پر یقین نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ افغان حکومت کے ایک عہدہ دار عبدالہاری خان نے مجھے ایک خط لکھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ''افغان حکومت آپ کو مولانا (ابوالکلام آزاد) کی جماعت ''حزب اللہ'' یا ہندوستان کا نمائندہ مقیم کابل تسلیم کرنے پر بالکل تیار ہے۔''

مجھ سے یہ غلطی ہوگئی کہ مولانا عبیداللہ سندھی کو یہ خط دکھلا دیا۔

یہ ہے وہ طویل پس منظر جس نے اس دور میں اور اب (۱۹۶۹ء میں) بھی افغان حکومت کو شدید ذہنی اور نفسیاتی بحران میں مبتلا رکھا ہے اور اس کا اظہار ''پختونستان'' کے اسٹنٹ سے ہوتا ہے۔

حواشی:

(۱) مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ وہ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے تھے اور مشن ان سے ایک ہفتہ پہلے کابل پہنچ چکا تھا۔ (کابل میں سات سال: لاہور، سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۵۵ء، صفحہ ۲۶ و ۴۳)۔ اس حساب سے مشن ۸/ اکتوبر کو کابل پہنچا ہوگا۔ اگر ایک ہفتے کی یہ مدت تخمینی ہو تو اس میں ایک دو روز کا اضافہ ممکن ہے۔ اس میں بہ ہر حال کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے کہ ترک جرمن مشن اکتوبر ۱۹۱۵ء کے پہلے ہفتے میں کابل پہنچ چکا تھا۔

(۲) مختلف مآخذ سے استفادے کے بعد ہندوستان کی جلاوطن عارضی حکومت (حکومت موقتہ ہند) کے مندرجہ ذیل اراکین کا پتا چلا ہے:

۱-	راجہ مہندر پرتاب	صدر تاحیات
۲-	مولانا برکت اللہ بھوپالی	وزیراعظم
۳-	مولانا عبیداللہ سندھی	وزیر داخلہ/ نائب صدر
۴-	قاضی عبدالولی خان	نائب صدر (جنگ افغان برٹش انڈیا کے بعد ۱۹۱۹ء)
۵-	مولوی محمد علی قصوری	وزیر خارجہ
۶-	ڈاکٹر رحمت علی (زکریا)	وزیر مواصلات
۷-	مولوی عبدالرحیم عرف بلا بشیر	وزیر جنگ/ دفاع
۸-	جام پاکرامن پلائی	وزیر خارجہ (مولوی محمد علی کے بعد)
۹-	اے عزیز (عبدالعزیز)	نائب وزیر داخلہ
۱۰-	محمد علی (خوشی محمد)	نائب وزیر داخلہ
۱۱-	اقبال شیدائی	نائب وزیر جنگ و مواصلات
۱۲-	ظفر حسن	سیکرٹری حکومت موقتہ
۱۳-	مولوی میاں عبدالباری	وکیل برائے ہند
۱۴-	شجاع اللہ	نائب وکیل

مولوی محمد علی قصوری نے مولانا عبیداللہ سندھی کو حکومت موقتہ کا نائب صدر لکھا ہے' جو قرین قیاس ہے لیکن میاں اکبر شاہ نے تو انھیں ''صدر'' لکھا ہے۔ یہ بات ہرگز درست نہیں۔ مولانا سندھی شروع سے وزیر داخلہ یا ایڈمنسٹریٹو منسٹر تھے۔ وہ اس منصب کے ساتھ نائب صدر تو ہو سکتے تھے صدر نہیں۔ صدر اور وہ بھی تا حیات صدر شروع سے آخر تک راجہ مہندر پرتاب تھے۔

ان کے علاوہ جرمن' ترک اور ہندوستانی افراد بھی حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ ''حکومتِ موقت ہند کابل'' کے محقق و مولف میر محمد شریف پاکرائی کے مطابق:

''شمشیر سنگھ (متھرا سنگھ)' عبدالعزیز' عبدالباری و بسیار دیگراں' علاوہ از ہندیان یک تعداد ترکان والمانہا نیز در حکومت موقت شامل شدند۔''
(صفحہ ۹۵)

حکومتِ موقتہ (پروویژنل گورنمنٹ) کے یہ تمام اراکین اس کے قیام کے اول روز ہی سے نہیں تھے۔ مولانا سندھی نے لکھا ہے کہ ابتدا میں حکومت موقتہ کے تین ممبر ہی رہے۔ امیر امان اللہ خان کے زمانے میں جنگ افغانستان کے خاتمے پر اور ممبر بڑھائے گئے۔ گویا کہ اضافہ ۱۹۱۹ء کے آخر میں اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں ہوا۔ مولوی محمد علی قصوریؒ کے بیان کے مطابق کم از کم پانچ ممبر اس کے شروع ہی سے تھے۔ یعنی راجہ صاحب (صدر)، مولانا برکت اللہ (وزیر اعظم) اور مولانا محمد عبیداللہ (وزیر داخلہ) کے علاوہ مولوی محمد علی (وزیر خارجہ) اور ملا محمد بشیر (وزیر دفاع) ہم مولوی محمد علی کے بیان کو نظر انداز نہیں کر سکتے!

اولاً مولوی صاحب شروع ہی سے جرمن مشن کے کام میں شریک کر لیے گئے تھے۔ ان کی واقفیت متعلقین سے بلاواسطہ تعلق پر تھی۔

ثانیاً کوئی عارضی یا مستقل حکومت وزارت خارجہ اور وزارت دفاع کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ خصوصاً ان حالات میں جو درپیش تھے ان دونوں وزارتوں کی بہت اہمیت تھی۔ کابل دنیا کی مختلف حکومتوں اور قوموں کے نمایندوں کا مرکز بنا ہوا تھا ان کے سامنے حکومت موقتہ کے موقف اور پالیسی کی ترجمانی کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ برطانوی ہند پر افغانستان کے متوقع

حملے کے سلسلے میں جو حکومت موقتہ کا سب سے اہم مقصد اور منصوبہ تھا۔ وزیر جنگ/ دفاع کے بغیر کیسے انجام پا سکتا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری نے پرووِژنل گورنمنٹ کے قیام کی ضرورت اور حالات پر سب سے اچھا تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہی زمانہ تھا جب کہ جرمنی سے تہران کے راستے ایک مشن آ پہنچا۔ اس مشن کے رئیس راجہ مہندر پرتاب تھے اور فون ہیننگ (Von Henting) قیصر ولیم کے وکیل مختار، ناظم بے سلطان روم کے وکیل مختار اور مولانا برکت اللہ غدر پارٹی کے نمایندے اور دوسرے اراکین تھے۔ اس مشن کے آتے ہی کابل میں ہل چل مچ گئی۔ کیوں کہ ان کی آمد ایسی نہ تھی کہ خفیہ رکھی جا سکتی۔ امیر صاحب کو اپنے ملازمین میں سے کوئی ایسا معتمد علیہ نہ ملا جو انگریزی، فرانسیسی اور فارسی پر عبور رکھتا ہو۔ اس لیے جرمن مشن کے مراسلات وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ کرنا اور ان کو نائب السلطنت صاحب کی وساطت سے اعلیٰ حضرت کے حضور پیش کرنا مجھے تفویض ہوا۔ مشن نے اس بات پر زور دیا کہ افغانستان فوراً انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔
>
> چنانچہ یہ طے پایا کہ ہندوستان کی ایک عارضی حکومت افغانستان میں قائم کی جائے جو افغانستان کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کرے اور اسے ہندوستان پر حملے کی دعوت دے۔ (مشاہداتِ کابل و یاغستان: کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، (۱۹۵۳ء)، صفحہ ۳۳-۳۲)

اس بیان میں حکومت موقتہ کے قیام کے لیے جو جواز بتلایا گیا ہے وہ نہایت اہم ہے۔ حکومت کا ذکر بہت حضرات نے کیا ہے لیکن اس کے قیام کے پس منظر پر بہت کم روشنی ملتی ہے۔ یہ کسی نے نہیں بتلایا کہ آخر اس کی ضرورت کیا پیش آ گئی تھی اور اس کے قیام کا قانونی جواز کیا تھا؟ اس بیان کے فوراً بعد وہ حکومت کی تشکیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی یہ عارضی (Provisional) حکومت بنائی گئی۔ اس

کے صدر راجہ مہندر پرتاب، نائب صدر مولانا عبیداللہ سندھی، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ اور وزیر خارجہ راقم الحروف بنائے گئے۔ ملا بشیر کو وزیر دفاع اور یاغستان کی لشکر کشی کا ذمہ دار بنایا گیا۔ (ایضاً: ص ۳۳)

اس کے بعد مولوی محمد علی قصوری نے دوسری باتیں بیان کی ہیں جو اگرچہ اہم اور اسی سلسلے کی ہیں لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ البتہ مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریر سے حکومت موقتہ کی تشکیل و خدمات اور کابل کے علاوہ نیپال اور شمال مشرقی بنگال میں اس کے مراکز کے قیام کے منصوبے اور افغان انگریز معاہدے (۱۹۲۱ء) کے بعد اس کے کام میں رکاوٹ اور منصوبے میں ناکامی کے اسباب اور حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم اپنے مطالعے میں قارئین محترم کو بھی شریک کر لینا چاہتے ہیں۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں:

''اس مشن کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے زیادہ ملنا شروع کر دیا۔ اس میں ہمارے دوست عبدالباری کی رفاقت ہمارے کام آئی۔ راجہ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ جرمن کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں۔ ہماری ملاقاتوں کا تسلسل دیکھ کر راجہ صاحب نے ہمیں حکومتِ موقتہ ہند میں شمولیت کی دعوت دی۔ انھیں خیال تھا کہ ہم شاید اس میں شامل ہونا پسند نہ کریں۔ کیوں کہ اس کا جس قدر نظام ان دونوں صاحبوں نے تجویز کیا تھا، اس میں راجہ صاحب سے وفاداری کا حلف ضروری تھا۔ مگر میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا۔ البتہ حلف نامہ تبدیل کر دیا جسے انھوں نے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی۔ ابتدا میں حکومت موقتہ کے تین ممبر رہے۔ امیر امان اللہ خاں کے زمانے میں جنگ افغانستان کے خاتمے پر اور ممبر بڑھائے گئے۔ اس میں جماعت مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ مگر ایسی شخصی

ڈکٹیٹر شپ کا خیال ان کے خیال پر غالب تھا۔ یورپین لوگوں سے ان کی زبان میں باتیں کر لیتے اور ڈیموکریسی کے لیکچر دے ڈالتے لیکن ہندوستانی معاملات میں ان کی موروثی خصلت نمایاں رہتی۔ ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انھیں راضی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دے گی۔ جسے انڈین نیشنل کانگریس نے اس کام کے لیے متعین کیا ہو۔ وہ اس کے سوا کوئی بات نہیں جانتے تھے کہ کام پریذیڈنٹ کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہیے اور وہ لائف پریذیڈنٹ اپنے ہی تجویز کردہ قانون سے مقرر ہو چکے تھے۔ جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومتِ موقتہ کے لیے تین مرکز تجویز ہوئے۔ کابل، نیپال اور شمال مشرقی بنگال، کابل کے مرکز میں کام ہمیں تفویض ہوا۔ اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کارروائیوں کو حکومت موقتہ مرکز کابل سے متعلق کر لیا۔

امیر امان اللہ خان صاحب جب برسر اقتدار ہوئے تو انھوں نے ہمیں حکومت موقتہ ہند کا نمایندہ مان کر صلح وحرب کے معاملات میں شریک کر لیا۔ جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرفراز فرمایا۔ دوران جنگ میں بھی بعض امور میرے حوالے کیے گئے۔ جنگ ختم ہونے پر اچھی کامیابی حاصل کرنے میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ اس تمام زمانے میں ہمارے نوجوان رفیقوں کے کارنامے سنہری حرفوں سے لکھے جائیں گے۔ اگرچہ ایک زمانے تک ان پر پردہ ڈالنا ضروری ہے۔ جب جنگ ختم ہونے پر راجہ صاحب دوبارہ کابل تشریف لائے تو امیر امان اللہ خان نے ان کے اعزاز میں ایسے کام کیے جن کی راجہ صاحب کبھی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس میں امیر صاحب نے ہمارے مشورے حرف بہ حرف قبول فرمائے۔

آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے، امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت موقتہ کا کام کرنے سے روک دیا۔ کیوں کہ انٹرنیشنل سیاست کی پابندی ضروری تھی۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کرلیا۔ جب ان کے وعدہ کرنے میں تعطل نظر آیا تو ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کیا۔ میں بذاتِ خود تھوڑے سے تغیر کے بعد آرام وعزت کے ساتھ کابل میں رہ سکتا تھا۔ مگر میرے نوجوان رفقاء (جن کی مشقتیں ہماری عزت افزائی کا سبب بنیں) کا مستقبل برباد ہو جاتا۔ اس لیے کابل سے نکلنا ضروری سمجھتا تھا۔ اب ہم اطمینان کے مالک نہیں لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں نے اپنے فایدے کے لیے دوسروں کا نقصان کر دیا۔ اگر کبھی کوئی موقع میسر آیا تو تمام دوست پھر یک جا ہو جائیں گے۔ واللہ الموفق والمعین۔ (کابل میں سات سال:۔ لاہور، سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۵۵ء، ص ۶۸-۶۶)

اس حاشیے کی تالیف میں مندرجہ ذیل کتب سے بھی مدد لی گئی ہے:

۱- آپ بیتی: ظفر حسن ایبک (حصہ اول)، لاہور، منصور بک ہاؤس، ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء)

۲- تحریک شیخ الہند—— ریشمی خطوط سازش کیس: مولفہ مولانا سید محمد میاں، لاہور، مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۷۴ء

۳- حکومتِ موقتِ ہند در کابل: مولفہ میر محمد شریف پاکرائی، کابل ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۹ء)

۴- قصوری خاندان، مولفہ: مولانا محمد اسحاق بھٹی، ماموں کانجن (فیصل آباد)، ۱۹۹۴ء

۵- سوانح حیات مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی: مولفہ خالد گرجاکھی، گوجرانوالہ

۶-آزادی کی تلاش: مولفہ میاں اکبر شاہ، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
۷-انقلابی کی سرگزشت از اقبال شیدائی۔

(۳) پرووِیژنل گورنمنٹ آف انڈیا کا قیام جون ۱۹۱۶ء سے پہلے عمل میں آ چکا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ۹ر جولائی ۱۹۱۶ء کے خط بنام مولانا محمود حسن دیوبندی میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مولوی محمد علی قصوری جو پرووِیژنل گورنمنٹ کے پہلے وزیر خارجہ تھے۔ جون ۱۹۱۹ء میں حبیبیہ کالج سے برطرف کر دیے گئے تھے اور ۱۰ر جولائی کو انھوں نے آزاد قبائل کی طرف سفر اختیار کیا تھا۔ مولوی محمد علی نے خود اپنی یادداشت ''مشاہداتِ کابل و یاغستان'' میں لکھا ہے کہ وہ مولوی عبدالرحیم عرف ملا بشیر کی معیت میں جو ۱۹۱۶ء میں آزاد قبائل کے لیے کابل سے خفیہ روانہ ہوئے تھے۔

شیدائی صاحب نے قصوری صاحب کا ان کے عہدے سے برطرف کیا جانا بیان کیا ہے۔ اس بیان کی صحت کا قرینہ موجود ہے۔ ان سے چوں کہ افغان حکومت کو شکایت پیدا ہوگئی تھی اور اسی شکایت کی بنا پر حبیبیہ کالج سے ان کی علیحدگی عمل میں آئی تھی۔ وہ پرووِیژنل گورنمنٹ کے بھی ایک اہم منصب دار تھے اور اس کے تمام کاموں کا مدار افغان حکومت کی رضامندی اور اس سے خوشگوار تعلقات پر تھا' اس کے بغیر کاموں کا اجرا ممکن نہ تھا۔ اس لیے تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر افغان حکومت کے علم میں ان کے علیحدگی کے فیصلے کو برطرفی ظاہر کیا گیا ہو۔

اقبال شیدائی نے ان کی برطرفی کا سبب ان کا حکومت برطانیہ سے مل جانا بیان کیا ہے۔ یہ بات ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہے اور حقیقت کے قطعاً خلاف ہے۔ اقبال شیدائی کے سوا یہ شبہ پرووِیژنل گورنمنٹ کے کسی رکن یا کسی صاحبِ نظر و اہل قلم کو نہیں ہوا؟ مولوی محمد علی مرحوم جس سازش کا شکار ہوئے تھے اس سے انھوں نے مشاہدات کابل و یاغستان میں خود پردہ اٹھا دیا ہے اور ان سے بہت قریبی تعلق رکھنے والے دو اہل قلم مولانا غلام رسول مہر اور مولانا محمد اسحاق بھٹی نے اپنی تالیفات ''سرگزشت مجاہدین' اور ''قصوری خاندان'' میں روشنی ڈالی ہے۔ افغان حکومت کی بعض مقتدر شخصیات اور اکابر تحریک جو اصل حقائق سے واقف تھے مولوی محمد

علی ان سے مل کر اور مشورے کے بعد کابل سے نکلے تھے اور کابل سے نکلنے، تحریک کے مقاصد اور پیش آمدہ حالات کی روشنی میں تحریک کے لائحہ عمل اور کامیابی کے امکانات پر غور و تدبر کے بعد ایک پالیسی اختیار کی تھی اور یاغستان میں حالات کے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں جو فیصلہ کیا تھا اس کے سوا کوئی اور فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

شیدائی صاحب نے جو بات بے دھڑک اپنے قلم سے لکھ دی، انھیں اندازہ نہیں کہ اگر اس کی بھنک بھی مجاہدین یاغستان کے کانوں میں پڑ جاتی بلکہ اس کا وہم بھی ان کے دل میں گزر جاتا تو شیدائی صاحب اندازہ نہیں کر سکتے کہ مولوی محمد علی کا کیا حشر ہوتا؟ مولوی صاحب مرحوم نے تو اس کے بعد ایک عرصہ اس علاقے میں مجاہدین کے ساتھ گزارا تھا۔

شیدائی صاحب کا تو ۱۹۱۶ء میں کابل میں مہاجرین ہند، مشن کے ارکان، یاغستان کے مجاہدین وغیرہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ وہ حکومت موقتہ کے قیام کے کامل چار برس کے بعد جولائی ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتے میں کابل پہنچے تھے۔ اس وقت تک حکومت موقتہ کا نہ صرف عہد عروج بیت چکا ہے بلکہ اس وقت اس کی کوئی سرگرمی باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے ان کے معلومات کو استناد کا وہ درجہ نہیں دیا جا سکتا جو مولانا سندھی، ظفر حسن، میاں عبدالباری وغیرہم کو اور محققین اہل قلم میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا محمد اسحاق بھٹی یا میر محمد شریف پاکرائی کو دیا جا سکتا ہے۔

(۴) راجہ مہندر پرتاب مرسان ضلع علی گڑھ میں یکم دسمبر ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی راجہ گھنشیام سنگھ مرسان کے بڑے زمیندار تھے۔ مہندر پرتاب کو ہاتھرس کے راجہ نے گود لے لیا تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تھا۔ انقلابی سیاست سے انھیں دلچسپی تھی۔ انھوں نے یورپ و ایشیا کے کئی ملکوں کا سفر کیا تھا۔ جرمن ترک مشن کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچے تھے۔ ہندوستان کی عارضی حکومت بنائی۔ وہ اس کے تاحیات صدر تھے۔ ۱۹۴۵ء میں وطن لوٹ گئے تھے۔ برٹش عہد میں کانگریس کے آخری سیشن میرٹھ (۱۹۴۶ء) میں استقبالیہ کمیٹی کے نائب صدر تھے۔ کانگریس کا یہ جلسہ جہاں منعقد کیا گیا تھا اس کا نام "مہندر پرتاب نگر" رکھا گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء کے الیکشن میں متھرا کے علاقے سے قومی

اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ آخر میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

وہ انسانی مساوات، بھائی چارے اور اتحاد کے بڑے مبلغ تھے۔ وہ محب وطن اور مدبر ہی نہیں، خطیب، صحافی اور مصنف بھی تھے۔ ''مائی لائف اسٹوری آف ففٹی فائیو ایز'' ان کی خودنوشت یادگار ہے۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۷۶ء کو انتقال ہوا۔

(۵) اس مقام پر کئی مشاہیر کے نام آئے ہیں۔ ان کی صحیح تواریخ وفات یہ ہیں:

مولانا برکت اللہ بھوپالی ۲۷ر دسمبر ۱۹۲۷ء بہ مقام میرز ول (Marys Ville) ریاست کیلی فورنیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی ۲۱ر اگست ۱۹۴۴ء بہ مقام دین پور ریاست بہاول پور

جنرل نادر خان ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک طالب علم نے دلکشا محل (جلال آباد) میں گولی ماردی۔

(۶) کسی دوسرے ماخذ سے اقبال شیدائی کے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی کہ انھیں جنگ اور مواصلات کی وزارتوں کا نائب وزیر بنایا گیا تھا۔ کس نے بنایا تھا اور اس وقت اُس کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ حکومت موقتہ کے اعضا تو ۱۹۱۶ء ہی میں منتشر ہونا شروع ہو گئے تھے اور امیر حبیب اللہ کے قتل (۲۰ فروری ۱۹۱۹ء) تک کوئی عضو بھی اپنی جگہ پر باقی نہ رہا تھا۔ جنگ افغانستان میں اور جنگ میں فتح کے بعد کچھ عرصے تک اس کی سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے۔ جولائی ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتے میں شیدائی صاحب کابل پہنچے تھے۔ قرین قیاس ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک پڑھے لکھے پرجوش اور فعال نوجوان کی تالیف قلب کے لیے دو وزارتوں کی نیابت سونپ کر اپنے ساتھ ملا لیا ہو۔ شیدائی صاحب نے ڈاکٹر رحمت علی زکریا کے وزیر مواصلات بننے اور مولانا سندھی اور ان کے اختلاف کا ذکر بھی کیا ہے۔ (امروز، لاہور، ۱۵ر جولائی ۱۹۷۳ء)

(۷) شیدائی صاحب نے اس قاصد کا نام ابراہیم عرف بورے خان لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے:

''وہ ہندوستانی فوج سے فرار ہو کر انقلابیوں میں شامل ہو گیا تھا۔'' (امروز، لاہور ۱۸ مئی

۱۹۶۹ء، ص ۷)

(۸) مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، راجہ مہندر پرتاب، تحریک ہجرت وغیرہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان پر مستقل تحقیقی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مہاجر نوجوانوں میں سے ایک نوجوان اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت (پرووِژنل گورنمنٹ آف انڈیا) کے ایک رکن ظفر حسن ایبک کی ''آپ بیتی'' چھپ چکی ہے۔ ایک تحقیقی کتاب ''حکومت موقت ہند در کابل'' میر محمد شریف پاکرائی کی فارسی میں کابل سے شائع ہوئی ہے۔ چند کتب حوالہ کے نام اسی سلسلہ حواشی کے نمبر ۲ کے ذیل میں آ چکے ہیں۔ کسی نے اس معاہدے کا ذکر نہیں کیا جو ہندوستان کی عارضی حکومت اور افغان قوم پرستوں کے مابین طے پا گیا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے نام مولانا عبیداللہ سندھی ۹ رجولائی ۱۹۱۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''چند روز کے مباحث کے بعد اس انجمن (حکومتِ موقتہ ہند) نے قبول کر لیا کہ افغانستان اگر جنگ میں شرکت کرتا ہے تو اس کے شہزادے کو ہندوستان کا مستقل بادشاہ ماننے پر تیار ہیں اور اس قسم کی درخواست امیر صاحب کے یہاں پیش کر دی لیکن چوں کہ امیر صاحب ابھی جنگ میں شرکت کے لیے تیار نہیں اس لیے معاملہ ملتوی کر رکھا ہے۔ (تحریک شیخ الہند: مولانا سید محمد میاں، ص ۳۶۸)

سی آئی ڈی کی تفتیش کے دوران میاں عبدالباری نے اپنے بیان میں کہا:

''بالعموم میں ان خفیہ مشوروں میں شامل ہوا کرتا تھا، جو راجہ مہندر پرتاب، برکت اللہ، عبیداللہ، کاظم بے کے درمیان حاجی عبدالرزاق کے مکان پر ہوا کرتے تھے۔ عام موضوع یہ ہوا کرتا تھا کہ افغانستان سے کسی طرح برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کرایا جائے۔ اس جگہ پر سب سے پہلے یہ تجویز سامنے آئی تھی کہ افغانستان کے شاہی خاندان کے کسی شہزادے کو حکومتِ موقتہ ہند کا صدر بنایا جائے۔ (ایضاً: ص ۳۲۹)

ان بیانات سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ معاہدہ طے پا گیا تھا۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کو جنگ میں شرکت پر آمادہ کرنے اور برطانوی ہند پر حملہ کروانے کے لیے ایک

جھانسا دیا جارہا تھا اور جس بات پر پروویژنل گورنمنٹ کے ارکان متفق ہو گئے تھے، اسے امیر حبیب اللہ خاں کے حضور بہ طور تجویز پیش کر دیا گیا تھا اور بس! اس پر غور تک نہ کیا گیا تھا۔ اس کا منظور ہونا اور معاہدے کی شکل اختیار کرنا تو دور کی بات تھی۔ کسی ایسی تجویز کو جس پر ایک فریق نے غور تک نہ کیا ہو معاہدہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ معاہدے کے لیے دونوں فریقوں کی منظوری اور اس پر دونوں کے دستخط ہونا ضروری ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اس کی خبر ہندوؤں کو ہو گئی تھی اور اس سے ان میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ ہر گز تعجب انگیز نہیں! یہ بات معلوم ہے کہ امیر حبیب اللہ خان کی جو بات ہندوستانی انقلابیوں سے ہوتی تھی اس کی اطلاع وہ انگریزوں کو کر دیتے تھے اور اس کا انھیں معاوضہ مل جاتا تھا۔ یہ بات بھی ان کے علم میں آئی اور سی آئی ڈی کے سامنے میاں عبدالباری کا بیان (۱۹۱۷ء) موجود ہے۔ اس کے بعد اس گفتگو یا مجوزہ معاہدے کے افشا کے بارے میں اور کیا رہ جاتا ہے۔ یہ بات برٹش گورنمنٹ کے علم میں اسی وقت آ گئی تھی۔ اس سے اس نے فائدہ اٹھایا اور بعض ہندو رہنماؤں کو اس کی اطلاع دے کر دونوں قوموں میں بدظنی اور نفرت پیدا کرنے' اختلافات کی آگ بھڑکانے اور آزادی کی تحریک کو تباہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔

پروویژنل گورنمنٹ کے بارے میں ایک ضروری بات رہ گئی۔ کابل میں ہندوستان کی عارضی حکومت کے قیام کے بعد یہ بھی طے پایا تھا کہ اس کے دو مراکز نیپال اور شمال مشرقی بنگال میں بھی قائم کیے جائیں گے۔ کابل کے مرکز میں کاموں کی نگرانی مولانا عبیداللہ سندھی کے سپرد تھی اور نیپال کے مرکز میں راجہ مہندر پرتاب کو کام چلانا تھا۔ بنگال کے مرکز کے انتظام کے بارے میں کوئی فیصلہ نظر سے نہیں گزرا (کابل میں سات سال: ص ۶۷) نیپال کے مرکز کے قیام اور کاموں کی بجا آوری کے لیے راجہ صاحب نے وہاں جانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ وہاں پہنچ ہی نہ سکے۔ مراکز کے قیام کے بارے میں میر محمد شریف پاکرانی لکھتے ہیں:

> ''متعاقباً حکومتِ موقت تجویز گرفت کہ علاوہ از کابل در نیپال و بنگالہ نیز حکومت موقت آزاد تشکیل گردد۔'' (حکومتِ مؤقت ہند در کابل: ص ۹۵)

(۹) یہ عالمی فیڈریشن غالباً وہی ہے جسے ایم ایس جین نے غیر واضح اور مبہم مقاصد کی

''ورلڈ فیڈریشن'' (ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی: ج ۳، ص ۱۰) بیان کیا ہے اور شاید یہی وہ انجمن ہو جس کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے:

''ان کا تازہ ترین شوق ''مجلس شادمانی'' تھی جو خود انھوں نے قائم کی تھی اور جس کا مسلک یہ تھا کہ ہمیشہ خوش رہو۔'' (میری کہانی (حصہ اول): دہلی، مکتبہء جامعہ، ص ۲۵۵)

(۱۰) شیدائی صاحب نے اس سے پہلے جہاں مولانا آزاد سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بات نہیں لکھی کہ انھیں مولانا ابوالکلام آزاد نے کابل بھیجا تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر اس کا کوئی مقصد بھی ہوگا؟

استدراک:

میں حواشی لکھ کر فارغ ہو گیا تو اچانک محمد عرفان بھوپالی کی تالیف ''برکت اللہ بھوپالی'' سامنے آ گئی۔ یہ کتاب ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کتب خانے میں موجود تھی لیکن حواشی کی تالیف کے وقت یاد نہیں آئی۔ اس کے مطالعے سے بعض نئی معلومات کا علم ہوا۔ مناسب ہوگا کہ قارئین کرام کو بھی اس سے استفادے میں شریک کر لیا جائے۔

۱- انڈو جرمن مشن ۵/اپریل ۱۹۱۶ء کو برلن سے روانہ ہوا تھا۔ مشن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

(الف) ایک حصہ مولانا برکت اللہ کی قیادت میں تھا۔ اس گروپ میں برلن کمیٹی کے بہت سے اراکین اور ''افغان آفریدی سپاہیوں کی ایک پلٹن بھی تھی جو جنگ کے مختلف محاذوں سے گرفتار ہوئی تھی اور مولانا برکت اللہ نے اپنی سحر بیانی سے انھیں انگریزوں سے برگشتہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اس نے وفد کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی تا کہ اس طرح وہ بھی اپنے وطن واپس پہنچ جائیں گے۔''

برلن سے مذکورہ تاریخ کو مولانا برکت اللہ گروپ کی روانگی عمل میں آئی تھی۔

(ب) دوسرا حصہ راجہ مہندر پرتاب کی سربراہی میں چند جرمن آفیسرز پر مشتمل تھا جو چند دن بعد روانہ ہوا تھا۔

وفد کی تقسیم کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ راستے میں رومانیہ کا علاقہ پڑتا تھا جو جرمن دوست نہیں تھا۔ اس لیے احتیاط لازم تھی۔ قسطنطنیہ پہنچ کر دونوں گروپ ایک ہو گئے۔ بعد کا سفر ایک وفد کی صورت میں کیا تھا۔ برلن کمیٹی کے اراکین قسطنطنیہ میں الگ ہو گئے تھے۔

وفد کے اراکین کی تفصیل محمد عرفان مولف ''برکت اللہ بھوپالی'' کے مطابق یہ ہے:

۱-راجہ مہندر پرتاب	وفد کے سربراہ، ہندوستانی انقلابی، نمائندہ برلن کمیٹی برائے آزادی ہند
۲-مولانا برکت اللہ بھوپالی	رکن وفد، ہندوستانی انقلابی، نمائندہ غدر پارٹی آف امریکہ و برلن کمیٹی۔
۳-ڈاکٹر فان ہینٹنگ	جرمن نمائندہ و رکن وفد۔ ایک جرمن ڈپلومیٹ
مسٹر رور (Rhor)	سیکریٹری ڈاکٹر فان ہینٹنگ
۴-ڈاکٹر بارکر (Barker)	جرمن
۵-کیپٹن واگر	جرمن
۶-لیفٹننٹ فوخت	جرمن
۷-کیپٹن کاظم بے	ترکی نمائندہ رکن وفد
۸-کیپٹن نیڈر مائر (اسٹرین)	اصفہان سے جرمن فوجی محافظ

اس کے ساتھ وفد کی حفاظت کے لیے ایک فوجی دستہ بھی تھا جو اصفہان سے شریک وفد ہو گیا تھا۔

۱-برلن سے جب یہ وفد روانہ ہوا تھا تو اس کی حیثیت انڈو جرمن مشن کی تھی لیکن قسطنطنیہ میں کاظم بے کی شمولیت کے بعد مشن کی حیثیت ہندوستان جرمن ترک مشن کی ہو گئی تھی۔

۲-یہ مشن ۲/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچا تھا۔

۳-مشن کے ارکان کو بابر باغ میں ٹھہرایا گیا تھا۔

۴-مشن کے بارے میں چوں کہ جرمن اور ترکی حکومتوں نے حکومتِ افغانستان سے نہ کوئی اجازت لی تھی اور نہ اپنی روانگی اور مقصد سے مطلع کیا تھا۔ مشن اجازت اور اطلاع کے بغیر

اچانک پہنچ گیا تھا۔ اس لیے شروع میں اس کی حیثیت نظر بند کی سی تھی۔ انھیں باغ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اگرچہ اس پر یہ بات ظاہر نہیں کی گئی اور نہ ان کی میزبانی کے فرائض میں کوتاہی کی گئی۔

۵- نظر بندی کی یہ حالت نومبر کے وسط تک رہی۔ پھر ارکان وفد کے احتجاج پر یہ حالت ختم کر دی گئی اور امیر حبیب اللہ خان سے وفد کی ملاقات کا انتظام کیا گیا۔

۶- امیر حبیب اللہ خان کے وفد کی اجتماعی اور الگ ملاقاتوں کے بعد دیگر معاملات پر گفتگو اور تصفیے کے لیے امیر نے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خان کو مختار بنا دیا تھا اور قاضی القضات حاجی عبدالرزاق خان کو ان کا مشیر مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد وفد کی ملاقاتیں سردار نائب السلطنت یا قاضی القضات کے دولت کدوں پر ہونے لگی تھیں۔

۷- محمد عرفان نے راجہ مہندر پرتاب کی خودنوشت (My life story of fifty five years) کے حوالے سے لکھا ہے کہ راجہ صاحب نے نائب السلطنت اور قاضی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان آزاد ہونے پر بلوچستان اور فارسی بولنے والا علاقہ افغانستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔'

۸- ۲۹ر نومبر ۱۹۱۵ء کے اجلاس میں انقلابی کونسل نے ''ہندوستان کی پرووِیژنل گورنمنٹ'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو 'پرووِیژنل گورنمنٹ آف انڈیا'' کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا گیا تھا۔

۹- ہندوستان کی پرووِیژنل گورنمنٹ کی پہلی کابینہ محمد عرفان کی معلومات کے مطابق مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھا۔

(۱) راجہ مہندر پرتاب	صدر (تاحیات)
(۲) مولانا برکت اللہ بھوپالی	وزیر اعظم
(۳) مولانا عبید اللہ سندھی	وزیر داخلہ
(۴) کیپٹن کاظم بے	وزیر دفاع (عارضی)
(۵) محمد علی	سیکریٹری جنرل پرووِیژنل گورنمنٹ

محمد علی کے ہندوستان جانے اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے ان کی جگہ سیکریٹری جنرل کے عہدے پر ظفر حسن کو مقرر کیا گیا تھا۔

(۶) اللہ نواز خان سیکرٹری ٹو پریذیڈنٹ راجہ مہندر پرتاب

۱۰- پروویژنل گورنمنٹ آف انڈیا کے دفاتر کے لیے...... مخصوص کر دیا گیا تھا۔

۱۱- ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں جب مولانا برکت اللہ بھوپالی کو اعلیٰ حضرت امان اللہ خان نے ''اپنے خاص سفیر'' کی حیثیت سے ماسکو روانہ کیا تھا تاکہ وہ روسی گورنمنٹ سے برٹش انڈیا پر افغانستان کے حملے کے لیے فوجی امداد، سامانِ جنگ اور دیگر معاملات طے کرے تو مولانا عبید اللہ سندھی کو ان کی جگہ قائم مقام وزیر اعظم بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں

حضرت امام الہند کا تاریخی ورود

۸ جنوری ۱۹۵۱ء کو مولانا ابوالکلام آزاد دیوبند تشریف لے گئے اور دارالعلوم کا معائنہ فرمایا۔ اس موقع پر دارالعلوم کی جانب سے ایک استقبالیہ جلسے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے جلسے سے خطاب بھی فرمایا۔ جلسے میں دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر متعلقین کے علاوہ دیوبند اور اس کے قرب و جوار کے معززین و شائقین نے بھی شرکت فرمائی۔ جلسے کی صدارت مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلوی نے فرمائی۔ اس موقع پر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے استقبالیہ تقریر فرمائی اور حضرت مولانا آزاد کی خدمت میں سپاس نامہ پیش فرمایا۔ استقبالیہ تقریر اور سپاس نامے کے جواب میں مولانا آزاد نے ایک عظیم الشان تاریخی خطاب فرمایا۔

حضرت مولانا آزاد کا یہ تاریخی خطاب قارئین محترم کی ضیافت طبع کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس خطاب کے متعدد متن میرے سامنے تھے جو ایک دوسرے سے کم و بیش مختلف تھے۔ خاکسار نے مولانا آزاد کی زبان، اسلوب، ان کے خطاب کے خصائص مجمع حاضرین و سامعین کی خصوصیات اور موقع و محل کے مناسبات کو پیش نظر رکھ کر ایک متن تیار کر لیا لیکن اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس میں کوئی لفظ اپنی طرف سے شامل نہیں کیا ہے۔ البتہ اغلاطِ کتابت کی صحت اور تمام متون میں منتشر مطالب کی تالیف ضرور پیش نظر رہی ہے۔ اس طرح حضرت مولانا آزاد کے خطاب کا مکمل اور مستند ترین متن تیار ہو گیا ہے۔ سپاس نامے

کا جواب دیتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا:

''حضرات! ایک عرصے کے بعد مجھے یہاں حاضر ہونے کا موقع ملا ہے۔ مگر میرا تعلق اس عظیم الشان درس گاہ سے نیا نہیں' بلکہ بہت پرانا ہے۔ ابھی جب یہ ایڈریس پڑھا جارہا تھا مجھے یاد آیا کہ ۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا۔ جب مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں مقیم تھے اور میں نے چاہا تھا کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب (قدس اللہ سرہ العزیز) سے ملاقات کا موقع ملے لیکن برطانوی حکومت کے جو خیالات میرے متعلق تھے وہ مجھ سے تعلق رکھنے والے اداروں کو بھی خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ اس لیے خطرہ تھا کہ میں دیوبند جاؤں تو لازمی طور پر دارالعلوم کے حالات بھی آلودہ ہو جائیں گے اور یہ علمی درس گاہ بھی میری وجہ سے حکومت کی نظروں میں مشکوک ہو جائے گی۔ حضرت مولانا کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپ خود دہلی تشریف لائے اور یہ اہتمام کیا کہ شام کی ٹرین سے جو تقریباً سات بجے دہلی پہنچتی تھی' دہلی شریف فرما ہوں اور جو ٹرین رات کو قریباً بارہ بجے دہلی سے روانہ ہوتی تھی اس سے واپس ہو کر صبح کے اوقاتِ درس سے پہلے اپنے دولت کدے پر رونق افروز ہو جائیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب جو اپنے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب مرحوم کے واسطے سے حضرت شیخ الہند سے خاص عقیدت رکھتے تھے ان کی کوٹھی پر قیام فرما کر مجھے شرفِ ملاقات بخشا۔

۱۹۱۵ء میں جب مدرسہ (دارالعلوم) میں تقریب ہوئی جس میں یو پی کے گورنر مسٹن کو بھی مدعو کیا گیا تھا(۱) (صوبہ یو پی کے گورنر سر جیمس مسٹن اسکار جی مسٹن یکم مارچ 1915ء کو دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے تھے (ا-س-ش-)۔ تو مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ مولانا محمد علی صاحب مرحوم' ڈاکٹر مختار احمد انصاری بھی مدعو تھے اور ان احباب کے ساتھ مجھے بھی حاضری کا موقع ملا تھا لیکن پھر بھی کچھ ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ میں جلسے میں شریک نہ ہو سکا۔ بہر حال جسمانی علائق کا لحاظ کرتے ہوئے میرا تعلق دارالعلوم دیوبند سے پینتیس سال کا ہے اور فکری علائق کی تاریخ اس سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے۔''

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا:

''آپ کی اس درس گاہ کی بنیاد ایک نازک وقت میں ڈالی گئی تھی۔ عام طور پر کوئی درس

گاہ یا کوئی ادارہ ایسے موضع پر قائم کیا جاتا ہے جہاں خوش حالی ہو اور دولت مند لوگ رہتے ہوں جن سے اُس ادارے کی مالی امداد ہو سکے یا اسی قسم کی کوئی اور مادی اعانت حاصل ہو سکے۔ مگر آپ کا قصبہ دیوبند نہ تو دولت مند شہر تھا اور نہ اس کی کوئی اور خصوصیت قابل ذکر تھی۔ اگر یہ دارالعلوم نہ ہوتا تو شاید آج لوگ دیوبند کے نام سے بھی واقف نہ ہوتے۔ یہ درس گاہ ایسے وقت میں قائم کی گئی کہ ہندوستان بہت بڑے فوجی انقلاب کے دور سے گزر چکا تھا۔ اس انقلاب کے بعد مصیبتوں کے جو پہاڑ ہندوستان بالخصوص مسلمانوں پر ٹوٹے تھے ان کا لحاظ کرتے ہوئے یہ مشکل معلوم ہوتا تھا کہ آسمان ہند کے نیچے مسلمان اب کبھی اطمینان کا سانس لے سکیں گے۔ اس انقلاب سے پہلے اگر چہ مسلمانوں کی حکومت کمزور ہو گئی تھی لیکن مسلمان عام زندگی میں ایک بلند معیار قائم کیے ہوئے تھے۔ ان کے نظامِ معیشت کی سطح بلند تھی اور ملک میں ان کا اقتدار باقی تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے مسلمانوں کے ہر ایک نظم کو پارہ پارہ کر دیا اور ان کے تمام امتیازات کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور یہ واقعہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ چند مخلص بزرگوں نے ایسے نازک دور میں اور ایسی بستی میں جہاں سے کسی مالی امداد کی توقع از بس نہ تھی۔ اس مدرسۂ اسلامیہ (دارالعلوم) کی بنیاد ڈالی جب کہ اسباب ظاہری کے لحاظ سے ان کا رفیق سفر ''فقر زمانہ اور پراگندہ حالی'' اور ان کا سرمایہ اعتماد علی اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔

بانی دارالعلوم:

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے بیان کیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو درحقیقت اس عظیم الشان درس گاہ کے بانی تھے۔ دارالعلوم سے صرف پندرہ روپے ماہوار لیا کرتے تھے۔ (دارالعلوم کے اکابر سے معلوم ہوا کہ حضرت نانوتوی کی تنخواہ صرف دس روپے ماہانہ تھی) اور باوجودے کہ یہ تنخواہ آپ کی ضروریات کے لیے ناکافی تھی اور آپ ہمیشہ انتہائی عسرت اور تنگ دستی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر آپ نے کبھی اس تنخواہ میں اضافہ منظور نہیں فرمایا لیکن اس کے باوجود جذبۂ ایثار وہ تھا کہ صحابۂ کرام کی زندگی یاد آتی تھی۔ ۱۸۸۸ء کا واقعہ ہے جب ترکی اور روس برسرِ پیکار تھے اور کریمیا میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ اس وقت برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ وہ ترکی کی امداد کرے۔ چناں چہ ہندوستان

میں ترکی کے لیے بہت سے چندے کیے گئے۔ سہارن پور میں ایک جلسہ چندے کے لیے مدعو کیا گیا (مولانا کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی)۔ مولانا سمجھ گئے کہ ان کو اس کے لیے بلایا جارہا ہے کہ وہ بھی مسلمانوں سے چندے کے لیے اپیل کریں۔(۱)

یہی دور تھا جب یورپ کے ریڈکراس کی طرح ترکوں نے "ہلال احمر" قائم کیا تھا۔ مولانا پسند نہ کرتے تھے کہ دوسروں سے امداد کی اپیل کرتے وقت خود کچھ امداد نہ کریں لیکن ایک ایسا شخص کس طرح مالی امداد کرسکتا تھا جس کا کل اثاثہ نیلی لنگی اور موٹے گاڑھے کا کرتا ہو۔ تاہم گھر میں کھانا پکانے کے کچھ برتن تانبے پیتل کے ضرور ہوتے ہیں جب مولانا سہارن پور تشریف لے گئے تو گھر کے تمام برتن لے گئے اور چندے کے لیے اپیل کی تو سب سے پہلے آپ نے یہ برتن پیش کردیے۔

حضرت نانوتوی نے اس ایثار سے چودھویں صدی میں حضرت صدیق اکبرؓ کی سیرت زندہ کردی۔ غزوۂ عسرت میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چندے کی اپیل کی تو حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس جو کچھ اثاثہ تھا وہ دربارِ رسالت میں حاضر کیا۔ جب بارگاہِ رسالت نے دریافت فرمایا ما ابقیت لا ھلک ؟ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ تو پیکر صدق وصفا نے برجستہ عرض کیا۔ ابقیت لھم اللہ ورسولہ میں نے ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو باقی رکھا ہے۔

لوگ علم وتبحر ڈھونڈھتے ہیں۔ ان بزرگوں کا تبحر علمی بھی وہ تھا جو ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتا۔ اس کے باوجود سب سے زیادہ قابل قدر اور مستحق تعظیم وہ سیرت، ایمان واذعان اور وہ تقویٰ تھا جو مقربین اور صدیقین کا جوہر ہوتا ہے جیسا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے لیے ارشاد فرمایا:

"نماز روزے کی زیادتی کے باعث نہیں بلکہ اس خاص جوہر کی وجہ سے جو ان کے دل میں جمادیا گیا تھا۔"

---

(۱) معلوم ہوتا ہے، مولانا آزاد کی تقریر کے ضبط میں مرتب یا کاتب سے سہو ہوا۔ روس ترکی جنگ کا واقعہ ۷۸-۱۸۷۶ء کا ہے۔ دارالعلوم سے تنخواہ لینے کے واقعے میں بھی دو بزرگوں کے تذکرے میں خلط مبحث ہوگیا (ا-س-ش)

ہندوستان میں تعمیر اسلام کی بنیادی اینٹ:

ان بزرگوں کے اس جوہر ایمانی' فراست اور استقلال واستقامت نے تمام بے سرو سامانی اور ہر قسم کی سراسیمگی کے باوجود اس درس گاہ کے قائم کرنے پر انھیں آمادہ کیا اور جب تک اس درس گاہ کے ذمے دار استقلال واستقامت کی روایات کو زندہ رکھیں گے۔ دارالعلوم کے مستقبل سے ایک لمحے کے لیے بھی پریشانی نہیں ہوسکتی۔ اس نازک دور میں ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اگر ہندوستان میں اسلام کی تعمیر کو سنبھالنا ہے تو کوئی نئی اینٹ رکھنی چاہیے۔ یہ دارالعلوم اس بنیاد کا یہی سنگ جدید ہے۔

دارالعلوم کی خدمات:

اس دارالعلوم نے اس ستر سال کے عرصے میں جو خدمات انجام دی ہیں اگر انھیں مرتب کیا جائے مجلّہ تیار ہو جائے گا اور پھر بھی داستان ادھوری رہے گی۔ گذشتہ چار سال سے جو واقعات پیش آئے ہیں، ان کا نتیجہ تھا کہ ملک پر مصیبت کی گھٹا چھا گئی۔ ہم نے آزاد ہندوستان کا جو نقشہ تیار کیا تھا اگر وہ باقی رہتا تو یقیناً حالات دوسرے ہوتے۔ مگر ملک تقسیم ہو گیا جس کا نتیجہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی تباہی وبربادی کی شکل میں نمودار ہوا۔

الحمدللہ! یہ مصیبت کا دور ختم ہو چکا ہے اور ملک میں نفرت وعداوت کی بجائے باہمی اعتماد بڑھ رہا ہے لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ آج اس دارالعلوم میں وہی روح کارفرما ہونی چاہیے جس نے ستر سال پہلے بہت بھیانک دور میں ملت کی رہنمائی کی تھی۔

دارالعلوم کا فرض:

حضرات! جماعت کی طاقت افراد پر نہیں ہوتی بلکہ اصل طاقت وہ روح ہوتی ہے جو جماعت میں کام کرتی ہے۔ جماعت کے افراد کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جماعت کی روح کیا ہے۔ اس کا مزاج کیا ہے اور اس کا تقاضا کیا ہے؟ یہ دارالعلوم ایک کارخانہ ہے جس میں مسلمانوں کے دلوں کو خاص انداز میں ڈھالا جاتا ہے اور ان کی روحوں میں قوت پیدا کی جاتی ہے۔ اگر یہ مقصد قائم ہے اور یہ کارخانہ اپنا کام کر رہا ہے تو ہمیں کبھی خائف نہ ہونا چاہیے کہ اس آسمان کے نیچے ملت پر مصیبت کے بادل چھا سکتے ہیں۔

جواب سپاس نامہ:

سپاس نامہ میں چند باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ اس مدرسہ کی واقعی تعلیمی حیثیت کا اعتراف کیا جائے اور سندوں کو درجہ دیا جائے جس کی وہ فی الواقع مستحق ہے۔ میں حکومت کی طرف سے اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ مدرسے کی حیثیت اور اس کی عظمت سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ اسے پوری طرح سمجھتی ہے اور دارالعلوم کی خدمت کے لیے ہمیشہ تیار رہے گی۔

میں آپ حضرات کا شکر گذار ہوں کہ آپ حضرات نے مجھے موقع دیا کہ میں اپنی زندگی کے چند بہترین لمحات یہاں صرف کروں۔"

طلبہ سے خطاب:

حضرت مولانا نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"طلبائے عزیز بھی یہاں موجود ہیں۔ میری خواہش تھی کہ ان سے علاحدہ خطاب کرتا مگر وقت بہت کم ہے میں چاہتا ہوں کہ اسی اجتماع میں ان کو مخاطب کر کے چند کلمات پیش کردوں۔

طلبائے عزیز! کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس مدرسے میں آکر جو تعلیم تم حاصل کر رہے ہو اس کا مقصد کیا ہے؟ اور جو علم تم حاصل کر رہے ہو وہ مقصد ہے یا وسیلہ؟ دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جو وسیلہ ہیں، اصل مطلوب نہیں۔ البتہ جو مطلوب ہیں وہ ان کے بغیر نہیں مل سکتیں۔ اس لیے وسیلہ بھی مطلوب ہو جائے گا۔ مثلاً سکہ سونے چاندی کا چلتا ہے۔ دولت کمانے کا یہی ذریعہ ہے مگر ہماری زندگی کی ضرورتوں میں یہ سونا چاندی کس کام آتا ہے؟ اگر پیاس لگی ہو تو کیا چاندی سے بجھ جائے گی؟ بھوک میں کیا سونا بھوک مٹا دے گا؟ مگر جب تک یہ سامان (سونا چاندی وسیلہ) نہ ہو کھانے پینے کی چیزیں نہیں مل سکتیں۔ اس لیے (چاندی سونے کا حصول بھی ضروری ہو گیا) گورنمنٹ نے کرنسی چلائے ہیں۔ کاغذ کا پرچہ چھدام کا بھی نہیں ہے۔ مگر گورنمنٹ نے اس پر چھاپ دیا ہے۔ ایک ہزار روپیہ اب یہ وسیلہ ہے۔ اسی کاغذ کے ذریعے روپے اور اشرفیاں مل جاتی ہیں۔ یہ وسیلہ ہو گیا ایک ہزار روپے کے وصول کرنے کا۔ لوگ ہزار

روپے کی اشرفیاں یا چاندی کے سکے نہیں رکھتے بلکہ کاغذ کا یہ پرزہ رکھ لیتے ہیں جس پر سرکاری حیثیت سے مثلاً ایک ہزار روپیہ لکھا ہوتا ہے۔ نوٹ اور سونے چاندی کی مثال سے معلوم ہو گیا کہ جو چیزیں وسیلے کا حکم رکھتی ہیں ان میں استقرار ضروری نہیں ہے اور جو چیزیں مقاصد میں داخل ہیں ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ بھوک میں غذا مقصد ہے، وسیلہ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔

تم نے اپنے گھروں کو اور عزیز و اقارب کو چھوڑا اور یہاں آئے۔ ملک میں تعلیم کے دوسرے طریقے بھی رائج ہیں لوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر تم نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کیں اور یہاں کا رخ کیا اور کالجوں کو چھوڑا اور اس مدرسہء اسلامیہ میں داخلہ لیا تا کہ دینی علوم میں مہارت حاصل کرو۔ بڑا مبارک ارادہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جس علم کو تم سیکھ رہے ہو وہ علم وسیلہ ہے یا مقصد؟ تمھارے ذہن نے اگر اس کو نہ سمجھا تو متنبہ کروں گا کہ تم صحیح کام نہیں کر رہے ہو۔

اور قوموں نے علم کو ہمیشہ وسیلہ سمجھا ہے۔ مگر مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے علم کو وسیلہ نہیں "مقصد" سمجھا ذریعہء معاش نہیں سمجھا۔ ان تمام یونیورسٹیوں میں جو ہندوستان میں چوبیس سے زیادہ ہیں۔ ان کالجوں میں جو ہر ضلع اور تحصیلوں تک میں ہیں اور لاکھوں اسکول ہیں جن کا سلسلہ دیہات تک پھیلا ہوا ہے۔ ان میں جو تعلیم ہوتی ہے اس کو وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ مقصد نہیں سمجھا جاتا۔ کیوں کہ ان میں صرف اس لیے تعلیم دلائی جاتی ہے کہ سرکاری ملازمتیں مل سکیں اور اونچے عہدے حاصل ہو سکیں جو شخص وہاں جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب تک یہاں کی ڈگری موجود نہ ہو وہ معاش حاصل نہیں کر سکتا مگر میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ علم دین وسیلہ نہیں، بلکہ مقصد ہے۔ اس کو کسی وسیلے کے لیے حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ اس کا حصول فرض ہے۔ مسلمانوں نے علم کو ہمیشہ علم کے لیے سیکھا ہے، وسیلے کے لیے نہیں۔ انھوں نے علم کو کبھی اس لیے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعے معیشت حاصل کریں گے یا کسی سرکاری منصب پر فائز ہوں گے۔ مسلمانوں نے ذریعہء معیشت کسی اور چیز کو بنایا جنھوں نے علما کے اذکار و واقعات سنے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ جنھوں نے علم فقہ مدون کیا جس پر کروڑوں مسلمان عمل کرتے ہیں، وہ بزاز تھے۔ انھوں نے اپنے وسیع علم کو ذریعہء معیشت نہیں بنایا بلکہ ذریعہء معیشت پارچہ فروشی تھی۔ حضرت امام

معروف کرخیؒ موچی تھے۔ آج ہم اس پیشے کا نام بھی سننے کے لیے تیار نہیں۔ مگر جن امام کرخی کے احترام کے لیے تمھارے دلوں کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ وہ کرخ میں نکل جاتے' بازار میں بیٹھتے' راہ چلتے آدمیوں کے جوتے سیتے اور اس کی اجرت سے اپنی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ شمس الائمہ سرخسی کا نام ہی حلوائی پڑ گیا۔ ایک طرف خطاب ''شمس الائمہ'' اور دوسری طرف ''حلوائی'' اتنا بڑا عالم اپنا ذریعۂ معیشت حلوہ فروشی بنائے ہوئے تھا۔ اسی طرح اسلام کے مشہور علما نے علم دین کے چشمے بہائے مگر علم دین کو کبھی ذریعۂ معیشت نہیں بنایا۔ وہ علم کو علم کے لیے حاصل کرتے تھے۔ زخارفِ دنیا کے لیے نہیں۔ ان کے نزدیک یہ گناہ تھا کہ علم کو دنیا کے لیے حاصل کیا جائے۔ وہ تشنگانِ علم کو علم کی روشنی سے سیراب کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ یہ ہمارے علماء کا خاص شیوہ رہا ہے کہ دین کی خدمت' علوم دینیہ کی اشاعت انھوں نے اپنا فریضہ سمجھا۔ انھوں نے اس کے لیے خرید و فروخت کا بازار گرم نہیں کیا۔ اس حقیقت کو اگر تم نے سمجھ لیا تو گویا تم نے اپنی پوری زندگی کا پروگرام بنالیا۔

طلباے عزیز سے یہ بات کہنی تھی کہ وہ دین کی خدمت اور اس کی اشاعت کو اپنا فریضہ سمجھیں۔ وہ اس کو کاروباری متاع سمجھ کر اس کی خرید و فروخت کے لیے کوئی بازار تلاش نہ کریں۔ آپ کے اسلاف نے علم کو کبھی سرمایۂ فروخت نہیں سمجھا۔ ان کا یہی عقیدہ رہا اور اسی عقیدے کے گرد ان کے تمام اعمال دایر و سایر رہے کہ علم جوہر انسانیت ہے' فریضۂ انسانی ہے' انسان کا فرض ہے کہ وہ علم کی آواز کو ہر ایک کان تک پہنچائے' عالم دین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تہی مایگی نہیں ہوسکتی کہ وہ علم کو کسب دنیا کا ایک سرمایہ سمجھے۔

آپ عنقریب اس درس گاہ سے دستارِ فضیلت حاصل کریں گے اور اس وقت ایک عالم دین کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش ہوں گے۔ دین و ملت کی ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر ہوں گی۔ اس وقت آپ کا پختہ عقیدہ اور آپ کا نصب العین اشاعت علم ہونا چاہیے۔ علم دین کی خدمت کو آپ اپنا فرض سمجھیں اور اس فرض کو فرض کی حیثیت سے ادا کریں۔ ہرگز ایسا نہ ہو کہ علم کو آپ متاع اور وسیلہ سمجھنے لگیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس کی توفیق بخشے اور میں امید کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ بار بار اس قسم کی تقریبات میں شرکت کا موقع ملے گا۔''

ضمیمہ:

کتابیاتِ معرکۂ شاملی

ابوسلمان شاہ جہان پوری، ڈاکٹر

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری (جلد اول): کراچی، مجلس یادگارِ شیخ الاسلام، ۲۰۰۲ء، ۸۰۰ص

شاملی کا معرکۂ جہاد اور سہارن پور کے دیگر حالات: ص۵۰-۳۴۷،

معرکۂ شاملی میں حافظ محمد ضامن کی شہادت: ص۵۶-۳۵۰

اتر پردیس گورنمنٹ

فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش (جلد پنجم): لکھنو، انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ (اتر پردیش گورنمنٹ)، ۱۹۶۰ء،

مظفر نگر: ص۵۱-۱۲۷، سہارنپور: ص۵۹-۱۵۱

ادارہ

اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (جلد ۱۹): لاہور، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۸۶ء،

مولانا قاسم نانوتوی: ص۱۰-۵۰۴

امداد صابری

سردارِ شہیداں - تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید فرنگ ۱۸۵۷ء: مکہ معظمہ، مدرسہ صولتیہ، ۱۹۸۲ء، ۱۲۸ص

اس کتاب میں حکیم ضیاء الدین رام پوری کی تالیف ''مونس مہجوراں'' بھی شامل ہے اور اس کے مولف حکیم صاحب موصوف کے مفصل حالات بھی درج ہیں۔

امداد اللہ (مہاجر مکی)، مولانا حاجی

مثنوی تحفۃ العاشقین: دیوبند (ضلع سہارنپور)، کتب خانہ اشرفیہ راشد کمپنی،
س-ن، ۳۰ص
یہ مثنوی سلوک وتصوف کے بیان میں ہے۔ لیکن اس کی تالیف کے محرک
حافظ محمد ضامن شہید ۱۸۵۷ء ہیں۔ اس لیے ان کے فراق وجدائی کے رنج والم کا
از ص ۶ تا ۹ بیان ہے۔
انوار الحسن شیرکوٹی، پروفیسر مولانا محمد
سیرتِ یعقوب ومملوک: کراچی، دارالعلوم، ۱۹۷۴ء...... صفحات
جہادِ حریت شاملی: ص ۵۴-۵۰
تذکرہ ادبائے دارالعلوم، دیوبند: (سلسلۂ مضمون) مطبوعہ ماہنامہ دارالعلوم۔
دیوبند، ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ تا ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ
حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی: ماہنامہ دارالعلوم دیوبند بابت ماہ جمادی الثانی
۱۳۷۲ھ، ص ۱۸،
حضرت مولانا نانوتوی: ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ، ص ۱۴
تا ۱۵+۹
انوار قاسمی (جلد اول): سوانح حیات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ: لاہور،
ادارۂ سعدیہ مجددیہ، ۱۹۶۸ء، ۲۰+۵۸۸=۶۰۸ص
جہادِ حریت ۱۸۵۷ء میں حصہ: ص ۶۳-۲۳۶
جہادِ شاملی اور اس کا پس منظر: ص ۲۲۶-۲۶۴
ایوب قادری ڈاکٹر محمد (مترجم ومرتب)
تذکرہ علمائے ہند (از مولوی رحمٰن علی): کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی،
۱۹۶۱ء، ۷۰۸ص
مولانا حاجی امداداللہ: ص ۱۳۲ (حاشیہ)
مولانا محمد قاسم نانوتوی: ص ۴۶۵
مولوی رشید احمد گنگوہی: ص ۵۷۰ (اضافہ)

مولانا محمد مظہر نانوتوی: ص ۳-۵۰۲ (حاشیہ)
مولانا محمد منیر نانوتوی: ص متعدد صفحات پر
ایوب قادری، ڈاکٹر محمد (مصنف)
مولانا محمد احسن نانوتوی: کراچی، مکتبہ عثمانیہ، ۱۹۶۶ء، ۲۸۲ص
مولانا محمد مظہر نانوتوی: (برادرِ بزرگ مولانا محمد احسن نانوتوی) ص ۵۷-۱۵۴
مولانا محمد منیر نانوتوی: (برادرِ خورد مولانا محمد احسن نانوتوی) ص ۶۰-۱۵۷
مولانا محمد یعقوب نانوتوی: ص ۱۸۸
مولانا محمد قاسم نانوتوی: ص ۲۰۷
مولانا شیخ محمد تھانوی: ص ۵۳
ایوب قادری، ڈاکٹر محمد (مولف)
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات وشخصیات): کراچی: پاک اکیڈمی، ۱۹۷۶ء، ۶۳۲ص
باب سوم: دوآبہ، سہارن پور، مظفر نگر: ص ۸۸-۱۷۷
حواشی: مولانا رشید احمد گنگوہی: ص ۱۸۲ مولانا محمد احسن: ص ۱۲۰، مولانا شیخ محمد تھانوی: ص ۱۷۸، حافظ محمد تھانوی: ص ۱۷۹، مولانا محمد قاسم نانوتوی: ص ۱۸۱
مولانا محمد مظہر نانوتوی (مقالہ): سہ ماہی العلم-کراچی، اپریل تا جون ۱۹۵۹ء
تاراچند، ڈاکٹر
ہسٹری آف فریڈم موومنٹ (جلد دوم): لاہور، بک ٹریڈرز، ۱۹۶۷ء، ۶۲۹ص
علماء اور دیوبند تحریک: ص ۳۸۲ تا......
دیوبند کی سیاسی تحریک کے پس منظر میں معرکۂ شاملی اور اس کے شرکاء
جوشی، پی سی
انقلاب اٹھارہ سوستاون: نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۳ء، ۳۵۹ص
احیائے اسلام کے حامی علما اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب (مقالہ کے ایم اشرف) ص ۸۶-۱۱۶ (شاملی کا معرکہ) ص ۱۰۴

حامد میاں، مولانا سید
خونیں انقلاب ۱۸۵۷ء اور اہل دیوبند (مقالہ)، مطبوعہ ماہنامہ الرشید- لاہور (دیوبند نمبر)، ص ۵۴-۷۴۸
زکریا، شیخ الحدیث مولانا محمد
(خط بنام مولانا عاشق الٰہی بلند شہری): مشمولہ تذکرۃ الرشید (عکسی ایڈیشن)، صفحہ ۶۱۷ تا ۶۲۲
معرکۂ شاملی اور تذکرۃ الرشید کے حوالے سے مولانا بلند شہری کے ایک استفسار کے جواب میں حضرت شیخ الحدیث نے اس مفصل خط میں فرمایا کہ تذکرۃ الرشید میں معرکۂ شاملی اور اس میں بزرگان دیوبند کی شرکت کے واقعے کا انکار نہیں کیا گیا ہے۔ اس وقت (۱۹۰۶-۸ء) کے حالات کی سنگینی کی بنا پر واقعے کے بیان کے لیے مولف تذکرہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے یہ مرموز اور پیچیدہ انداز بیان اختیار کیا ہے اور بس!
سید احمد خاں/تحقیق وتدوین: شرافت حسین مرزا
سرکشی ضلع بجنور: دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۴ء، ......ص
اس میں تھانہ بھون، شاملی وغیرہ کے حالات وواقعات کا متعدد صفحات پر ذکر آیا ہے۔
سید احمد خاں
حالات وواقعات خیر خواہان مسلمانان نمبر اول: ۱۸۶۰ء،
حالات وواقعات خیر خواہان مسلمانان نمبر دوم: ۱۸۶۰ء
حالات وواقعات خیر خواہان مسلمانان نمبر سوم: ۱۸۶۱ء
مشمولہ ''مقالات سر سید'' (حصہ ہفتم): لاہور، مجلس ترقی ادب، س۔ن، ۳۲۸ص
ان ہر سہ رسایل کا ایک عکسی ایڈیشن مشتمل بریک جلد بہ عنوان ''رسالہ خیر خواہ مسلمانان'' نہایت خوبصورت مجلد ۱۹۹۸ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شایع ہوا ہے۔

اس رسالے کے اوّلین ایڈیشن موفیسی لائٹ پریس میرٹھ میں چھپے تھے اور مرادآباد سے شایع ہوئے تھے۔

صدیقی، ثناء الحق

جہاد شاملی وتھانہ بھون: کراچی، ادارۂ دانش وحکمت، ۱۹۸۶ء، ۹۰ص

ضیاء الدین رام پوری، حکیم

مونسِ مہجوراں: ص۷۲-۱۲۷، حکیم صاحب کا یہ رسالہ امداد صابری کی تالیف ''سردارِ شہیداں'' کے آخر میں شامل ہے۔ دیکھیے: ''امداد صابری''

عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا

تذکرۃ الرشید: میرٹھ، مکتبہ عاشقیہ، ۱۹۰۸ء، حصہ اول: ۲۵۲ص + حصہ دوم: ۳۴۴ص = ۵۹۶ص

تذکرۃ الرشید کے نئے عکسی ایڈیشن کے آخر میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کا خط بہ جواب استفسار مولانا عاشق الٰہی بلند شہری بھی شامل ہے (ص ۶۱۷ تا ۶۳۲)۔ اس گرامی نامہ میں حضرت نے معرکۂ شاملی کے وقوع اور اس میں بزرگان نانوتہ، گنگوہ وغیرہ کی شرکت کے بارے میں بعض اشکال وشبہات بھی دور فرمادیے ہیں۔

عزیز الرحمٰن بجنوری، مفتی

تذکرہ مشائخ دیوبند: کراچی، قرآن محل، ۱۹۶۴ء، ۴۱۴ص

حضرت حاجی امداد اللہ: ص۵۹

حضرت حافظ محمد ضامن شہید: ص۹۱

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی: ص۱۰۵

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی: ص۱۴۱

حضرت مولانا محمد یعقوب: ص۱۶۹

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی: ص۱۸۱

قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین/ مترجم: ہلال احمد زبیری

علماء۔ میدان سیاست میں: کراچی، شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی

یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء، ۱۷۴ص

باب ہشتم: التہابِ عظیم (حاجی امداد اللہ)، ص ۴۵-۳-۲۷

باب دہم: نئے اُفق (مولانا مملوک علی و حاجی امداد اللہ)، ص ۸-۷-۳-۲۷

باب دَہم: رفاقت ناپائیدار (تحریک دارالعلوم دیوبند: پس منظر، مقاصد اور نتائج)، ۳۱۰-۲۹۸ص

برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ: کراچی، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء، ۴۳۷ص

باب ۱۳: ایثار کی اولوالعزمی (دیوبند کا مدرسہ اور اس کا سیاسی مکتبۂ فکر)، ص ۳۳۸-۴۰

اس کتاب کے مترجم بھی ہلال احمد زبیری ہیں

قطب الدین دمشقی، شیخ / مترجم: مولانا عاشق الٰہی میرٹھی

امداد السلوک لاہور، ادارۂ اسلامیات، ۱۹۸۴ء، ۳۰۴ص

مقدمہ از قلم شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا۔

مقدمے میں حضرت شیخ الحدیث کے قلم سے معرکۂ شاملی کے وقوع، اس میں بزرگان دیوبند کی شرکت کا تذکرہ اور حضرت گنگوہی اور حضرت ضامن شہید کا خاص طور پر ذکر ہے۔

گیلانی مولانا سید مناظر احسن

سوانح قاسمی (سیرت شمس الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی)- حصہ دوم، دیوبند، دارالعلوم، ۱۹۵۵ء، ۵۱۶ص

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے پس منظر، اطراف و جوانب پر بحث، حضرت نانوتوی اور ان کے رفقا کی جنگ آزادی میں شرکت کے تذکرے سے لے کر معرکہ شاملی و تھانہ بھون کے حالات و متعلقات پر تفصیلی بحث ص ۷۹ تا ۲۰۸

لطیف اللہ خاں، پروفیسر

انفاس امدادیہ (سوانح حضرت شاہ امداد اللہ فاروقی مہاجر مکی قدس سرہ)، کراچی،

ادارۂ نشر المعارف، ۱۹۹۵ء، ۲۰۳ص

باب ہفتم: ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ، رستاخیز اور اس میں حضرت حاجی صاحب کا موقف ص۱۱۱-۸۴

محبوب رضوی، سید

تاریخ دار العلوم، دیوبند: کراچی، میر محمد کتب خانہ مرکز علم وادب، ۱۹۸۰ء، ۲۲۱ (اضافی) +۵۴۴ (حصہ اول) +۴۶۴ (حصہ دوم) = ۱۲۲۹ص

باب اول: مولانا محمد قاسم نانوتوی: ص۱۰۲

مولانا رشید احمد گنگوہی: ص۱۲۵

باب پنجم: مولانا محمد یعقوب نانوتوی: ص۱۷۱

مولانا محمد منیر نانوتوی: ص۲۲۷

محمد طیب قاسمی، مولانا قاری

تاریخ دار العلوم دیوبند: کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۷۲ء، ص

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی: ص۵۴-۵۳

قطب الارشاد مولانا رشید احمد: ص۵۴

محمد قاسم نانوتوی، مولانا

قصاید قاسمی: دہلی، کتب خانہ رشیدیہ، ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۰ء)، ۴۰ص

قصیدۂ نظم (مرثیہ حکیم ضامن شہید)، ص۳۹-۳۶

حضرت نانوتوی نے یہ قصیدہ حکیم ضیاء الدین کے رسالہ ''مونس مہجوران'' کے لیے لکھا تھا۔ اس میں شامل ہے۔ مونس مہجوراں ۵/اگست ۱۸۶۷ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ اس لیے یقین ہے کہ یہ مرثیہ ۱۸۶۷ء ہی کی تصنیف ہے۔

محمد میاں، مولانا سید

علماے ہند کا شاندار ماضی (حصہ چہارم): کراچی، مکتبۂ رشیدیہ، ۱۹۸۶ء، ۵۱۵ص

ضلع مظفر نگر و سہارن پور میں جہاد آزادی کے حالات اور اکابر تحریک: حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی،

مولانا محمد منیر نانوتوی، وغیرہم کے حالات: ص ۲۴۵ تا ۳۰۷
ضمیمہ: تھانہ بھون کے باقی ماندہ حالات اور قاضی عنایت علی کے کارنامے: ص
۴۹۸-۵۰۸
حافظ ضامن شہید کا ذکر خیر: ص ۱۲-۵۰۹

محمد یعقوب نانوتوی، مولانا
سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی: دیوبند (ضلع سہارن پور)، کتب خانہ
اعزازیہ، س۔ن، ۲۲ص
ایام جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا قاسم نانوتوی کی سرگرمیوں کی
تفصیل اس رسالے کے صفحہ ۱۱، ۱۲ پر آئی ہے۔ اس سوانح عمری کا پہلا ایڈیشن
۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔

مدنی، مولانا حسین احمد
نقشِ حیات (خودنوشت سوانح حیات): کراچی، بیت التوحید آصف کالونی،
س۔ن، حصہ اول ۴۰۰، حصہ دوم ۴۰۱ تا ۷۰۲ میں
ہمارے اکابر کا ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینا، ص ۵۴-۴۵۰
حضرت حاجی صاحب، مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے واقعات، ص ۷۳-۴۶۳

معین الحق، ڈاکٹر ایس
دی گریٹ ریولیوشن آف ۱۸۵۷ء: کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی،
۱۹۶۹ء.....ص
سہارن پور و مظفر نگر ص ۷۹-۳۷۶
جنگ شاملی ص ۸۰-۳۷۹
کیرانہ ص ۸۱-۳۸۰
سہارن پور، مظفر نگر اور شاملی کے واقعات اور ان کے ضمن میں حضرت حاجی امداد
اللہ اور ان کے رفقاء کے جہاد میں حصہ لینے کا ذکر آیا ہے۔

مقبول جہانگیر
داستان سرفروشوں کی: لاہور، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، س۔ن، ۲۲۷ص

(شاملی کا مجاہدہ اور اس کے سرفروش): ص ۳۰-۱۱

مہر، غلام رسول

۱۸۵۷ء: (پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی کے مفصل، مستند اور مکمل حالات)

لاہور، کتاب منزل، ۱۹۵۷ء، ۳۶۴ص

مظفر نگر۔ سہارن پور: ص ۲۷-۲۲۶

۱۸۵۷ء کے مجاہد: لاہور، کتاب منزل، ۱۹۵۷ء، ۳۱۱ص

بزرگانِ دیوبند: ص ۶۸-۱۶۳

حافظ محمد ضامن، حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی کے اذکار

سرگزشت مجاہدین: لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن، ۶۶۴ص

شیخ الہند کی تحریک آزادی: ص ۳۸-۵۲۹

نسیم احمد فریدی امروہوی، مولانا

حافظ محمد ضامن شہید: ماہنامہ تذکرہ دیوبند، بابت ماہ نومبر ۱۹۶۱ء

رشید احمد گنگوہی: مقالہ مشمولہ اردو دایرۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور (جلد ۱۰):

۱۹۷۳ء، ص ۶۹-۲۶۷

نظامی، پروفیسر خلیق احمد

تاریخ مشائخ چشت: دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۳ء، ......ص

......(۳) انیسویں صدی کی تیسری اہم تحریک آزادی وطن ......ص ۲۳۴-۲۳۳

سہارن پور، مظفر نگر کے بزرگوں کی سیاسی خدمات اور ۱۸۵۷ء کے جہاد میں حضرت مہاجر مکی، حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی کی خدمات کا تذکرہ

نفیس الحسینی، سید

احوال و آثار شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ: لاہور، انجمن ارشاد المسلمین، ۱۹۸۰ء، ۲۴ص

حضرت حاجی صاحبؒ کے احوال میں ذوقِ جہاد، معرکۂ شاملی میں شرکت، حافظ ضامن کی شہادت، وارنٹ گرفتاری اور ہجرت کے واقعات کو صفائی اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔